چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
فروری 2015

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 16 شمارہ نمبر 5 فروری 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/150 روپے

سالانہ قیمت -/1810 روپے

ایڈیٹر وپبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

قرآن کی باتیں

☆ اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ کہہ دو کہ اللہ اور اسکے رسول کا حکم مانو۔ اگر نہ مانیں تو اللہ بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 31 سے 33)

☆ اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ اور یہ لوگ جب اپنے حق میں ظلم کر بیٹھے تھے اگر تمہارے پاس آتے اور اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول اللہ بھی ان کے لئے بخشش طلب کرتے تو اللہ کو معاف کرنے والا اور مہربان پاتے۔ تمہارے رب کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں۔ اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 64 سے 65)

☆ دنیا کی زندگی کی مثال مینہ کی سی ہے کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا۔ پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں مل کر نکلا یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی۔ اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ کر (ایسا کر) ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ جو لوگ غور کرنے والے ہیں، ان کے لئے ہم نشانیاں اسی طرح کھول کھول کر [illegible]

خطوط

قارئین کرام!
لسلام علیکم۔ یہ چند لائنیں لکھتے ہوئے میری آنکھوں میں نمی ہے ور جہاں تک میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ 16 دسمبر سانحہ پشاور کی وجہ سے تمام درددل والوں کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ہمارے ننھے معصوم بچے اور اساتذہ گولیوں کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ اور ایسا جن لوگوں نے بھی کیا ہے شاید ان کے سینے میں دل نہیں ہوگا یا پھر وہ بچوں والے نہیں ہوں گے ویسے بھی اسلام میں کیا غالباً تمام مذاہب میں جنگ کے دوران بھی عورتوں بوڑھوں اور بچوں پر اسلحہ اٹھانا منع ہے۔ مگر یہ نہ جانے کیوں ہوگیا۔ اس سانحہ میں ہلاک ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور تمام والدین اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ ہلاک ہونے والے تمام معصوم بڑے ہوکر اور پڑھ لکھ کر ملک میں بڑے بڑے کام کرنے والے ہوتے اچھی سوچ کے حامل ہوتے۔ اے، کاش! کہ ایسا نہ ہوا ہوتا مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا ہوا تو کیوں ہوا اور یہی لمحہ فکریہ ہے۔ کاش کہ اپنے ملک کے تمام کرتا دھرتا اور صاحب حیثیت لوگ بلکہ تمام اہل وطن کو اس سانحہ کے بعد سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے اور ایسے قدم اٹھانے چاہئیے کہ آئندہ ملکی تاریخ میں آئندہ ایسا کوئی سانحہ نہ ہونے پائے۔ اور پھر گیارہ جنوری کی رات میں کراچی سے شکارپور جانے والی مسافر کوچ میں سوار 67 افراد جل کر خاکستر ہوگئے۔ اللہ ان سب کو بھی جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ اس کے لئے بھی دل افسردہ ہے۔ کاش کہ آئل ٹینکر اور کوچ کے دونوں ڈرائیوروں میں سے کوئی لاپرواہی نہ کرتا تو ایسا نہ ہوتا۔ ایسے سانحات پر بھی جو آئے دن ہوتے رہتے ہیں ان پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ خیر افواج پاکستان نے ہمت وحوصلے کا قدم اٹھایا ہے اور یقیناً اب افواج پاکستان دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچا کر دم لے گی۔ پاک افواج زندہ باد۔ قارئین کرام میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم تمام پاکستانیوں پر اپنا فضل وکرم کرے اور ہمارے ملک کو خوشیوں کا گہوارہ بنا دے۔ آمین۔

خالد علی مینیجنگ ایڈیٹر

طاہرہ آصف ساہیوال سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ کا سارا اسٹاف بخیر وعافیت ہوگا۔ بحیثیت مصنفہ مجھے ڈر سے وابستہ ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہوچکے ہیں۔ اب تک میری تیسری تحریر بھی پرنٹنگ کے لئے جا چکی ہوگی سب سے پہلے میں سحرش حنیف، پری، قاضی حماد سرور، ایس امتیاز احمد، طارق محمود، مدثر بخاری اور دیگر تمام احباب اور قارئین کی مشکور ہوں جنہوں نے میری تحریر کو پذیرائی بخشی امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی اپنی آراء سے نوازتے رہیں گے میں یہ بھی کہوں گی کہ تمام پڑھنے والے اصلاح کے لئے تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید کا پہلو نظر انداز نہ کریں۔ اب میں سب سے پہلے نومبر کے شمارے کے بارے میں بتانا چاہوں گی کہ اے وحید صاحب کی رولو کا واقعی ہی لاجواب ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق مصنف ہیں نرجان احمد نصیب کی شیبا ایک پراثر اور حقیقی تحریر تھی، ضرغام محمود نے ہتھیار الکھ کر مختصر کہانی کا حق ادا کردیا۔ اب آتے ہیں دسمبر کے شمارے کی طرف تو رولو کا اس بار بھی بے مثل رہی۔ عاصمہ احمد کی پراسرار مندر بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ رضوان علی سومرو نے موت کا سودا لکھ کر عوام الناس کو پراثر پیغام دیا ہے کہ ہماری فلاح صرف ہمارے مذہب میں ہے حد بندی۔ ماجدہ راجہ صاحبہ کی اچھی تحریر رہی۔ نور محمد کاوش اور ضرغام محمود صاحب کی تحریروں نے ڈر کے معیار کو برقرار رکھا بلکہ انہیں یادر کھے جانے والی کہانیاں کہا جاسکتا ہے۔ مجھے جنوری کے شمارے میں شامل اپنی تحریر کے لئے آپ سب قارئین کے تبصروں کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ڈر کی ترقی کے لئے تب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ طاہرہ صاحبہ: رائٹر یا عام انسان کے لئے ضروری ہے کہ تعریف کے ساتھ تنقید کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کریں اور تنقید سے ہی اپنے اندر اصلاح پیدا ہوتی ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ انسان افق پر پہنچ جاتا ہے۔ خلوص نامہ کا آئندہ ماہ

بھی انتظار رہے گا۔ شکریہ

بلقیس خان پشاور سے، یہ خوبصورت نیا سال شروع ہوگیا ہے ڈر ڈائجسٹ نے کامیابی کا ایک اور سفر طے کر لیا ہے، سب سے پہلے ادارے کو میری جانب سے نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ کچھ نیا ہونا چاہئیے نیا سال ہے، ڈر سب سے الگ ہے یہ کمال ہے، جنوری میں عثمان غنی کی برتھ ڈے تھی، سو ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، اینڈ منی منی ہیپی لیٹنس ان یور لائف۔ نیکسٹ فروری میں میری پیاری دعا بہن کی برتھ ڈے آرہی ہے، دعا بہن! دیکھو سب رائٹرز، گول میز کے کنارے کھڑے ہیں، ور آپ کو خوبصورت انداز میں وش کر رہے ہیں۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو دعا، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو دعا'' اب آپ کیک کاٹیے گا، اور سب سے پہلے ٹکڑا مجھے کھلائیے گا، واؤ کیک بہت مزیدار تھا، جسٹ الوزن، کریں جی! جنوری کا خاص شمارہ دیکھ کر دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا، خطوط میں رائٹر فلک زاہد کا خط دیکھ کر بے صبری سے ان کی کہانی کا انتظار شروع کیا، ویلکم ڈر۔ خاص شمارے کے کی جھلکیوں میں اپنی کہانی دیکھی! اف ندارد، پلیز، پلیز، میری کہانی میری برتھ ڈے پر ضرور لگانا، مارچ میں آرہی ہے، ورنہ میں ناراض، ڈر کی سالگرہ کے لئے اتنی محنت سے لکھی تھی، کہ دس دن تک انگلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ جنوری میں خاص کہانیاں، مسکراہٹ عثمان غنی، اور مجازی محبت، نے نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ ایس امتیاز احمد کی، روح کی بے چینی، اور نور محمد کاوش کی قلبی اذیت بہترین تحریریں رہیں۔ اچھی کہانیوں میں موت کا سامنا، موت کا سودا، ذہنی اذیت، حد بندی، اور پراسرار سایہ موت کے گھاٹ رہیں۔ نئی کہانیوں پر کام جاری و ساری ہے، آئندہ چھوٹی کہانیاں لکھوں گی، میری توبہ جو اتنی لمبی کہانی لکھوں، محنت بھی زیادہ اور انتظار بھی ہر ماہ، پلیز رحم! رحم! شیر شکار کو شکاری کر کے!! ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: مارچ میں آپ کی سالگرہ ہے تو مارچ کے شمارے میں آپ کی کہانی ضرور شائع ہوگی، چھوٹی کہانی کے لئے طویل انتظار نہیں کرنا پڑتا ہے، ہر ماہ کہانی نہ بھیجیں لیکن خط تو لکھ دیا کریں۔ اور اس کے لئے شکریہ قبول کریں۔

ساحل دعا بخاری بصیر پور سے، سب سے پہلے تو ہماری ہر سانس اور ہر دھڑکن اللہ برتر کی ہر نعمت و رحمت کا شکر ادا کرتی بقدر اللہ کی رحمت و علم کے اور ہر سانس و دھڑکن اس قدر درود و سلام بھیجتی ہے نبی کریم ﷺ پر، جس قدر کہ آپ اس گناہگار امت پہ مہربان ہیں۔ ملکی حالات طوفانی بارشیں اور خونی سیلاب...... پانی جو زندگی کا جزو لازم ہے وہی پانی بستیاں تباہ کر گیا..... کتنے ہی گھر اجاڑ گیا۔ بلاشبہ وہ مناظر وہ دکھ و کرب احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ جس جس کا جو بھی نقصان ہوا ہے، اللہ برتر ان سب کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور جس چیز کو کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا اس پہ صبر عطا فرمائے۔ آمین وقت ہے کہ گویا پر لگا کر اڑتا چلا جاتا ہے اور زندگی بے شک کسی اجڑے ہوئے ویران درخت کی مانند ساکت و جامد ہو جائے، مگر وقت کی واحد خو [illegible]

☆☆ بشرا صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم اب خوش ہوجائیں کیونکہ آپ ڈر کی محفل میں شامل ہوگئیں۔ اب امید ہے کہ حسب وعدہ آئندہ ہر ماہ ڈر کی محفل میں ضرور حاضر ہوں گی۔ Thanks

عطیہ زاہرہ لاہور سے، السلام علیکم! سب کے لئے بہت سی دعائیں اور اپنے ملک کے لئے امن کی دعائیں، کہ اللہ پاک ہمارے ملک کو امن نصیب کرے۔ آمین۔ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ 2015 جنوری میں میری کہانی ''خونی چکر'' شائع کرنے کے لئے بہت بہت شکریہ! میں ان تمام قارئین کی بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے مجھ پر تنقید کی یا تعریف کی۔ تنقید اور تعریف دونوں کسی مصنف کے لئے ایندھن کا کام کرتی ہیں۔ میں نے ان دونوں سے اپنی اصلاح کی ہے۔ اسی لئے ان سب کا شکریہ جنہوں نے میری اصلاح کی۔ میں بھائی قاسم رحمان سے کہنا چاہتی ہوں۔ ''بھائی ہر مصنف کی کہانیاں اس کے لئے بہت اہم ہوتی ہے۔ وہ دن رات اس کے کرداروں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ وہ اس کی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ نے مجھے کہا، کہ میری نومبر والی کہانی پہلے شائع ہوچکی ہے۔ وہ بھی ڈر میں...... ! بھائی ازل سے لے کر ابد تک ایک عورت اور ایک مرد پر لکھا جارہا ہے۔ پھر تو سب کہانیاں پہلے شائع ہوچکی ہیں۔ یوں بھی اگر خوفناک کہانیوں کا ذکر کیا جائے، تو برصغیر کی تاریخ میں جن، بھوت روح، چڑیل روپ بدلنے والی مخلوق، سو سال بعد سانپ کا انسان بن جانا، پچھل پری، وغیرہ پر لکھا جاتا رہا ہے۔ یہ سب موضوعات اتنے بوسیدہ ہوچکے ہیں، کہ اب ان میں جان باقی نہیں رہی، لیکن اس کے باوجود ہم انہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ کردار ہمارے ماحول سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جب ہم ان کرداروں پر لکھتے ہیں تو کسی نہ کسی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ بعض دفعہ ہم کسی ایسے کردار سے متاثر ہوتے ہیں۔ جو ہمیں حیران کرتا ہے۔ ہم اس پر لکھتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی کہانی کسی دوسری کہانی سے مطابقت اختیار کرلے، تو اس میں حیران ہونے کی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ وہی بات ہے، کہ اب ہم نے اپنے دائرہ کار میں رہ کر لکھنا ہوتا ہے خیر اس کے علاوہ ایڈیٹر صاحب سے تو فون پر بھی بات ہوچکی ہے۔ آپ بھی یہ دیکھیں، کہ بڑے سے بڑی کتابیں کسی دوسری کتاب سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ آپ اس موضوع پر مجھ سے بات کرسکتے ہیں اور محترم آپ سے میری درخواست ہے آپ میرا یہ خط پورا شائع کیجئے گا۔ ڈر سے میرا جو رشتہ ہے۔ اس حوالے سے اتنی رعایت تو مل ہی سکتی ہے اچھا اب اجازت دیں۔

☆☆ عطیہ صاحبہ: جو ہونا تھا وہ ہوگیا، ادارہ ہر رائٹر کی محنت کو سراہتا ہے اور ادارے کو سب کو معلوم ہے آپ کی باتوں میں حقیقت ہے در گزر کرنا اچھی بات ہے حویلی کا راز پڑھیں اور خوش ہوجائیں۔ امید ہے آپ بھی ہر ماہ خط ضرور ارسال کریں گی تاکہ تنقید برائے اصلاح ہوسکے۔

شبنم غفور بڈالی سے، السلام علیکم امید کرتی ہوں کہ ڈر کی پوری ٹیم خیریت سے ہوگی۔ ڈر ایک مکمل اور معیاری رسالہ ہے میں ڈر کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ڈر کا نیا شمارہ کس تاریخ کو منظر عام پر آتا ہے۔ تاکہ ہمیں پتا چل سکے اور اسی تاریخ کو جاکر خرید سکیں۔ اگر حوصلہ افزائی کی گئی تو انشاء اللہ ہر ماہ کہانی بھی لکھنے کی کوشش کروں گی۔

☆☆ شبنم صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید ڈر ڈائجسٹ ہر ماہ 22-21 تاریخ کو مارکیٹ میں آجاتا ہے۔ آپ کی تحریروں کا شدت سے انتظار رہے گا۔ چلیے حوصلہ افزائی تو ہوگئی ناں۔

نعیم بخاری آکاش اوکاڑہ سے، السلام علیکم! جناب میں خیریت سے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے حضور سب کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔ پچھلے ماہ دسمبر کا اعزازی شمارہ ادارے نے بھجوایا تھا مگر میں نے دیر سے موصول کیا کیوں کہ میں دوسرے شہر میں تھا اور وہیں سے شمارہ خرید کر پڑھا اور اس پہ تبصرہ کردیا تھا اعزازی شمارے کے لئے شکریہ۔ اب آتے ہیں ماہ جنوری کے شمارے کی طرف سرورق پر ''پرنس آف پرشیا'' ہالی ووڈ فلم کی ہیروئین کو دیکھا تو دل باغ، باغ ہوگیا کیوں کہ مجھے اس کی ویڈیو گیم بہت پسند ہے۔ آہستہ آہستہ ہم ٹہلتے ہوئے بزم بہاراں میں پہنچے جہاں پر ساحل دعا بخاری اپنے تبصرے کے ذریعے اچھی، اچھی، باتیں بتاتی ہوئی نظر آئیں قاضی حماد اوکاڑہ سے آپ نے واقعی معقول بات

کی محترم یہ ڈر کی اعلیٰ ظرفی ہی ہے جو ہر رائٹر کو موقع مل جاتا ہے پر بہر حال تبصروں میں ایس امتیاز احمد صاحب کا تبصرہ تفصیلی اور جامع تھا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ویلڈن شگفتہ صاحبہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تحریر لائیں آپ جب کہ طاہرہ آصف صاحبہ امیزنگ آپ تو آموز رائٹر ہیں مگر آپ کا انداز بیان کسی منجھے ہوئے رائٹر جیسا ہے۔ سلسلہ جاری رکھیے گا۔ اور ایس امیتاز صاحب آپ کے تو کیا کہنے آپ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے میں نے آپ جیسے رائٹروں کو ہی پڑھ کے لکھنا سیکھا ہے۔ آپ کی کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ مدثر بخاری ویری گڈ چھوٹی سی تحریر اور اتنی ٹینشن بھرے واقعات مائی گاڈ آپ نے بہت ہی اچھے ڈھنگ سے تحریر قلم بند کی ہے۔ محترم میں نے آپ کی تجویز نوٹ کرلی ہے اور اب جو کہانی ارسال خدمت ہے ''اماوس کا شیطان'' وہ میں نے بہت ہی محنت سے لکھی ہے اور یہ فل بارر اور انوکھے واقعات وحادثات پر مشتمل ہے اس کے علاوہ ایک اور کہانی مکمل ہے اندھیر نگری مگر صاف اوراق پر اتارنا باقی ہے محترم آخر میں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں کہانی صفحے کے ایک جانب لائن چھوڑے بغیر لکھوں تو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا کیوں کہ اس طرح صفحات زیادہ لگتے ہیں آپ سمجھ رہے ہیں نا اللہ حافظ..

☆☆ نعیم صاحب: خلوص نامہ اور کہانی ارسال کرنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔ آپ کی کہانی خونی کموڈو ڈریگون، نیا نام تماشۂ اجل کمپوز ہو چکی ہے اگلے ماہ ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ خط ضرور لکھا کریں۔ بغیر لائن چھوڑے لکھ سکتے ہیں۔

این اے کاوش سلانوالی سے، محترم ایڈیٹر صاحب: اور تمام ساتھی جو ڈر ڈائجسٹ سے بالواسطہ جس طرح بھی منسلک ہیں سب کی خدمت میں بندہ ناچیز کا سلام الفت! امید واثق ہے سب دوست احباب بہت اچھے ہوں اللہ آپ سب کو عمر دراز اور عمر صحت عطا فرمائے۔ میں ان تمام دوستوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں جو وقتاً فوقتاً میری کاوشوں پر تعریف وتنقید کر کے میری حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کرتے رہتے ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ میٹھے کے ساتھ کچھ نمکین نہ ہو تو مزہ نہیں آتا اس لیے کسی بھی دوست سے قطعاً رنجیدہ خاطر نہیں ہوں۔ محترم عزت مآب ایڈیٹر صاحب۔ آپ نے مجھے بہت عزت دی۔ جس ڈائجسٹ میں مقام پیدا کرنے کے لیے نجانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں وہاں آپ نے جس قدر ممکن ہو سکا میری حوصلہ افزائی کی، ڈھارس بندھائی اور ناتواں اور لرزتے ہاتھوں میں تھامے قلم سے لکھی کاوشوں کو نہ صرف اپنے ڈائجسٹ کے کونے کھدروں میں جگہ دی بلکہ ہر ممکن ان میں درستگی کی اور یہی وجہ ہے کہ چاہنے والوں کی تعداد میں ہونے والے اضافے کی اصل بنیاد آپ ہیں۔ ایسے مخلص، اچھے اور ایماندار انسان کے لیے تن من دھن بھی قربان کردیا جائے تو من خوش ہوتا ہے۔ میں آپ کی اور آپ کی ٹیم کا بہت مشکور ہوں۔ جنوری کے ڈائجسٹ کے متعلق میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں لیکن اتنا کہوں گا کہ میرے تمام دوست ہی قابل تعریف ہیں۔ آپ سب دوستوں نے بہت اچھا لکھا جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بہت جلد انشاء اللہ بفضل خدا ایک سلسلہ وار کہانی ارسال کروں گا لیکن ارادہ ہے پہلے اسے کمپلیٹ کرلوں پھر اکٹھی تمام اقساط ارسال کروں گا کچھ زیادہ بڑی تو نہیں ہوگی گنتی کی اقساط ہی ہوں گی لیکن امید ہے سر آپ اسے بھی ردی کی نظر کرنے کے بجائے ڈر ڈائجسٹ کی کسی کونے کھدرے میں ضرور جگہ دیں گے۔ ایک بار پھر تمام دوستوں کا تہہ دل سے شکر ادا کرتا ہوں اور سب سے ایک چھوٹی سی التماس بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میرے والد گرامی قبلہ ملک محمد اسلم (مرحوم) صاحب جو اس دنیا فانی سے عرصہ دراز پہلے پردہ فرما گئے تھے ان کے ایصال ثواب کے لیے جنوری 15 کو ختم شریف کروا رہا ہوں۔ جس قدر ممکن ہو ان کی روح اور تمام عالم انسانیت کی پاک ارواح کے لئے دعا کریں۔

☆☆ نور صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھنے اور حال دل کے لئے بہت بہت شکریہ۔ آپ کی تمام باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ ڈر ڈائجسٹ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اگر موضوع اچھا ہو تو۔ ڈر ڈائجسٹ میں بہت سے لکھنے والے رائٹر بن چکے ہیں۔ ہماری قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد اور دیگر تمام پاک ارواح پر اپنا فضل وکرم کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا نئے سال کا نیا شمارہ ڈر ڈائجسٹ کا خاص

ملکیت کی حیثیت کا اختیار رکھتی تھی۔ ریحان نے دو منزلہ عمارت میں چند تبدیلیاں کرنے کے بعد اسے ہوٹل کی صورت دے ڈالی۔ تبدیلیوں کے دوران اسے اپنے مرحوم باپ کے ہاتھوں سے تحریر کردہ ڈائری دستیاب ہوئی۔ ڈائری میں مختلف یادداشتوں اور ایڈریسوں کے علاوہ مختصر پیغام ریحان کے نام موجود تھا۔ جس میں لکھا ہوا تھا۔

برخوردار ریحان۔

جب تمہیں یہ تحریر پڑھنے کے لئے ملے گی۔ تب شاید میں اس عالم فانی سے کوچ کرگیا ہوں گا۔ میری لاعلمی کے دوران نہایت سست روی سے جسم کے اندر سانپ کا زہر سرایت کردیا گیا۔ جب مجھے زہر کے متعلق معلوم ہوا۔ تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ میں نے جار میں موجود سانپ کا سر کچل دیا۔ تم سوچ رہے ہوگے۔ جار میں موجود سانپ کا زہر میرے جسم میں کیونکر داخل ہوا۔ تو تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ وہ کوئی معمولی سانپ نہیں تھا۔ راجا ناگ تھا۔ ایسا ناگ اگر سو سال تک اپنے آپ کو انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ سکے۔ تب انسانوں کی صورت اختیار کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ تم سوچ رہے ہوگے کہ میں ایک سائنسدان ہونے کے باوجود بھی دقیانوسی سوچ رکھتا ہوں۔

اس عجائب دنیا میں ایسی لاتعداد مخلوقات پائی جاتی ہیں۔ جن کے متعلق ہمارا دماغ سوچنے کے قابل بھی نہیں ہوسکتا۔ بہرکیف اس راجا ناگ کی ناگن رات کی تاریکیوں میں مجھے ڈستی رہی۔ وہ میری نگاہوں کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی۔ کیونکہ سو سال کا عرصہ مکمل ہونے سے پہلے وہ اپنی محنت کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے جسم میں زہر سرایت کرنے لگا۔ میں نے احتیاطی تدابیر کے طور پر مختلف میڈیسن کا انتخاب کیا۔ لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

زہر مکمل طور پہ میرے جسم کا محاصرہ کرچکا تھا۔ مجھے موت اپنے سر پر منڈلاتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ زندگی ختم ہونے کے قریب تھی۔ مجھے تمہارا خیال شدت کے ساتھ ستانے لگا۔

وہ ناگن اگر مجھ سے انتقام لے سکتی تھی تو پھر تم سے کیوں نہیں...... میرے بعد اپنا بہت خیال رکھنا۔ اگر اس ناگن نے اپنے سو سال مکمل کرلئے تب میری بات یاد رکھنا کہ وہ عورت کے روپ میں تم سے بدلہ لینے یہاں ضرور آئے گی۔ تحریر لکھ کر چھوڑ جانے کا مقصد صرف یہی ہے کہ احتیاط کرنا۔ خاص طور پر عورتوں کے ساتھ ملنے سے...... تحریر ختم ہوگی۔

دس سال بعد:

گاڑی نے تیز وسل دی اور تاملی کے اسٹیشن میں داخل ہوکر رک گئی۔ ریحان نے اچٹتی ہوئی نگاہ ڈبے میں بیٹھے ہوئے مسافروں پر ڈالی۔ پھر پھرتی کے ساتھ ڈبے سے نیچے اتر آیا۔ چھوٹے سے اسٹیشن پر مسافروں کے اترنے کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ جو اکا دکا اترے وہ فوراً رہائشی علاقوں کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔

آسمان پر بجلیاں چمک رہی تھیں۔ اور کسی بھی لمحے طوفانی بارش کا آغاز ہونے والا تھا۔ ریحان کو فکر نہیں تھی کیونکہ اسٹیشن کی پارکنگ میں اس کی جیپ کھڑی تھی۔ اور وہ کسی بھی مشکل میں پڑے بغیر چند ہی لمحوں میں اپنی رہائش گاہ تک پہنچ سکتا تھا۔ اسٹیشن سے باہر قدم رکھتے ہی بوندا باندی کا آغاز ہوگیا۔ مون سون کا مہینہ تھا۔ بارشوں کا سلسلہ اپنے عروج پر تھا۔ ایسے موسم میں سانپ بھی اپنی پناہ گاہوں کو چھوڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔

دہقان نو کی عمارت دو منزلہ تھی۔ نچلی منزل کے کچے حصے میں سانپوں کی غیر یقینی تعداد پائی جاتی تھی۔ لیکن یہ بے ضرر سانپ تھے۔ ریحان انہیں چھپکلیوں کی مانند جوتیوں سے مار دیتا تھا۔ دہقان نو کا اگلا حصہ گودام اور ورکشاپ کے اوزاروں سے بھرا ہوا تھا جبکہ اوپر کا حصہ رہائشی تھا۔ یہاں مختصر آرام دہ کمرے موجود تھے۔ چند مزید کمرے، دہقان نو کے رہائشی ایریا کی حدود میں واقع تھے۔ جو سیزن میں بھی کم و بیش خالی ہی پڑے رہتے تھے۔

ریحان کے مالی حالات کچھ زیادہ بہتر نہیں تھے۔ جس سڑک پر اس کا پیٹرول پمپ واقع تھا۔ وہ نہایت مصروف ترین شاہراہ کی حیثیت کا اختیار رکھتی تھی۔ لیکن ون ہونے کی بدولت اس کی جانب والے حصے میں تمام سیزن کام کم ہی رہتا تھا۔

بحرحال اسٹیشن سے باہر نکلنے کے فوراً بعد اس نے پارکنگ لاٹ کے قریب، واقع منیجر کے کمرے میں جاکر گاڑی کھڑی کرنے کی ادائیگی کی۔ پھر جیپ میں بیٹھ کر سگریٹ سلگایا۔ باہر طوفانی بارش کا آغاز ہوگیا تھا۔ لیکن جیپ کے اندر کا ماحول پرسکون تھا۔ جیپ کے شیشوں سے پانی آبشار کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ ریحان نے بٹن دبا کر وائپر چلا دیا۔ شیشے صاف ہونے لگے۔ باہر کا منظر واضح ہوگیا۔

ایک نوجوان لڑکی جس کا جسم مکمل طور پر پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ اور نہایت عریانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہاتھ میں سوٹ کیس تھامے اسے بھاگتی ہوئی اپنی جانب آتی دکھائی دی۔ ریحان نے جیپ کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ پارکنگ ایریا میں داخل ہوتے ہی لڑکی نے کوئی بھی بات کئے بغیر سوٹ کیس جیپ کے پچھلے حصے کی جانب اچھال دیا۔ پھر خود فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر جھٹکے کے ساتھ دروازہ بند کر دیا اور طویل سانس لے کر اپنے بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے معذرت بھرے لہجے میں بولی۔

''معاف کرنا لیکن ارد گرد مزید کوئی بھی سواری موجود نہیں تھی۔ اس لئے مجبوراً مجھے بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجازت لئے بغیر تمہاری جیپ میں بیٹھنا پڑا۔''

ریحان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ویسے تم نے جانا کہاں ہے؟''

لڑکی نے جسم کے گرد لپٹی ہوئی چادر کو جسم سے علیحدہ کر دیا۔ پھر جیپ کا شیشہ نیچے کرنے کے بعد اسے باہر کی جانب نچوڑنے لگی۔

ریحان کو اپنے جسم میں چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ نگاہیں مخالف جانب پھیر لیں۔ لیکن ایسا کرنے سے وہ اپنے دماغ پر حاوی ہوتے ہوئے شیطان کے پنجوں سے آزاد نہیں کر پایا۔ وہ دوبارہ حاوی ہوتا چلا گیا۔ ریحان نے دوبارہ کن انکھیوں سے لڑکی کے عریاں جسم کی جانب دیکھا۔ وہ سیاہ قمیص اور شلوار میں ملبوس تھی۔ اور قمیص کا گلا اتنا بڑا تھا کہ ریحان با آسانی اپنا سر اندر ڈال کر جھانک سکتا تھا۔

وہ بولی۔ ''تم تاریکی شہر کی جانب جانے والے آخری انسان ہو۔ مجھے بھی تاریکی ہی جانا ہے اس لئے تمہاری جانب بھاگی چلی آئی۔''

ریحان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اور پارکنگ لاٹ سے باہر نکالنے کے بعد پہاڑوں کے درمیان میں سفر کرتی ہوئی سڑک پر ڈال دی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اور لڑکی نہایت باریک کپڑوں میں ملبوس تھی۔

گاڑی کے چلتے ہی اس نے دروازے کے شیشے اوپر چڑھا دیئے۔ پھر سیاہ شال کو اپنے جسم کے گرد لپیٹنے کی کوشش کی۔ لیکن سردی سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ پائی۔ اس کے دانت بجنے کی آواز ریحان اتنی دور سے بھی بخوبی سن سکتا تھا۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' لڑکی بولی۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں جیپ کے پچھلے حصے میں جاکر کپڑے تبدیل کرلوں۔ میرے بیگ میں دوسرا جوڑا موجود ہے۔''

ریحان نے جواب دیئے بغیر اثبات میں سر ہلایا۔ اور لڑکی جیپ کی سیٹوں کو پھلانگ کر دوسری جانب چلی گئی۔ ریحان نے جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ پچھلی سیٹ سے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ریحان کے سر کے پاس بیک مرر لگا ہوا تھا۔ شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ اندھیرا پھیلنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ لاشعوری طور پر ریحان کی نگاہ بیک مرر کی جانب اٹھ گئی۔ اسے اپنے دماغ میں زلزلے کے سے جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ وہ مکمل طور پر عریاں تھی۔ اس کی نگاہوں کا زاویہ مختلف تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں ریحان کو ایسا محسوس

ہوا۔ جیسے وہ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے کر رہی ہو۔ جیپ سامنے سے آتے ہوئے ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ریحان نے، پھرتی کے ساتھ اسٹیئرنگ کو گھما کر یوٹرن لیا۔ اور جیپ دھماکے کے ساتھ کچی سڑک پر اترتی چلی گئی۔ طویل سانس لیتے ہوئے ریحان نے جیپ کو ریورس گیئر میں ڈالا اور دوبارہ سڑک پر لے آیا۔

لڑکی کپڑے تبدیل کر کے واپس اگلی سیٹ پر چلی آئی۔ اب وہ سیاہ رنگ کی سوئیٹر اور سیاہ رنگ کی پینٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے چہرے پر شوخی کے تاثرات نمایاں تھے۔ پہلی دفعہ ریحان نے اس کے سراپے کا گہری نگاہوں کے ساتھ جائزہ لیا۔ وہ نہایت خوب صورت ہونے کے علاوہ انتہائی پرکشش بھی تھی۔ اس کے جسم کے قیامت خیز جسمانی اعضاء کسی بھی ہوش مند انسان کو پاگل کر دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ریحان کا واسطہ اپنے کام کے دوران اکثر اوقات صنف نازک کی مختلف اقسام سے پڑتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ انہیں نظر انداز کر دیتا تھا۔ لیکن آج تو معاملہ مختلف تھا۔ نہ جانے اس لڑکی کے قیامت خیز جسم میں ایسی کیا جنسی کشش موجود تھی کہ وہ گاڑی چلانے کے دوران بھی اپنے ہوش و حواس پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔ خطرناک حادثہ ہو سکتا تھا۔ اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے اپنے حواسوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ پھر نگاہیں سامنے موجود سڑک پر جما دیں۔

لڑکی معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''حادثہ ہوتے ہوتے بچا ہے۔ شاید تمہاری نگاہیں اور دماغ کہیں اور مصروف عمل تھے۔''

ریحان نے جواب نہیں دیا اور چوری پکڑے جانے پر جھنجھلائے ہوئے انداز میں جیپ کی رفتار مزید تیز کر دی۔

لڑکی دوبارہ بولی۔ ''میرا نام فہمینا ہے۔ تم پیار سے مجھے فیمی کہہ سکتے ہو۔ اور تمہارا نام؟''

ریحان نے اس دفعہ سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میرا نام ریحان ہے۔''

فیمی شرارت بھرے لہجے میں بولی۔ ''کیا میں تمہیں پیار سے رینی پکار سکتی ہوں۔''

ریحان مسکرانے لگا۔ پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تمہارا جو دل چاہے بولو۔ میری جانب سے اجازت ہے۔ لیکن یہ ضرور بتادو کہ تاملی شہر میں تمہیں کہاں اتاروں۔ کیوں کہ وہ قریب آ رہا ہے۔''

فیمی اس دفعہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''میں آج سے پہلے تاملی کبھی نہیں آئی۔ سمجھو نو وارد ہوں۔ اگر تم کسی اچھے ہوٹل کا پتہ بتادو۔ تو تمہاری احسان مند رہوں گی۔'' ریحان سوچ میں پڑ گیا۔

دہقان نو تمام کا تمام خالی پڑا تھا۔ اس کے معاشی حالات بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں تھے۔ پیٹرول پمپ کا کام خسارے میں جا رہا تھا۔ اکا دکا گاڑیوں کے گاہک تھے۔ یا پھر کسی حد تک گزارے لائق پیٹرول فروخت ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ تمام دن مکھیاں ہی مارتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ فیمی کو ہوٹل میں کمرہ دینے کے لئے ہچکچا رہا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ اپنی بیوی عینی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور فیمی خطرے کی حدود کو پھلانگتی ہوئی جوانی کی مالک تھی۔ اگر کچھ الٹا سلٹا ہو جاتا۔ تب وہ تمام زندگی اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاتا۔ مختصر وقت کی سوچ و بچار کے دوران اس نے دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ وہ فیمی کو دہقان نو میں کمرہ نہیں دے گا۔ حتمی فیصلہ کرنے کے بعد وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''تمہیں کس حیثیت کا کمرہ درکار ہے۔ تاملی میں موجود تمام ہوٹل والوں سے میری واقفیت موجود ہے۔ تمہیں تمہارے معیار کے مطابق کمرہ مل جائے گا۔''

فیمی طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے دہقان نو میں کمرہ چاہئے۔''

ریحان نے چونکتے ہوئے فیمی کی جانب دیکھا۔ پھر حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم دہقان نو کے متعلق کیسے جانتی ہو۔ وہ میرا ذاتی ہوٹل ہے۔''

فیمی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''پارکنگ لاٹ کے منیجر نے مجھے اس کے متعلق بتایا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی

کہ تمہارے مالی حالات ابتر ہیں۔ اس کے باوجود بھی تم ہوٹل میں کمرہ دینے سے انکاری ہو۔"

ریحان شرمندہ لہجے میں بولا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ اگر سچ پوچھو تو مجھے دہقان نو تمہارے معیار کے مطابق نظر نہیں آتا۔ پھر بھی اگر بضد ہو تو پہلے ایک مرتبہ ہوٹل کا وزٹ کرلو۔ اگر تمہیں کمرہ پسند آتا ہے تب ضرور کرائے پر لے سکتی ہو۔" فیمی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

گاڑی تامیلی شہر میں داخل ہوگئی۔ شہر سے کچھ ہٹ کر ہائی وے کے قریب، سڑک سے نیچے دہقان نو کی کھنڈر نما عمارت موجود تھی۔ بارش کی بدولت کچا راستہ پتلے کیچڑ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ سڑک کے کنارے دہقان نو اور پیٹرول کی سہولت دستیاب ہے۔ کا بورڈ آویزاں تھا۔

ریحان نے جیپ کو کچے راستے پر اتار دیا۔ ہوٹل اور پیٹرول پمپ کے، نہ چلنے کی وجہ سے سڑک تھی۔ جو پہاڑیوں کے درمیان گھوم کر دہقان نو کی جانب جاتی تھی۔ اگر دہقان نو کی عمارت سڑک کے کنارے واقع ہوتی۔ تب ریحان سے کام سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ کچھ آگے جا کر یہ کچا راستہ اچانک گھوم گیا۔ سامنے دہقان نو کی عمارت نمودار ہوگئی۔ لکڑی سے بنی ہوئی عمارت دو منزلہ تھی۔ نچلے حصے میں گاڑیوں کا سامان اور گودام کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں لکڑی کی سیڑھی اوپر کی جانب جاتی تھی۔ جسے حسب ضرورت اسی کے ذریعے اوپر کی جانب کھینچ کر عمارت کو بوقت ضرورت محفوظ کیا جاسکتا تھا۔ عمارت کے سامنے کے حصے کو جھاڑیوں سے صاف کر کے ہموار خطے کی صورت دی گئی تھی۔ جہاں پیٹرول پمپ کی ٹینکی اور شیشے سے مزین مختصر کمرہ موجود تھا۔

فیمی نے تاسف بھری نگاہوں سے دہقان نو کی عمارت کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "یہاں بھلا کون پیٹرول بھروانے کے لئے آتا ہوگا۔ اگر عمارت سڑک کے کنارے ہوتی تب بات کچھ اور ہوتی۔"

ریحان گھمبیر لہجے میں بولا۔ "پیٹرول کے گاہک مستقل ہیں۔ وہ گاڑی کی سروس کے لئے یا پھر مرمت کے لئے یہاں آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن گزارا باآسانی ہوجاتا ہے۔ سیزن میں دہقان نو بھی کچھ نہ کچھ انکم دے دیتا ہے۔ ویسے، تھوڑی جمع پونجی ہونے کے بعد میرا اور میری بیوی کا ارادہ ہے کہ یہ زمین فروخت کرکے سڑک کے پاس مختصر زمین خرید کر وہاں دہقان نو اور پیٹرول پمپ کو شفٹ کرلیا جائے۔"

فیمی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ "اچھی سوچ ہے لیکن اگر موجودہ زمین مناسب داموں فروخت ہوجائے تب....."

"بصورت دیگر سڑک پر زمین خریدنا ممکن نہیں۔" ریحان نے جواب نہیں دیا۔ اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس کے جسم پر پانی کی بوچھاڑ پڑی۔ ریحان نے بھاگ کر پیٹرول پمپ کے ساتھ بنے ہوئے شیشے کے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہونے کے بعد دراز میں سے دہقان نو کی چابیاں باہر نکالیں۔ کمرے میں ایک جانب سیاہ چھتری بھی موجود تھی۔ اس نے اٹھائی اور پھرتی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

فیمی جیپ میں اس کی منتظر تھی۔ اس نے اسے ہمراہ لیا۔ اور سیڑھیاں چڑھ کر دہقان نو کی عمارت کی جانب چلا آیا۔ کمرہ مختصر لیکن صاف ستھرا تھا۔ فیمی نے چارجز دریافت کئے۔

تب ریحان بولا۔ "ڈھائی سو روپے فی یومیہ..... چونکہ آپ کے ساتھ اچھی سلام دعا ہوچکی ہے اس لئے دو سو روپیہ یومیہ..... کھانے پینے کے چارجز علیحدہ ہوں گے۔"

فیمی بولی۔ "معاوضہ مناسب ہے۔ مجھے کمرہ ایک مہینے کے لئے درکار ہے۔ میں تین ہزار روپے ایڈوانس دے دیتی ہوں۔"

ریحان کی باچھیں کھلتی چلی گئیں۔ فیمی نے بیگ میں سے رقم باہر نکال کر حیران و پریشان کھڑے ریحان

کے ہاتھوں میں تھمادی۔ ریحان نے پھرتی کے ساتھ رقم جیب میں ڈالی اور کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

''اگر کسی بھی قسم کی خدمت درکار ہو۔ تب انٹر کام موجود ہے۔ تم کال کرسکتی ہو۔''

فیمی نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

ریحان نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور آرام گاہ میں داخل ہوگیا۔ عینی اس کی منتظر تھی۔ اس نے باتھ روم میں گرم پانی رکھ دیا۔ پھر تولیہ ریحان کو تھماتے ہوئے بولی۔

''آپ غسل کرکے کپڑے تبدیل کرلیجئے۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔'' ریحان نے جواب دیئے بغیر تولیہ تھاما اور غسل خانے میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ غسل کرنے کے بعد وہ ڈائننگ ٹیبل کی جانب چلا آیا۔ عینی کھانا لگا چکی تھی۔ اور ٹیبل پر اس کی منتظر تھی۔ کھانے کے دوران خاموشی طاری رہی۔ قہوہ پیتے ہوئے ریحان بولا۔

''پیٹرول کی ڈیلنگ کامیاب رہی۔ کل پیٹرول تامیلی پہنچ جائے گا۔ میں نے زیادہ کا سودا نہیں کیا۔ صرف ایک ہفتے کا پیٹرول ہوگا۔ اگر ہفتے کے دوران نکل گیا تو مزید لے آؤں گا۔ عینی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے ہمراہ جیپ میں آنے والی لڑکی کون تھی۔ کیا دہقان نو کی رہائشی ہے؟''

ریحان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور بولا۔

''ٹرین میں میرے ہمراہ تامیلی تک آئی تھی۔ وہاں سے اسے دہقان نو کے متعلق معلوم ہوا۔ میں اسے اپنے ہمراہ یہاں لے آیا۔''

عینی بولی۔ ''نہایت طرح دار اور خوب صورت لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ امارت کے معاملے میں بھی ہاتھ چھوٹ معلوم پڑتی ہے۔'' ریحان پرجوش لہجے میں بولا۔

''وہ تین ہزار روپے ایڈوانس دے چکی ہے، اس کا ارادہ یہاں ایک مہینہ رکنے کا ہے۔ رہی خوبصورتی کی بات...... تو وہ تم سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے۔''

عینی نے مسکراتے ہوئے ریحان کی جانب دیکھا۔ پھر پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ''اب تم آرام کرو۔ تمام دن مصروفیت کے دوران گزر گیا ہوگا۔ یقیناً تم تھک چکے ہوگے۔'' ریحان نے آگے بڑھ کر عینی کو اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ پھر مختصر بوسہ لیتے ہوئے بولا۔ ''جسم تھکن کے مارے ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے واقعی آرام کی ضرورت ہے۔ تم برتن سمیٹ لو۔ میں دانت برش کر آؤں۔'' عینی برتن سمیٹنے لگی اور ریحان باتھ روم کی جانب چل دیا۔

تمام رات بارش ہوتی رہی۔ صبح کے قریب مطلع صاف ہوگیا۔ بارش میں بھیگنے کی بدولت ریحان کی آنکھ صبح دیر سے کھلی۔ جسم بخار کی بدولت ٹوٹ رہا تھا۔ عینی نے اسے ڈسپرین کی گولی دودھ کے ساتھ دی اور وہ سونے کے لئے لیٹ گیا۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تب نو بجنے والے تھے۔ بخار کافی حد تک کم ہوگیا تھا۔ اس نے اٹھ کر نیم گرم پانی کے ساتھ غسل کیا۔ عینی کمرے میں موجود نہیں تھی۔ ریحان نے کمرے کی کھڑکی کھول کر پیٹرول پمپ کی جانب نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔ ''نہ جانے کتنے گاہک آکر واپس جا چکے ہوں گے۔'' نیچے جھانکنے پر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ عینی پیٹرول پمپ کے سامنے بنے ہوئے شیشے کے کمرے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ نقاب میں پوشیدہ تھا۔ اور وہ منیجر والا رجسٹر ہاتھوں میں تھامے کھاتوں کا معائنہ کررہی تھی۔

پیٹرول پمپ میں کام کرنے والا لڑکا جس کا نام عدنان تھا۔ وہ پیٹرول پمپ کی ٹینکی کے پاس کھڑا تھا۔ ریحان کو ندامت کا شدید احساس ہوا۔ عینی ایک باپردہ عورت تھی۔ اور آج سے پہلے ایسا کبھی بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے باہر نکل کر پیٹرول پمپ کا کام سنبھالنا پڑا ہو۔ عینی نے اچانک ہی ہاتھوں میں موجود رجسٹر کو بند کیا۔ اور چونکتے ہوئے ریحان کی جانب دیکھا۔ ریحان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ عینی نے رجسٹر کو شیشے کے کمرے میں موجود میز پر رکھا اور سیڑھیاں چڑھ کر رہائشی کمرے میں چلی آئی۔ ریحان نے اسے پیار کیا۔ پھر افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

''میری وجہ سے تمہیں آج بہت کام کرنا پڑا۔ مجھے افسوس ہے آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

عینی پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ''افسوس کس بات کا۔ میں تمہاری بیوی ہوں۔ کوئی غیر نہیں ہوں۔ تمہارا ہاتھ بٹانا میرا فرض بنتا ہے اور پھر میں نے کیا ہی کیا ہے۔ سب کام تو عدنان نے سنبھال لیا تھا۔ میں تو صرف نگرانی کر رہی تھی۔'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پریشان لہجے میں بولی۔ ''ریحان ہمارا موجودہ کام تسلی بخش نہیں ہے۔ میں فراغت میں بیٹھی لیجر چیک کر رہی تھی۔ پیٹرول پمپ اور دہقان نو پینتیس ہزار روپے کے مقروض ہیں۔ ہمیں مزید کھینچ تان کر گزارا کرنا ہوگا۔''

ریحان بولا۔ ''اب اس سے زیادہ مزید کیا کھینچ تان کر گزارا کریں۔ رہی مقروض ہونے کی بات...... تو میں نے سوچا ہے کہ اگلے سیزن میں اس جگہ کو فروخت کردوں گا۔ اور گورنمنٹ سے کچھ قرضہ لینے کے بعد ہائی وے کے پاس مختصر ٹکڑا زمین کا لے کر صرف پیٹرول پمپ اور رہائشی کمرہ تیار کرکے وہاں شفٹ ہوجاؤں گا۔ ہوٹل بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ علاقہ ہوٹل کے کام کے لئے موضوع نہیں ہے۔''

عینی بولی۔ ''تمہاری سوچ انتہائی دانشمندانہ ہے۔ لیکن کارگر اس وقت ثابت ہوسکتی ہے جب ہماری موجودہ زمین اچھے داموں فروخت ہوجائے۔ لیکن جگہ کی مناسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔''

ریحان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''سوچ کو ہمیشہ مثبت رکھنا چاہئے۔ خدا بہتر کرے گا۔ تم ناشتہ تیار کرو۔ تاکہ میں فارغ ہوکر نیچے جاسکوں۔''

عینی نے اثبات میں سر ہلایا اور کچن کی جانب چلی گئی۔

ریحان نے ناشتہ عجلت میں کیا۔ اور نیچے پیٹرول پمپ کی جانب چلا آیا۔ پیٹرول پمپ پر کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک گاڑی سروس کے لئے آئی۔ اس کے علاوہ اکا دکا گاڑیوں نے پیٹرول بھروایا۔ یہ نہایت پریشانی کی بات تھی۔

بارہ بجے کے قریب جب ریحان بوریت کے ہاتھوں مجبور ہوکر خودکشی کے متعلق سنجیدگی سے ساتھ غور کررہا تھا۔ تب دہقان نو کی سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پیٹرول پمپ پر کام کرنے والے لڑکے نے چونک کر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ فیمی سرخ رنگ کی اسکرٹ اور سیاہ رنگ کا بلاؤز پہنے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ اسکرٹ اور بلاؤز میں اس کا دودھیا جسم کافی حد تک نمایاں ہورہا تھا۔ وہ اس وقت قیامت ڈھا رہی تھی۔ ریحان کی آنکھیں اس کے جسم کے ساتھ تقریباً چپک کر رہ گئیں۔ پیٹرول پمپ پر کام کرنے والے لڑکے کا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا۔ فیمی کے سیاہ چمکدار بال کمر کے نیچے کولہوں تک لمبے تھے۔ اس نے انہیں کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز موجود تھے۔ سیڑھیوں سے اتر کر وہ سیدھی ریحان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اور مسکراتے ہوئے شیطانی بھرے لہجے میں بولی۔

''صبح بخیر مسٹر ریحی...... امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔''

ریحان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں مس فیمی...... کیا تم نے ناشتہ کرلیا۔ یا پھر میں بندوبست کردوں۔''

فیمی بولی۔ ''ناشتہ تو دور کی بات ہے۔ میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ تم رات کو کمرے سے ایسے بھاگے کہ تم نے دوبارہ خیریت دریافت کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔''

ریحان شرمندہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے معاف کرنا مس فیمی...... یہ واقعی میری غلطی ہے۔ لیکن رات کو بارش میں بھیگنے کی بدولت مجھے بخار چڑھ گیا تھا۔ اس لئے غفلت کی بدولت تمہاری خیریت دریافت نہ کرسکا۔ تم کمرے میں بیٹھو میں تمہارے لئے ناشتہ تیار کرواتا ہوں۔''

فیمی بولی۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔''

ریحان بولا۔ ''بہتر ہے، جسم میں حرارت وقتی تھی۔

ڈسپرین کی گولی موافق ثابت ہوئی اور بخار اتر گیا۔"

"میرے خیال میں آج تمہارے پاس کام زیادہ نہیں ہے؟" فیمی نے ارد گرد نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ ہفتے کے چند ایام میں کچھ دن ایسے ہوتے ہیں۔ جن میں کام کی کمی ہوتی ہے۔"

فیمی معنی خیز لہجے میں بولی۔ "اگر تم مجھے تاملی گھمانے کا وعدہ کرو۔ تب میں تمہیں پانچ سو روپے دن کے دینے کے لئے تیار ہوں۔ زور زبردستی نہیں ہے۔ اگر فراغت سے جان چھڑانا چاہتے ہو تب جواب دو۔ ورنہ رہنے دو۔"

ریحان سوچ میں پڑ گیا۔ کام نہ ہونے کے برابر تھا اور جو تھا اسے عدنان بخوبی سنبھال سکتا تھا۔ فیمی کی آفر بری نہیں تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور بولا۔ "تم کمرے میں بیٹھو۔ میں اپنی بیوی کو بتا کر واپس آتا ہوں۔" فیمی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ اور فیمی شیشے کے کمرے میں بیٹھ گئی۔ ریحان اوپر بنے رہائشی کمروں کی جانب چلا گیا۔

اسے واپس آنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اس عرصے میں عدنان، جیپ کو تیار کر چکا تھا۔ فیمی کے جیپ میں بیٹھتے ہی ریحان نے جیپ کو اسٹارٹ کیا اور تاملی شہر کی جانب چل دیا۔ فیمی مسکراتے ہوئے بولی۔

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مجھے شور شرابہ بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ اس لئے گاڑی کا رخ شہر سے باہر کی جانب کر دو تو بہتر ہوگا۔"

ریحان نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ فیمی کی جانب دیکھتے ہوئے جیپ کو موڑا اور اس کا رخ شہر سے باہر کی جانب کر دیا۔ وہاں قریب ہی ایک خوب صورت چراہ گاہ الحبیبہ کے نام کی موجود تھی۔ دنیا میں اگر کہیں جنت موجود تھی۔ تو تاملی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ تاملی شہر کے پہاڑی علاقہ جات کے ایک کونے میں الحبیبہ کے نام کی مناسبت سے پائی جاتی ہے۔ دشوار گزار پہاڑی چٹانوں کے درمیان موجود مٹی کے راستے پر جیپ، با آسانی بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ جیپ میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی لگاتار اور ڈرائیونگ کے بعد جب جیپ نے پہاڑی چراہ گاہ کے درمیان قدم رکھا۔ تب دن کے ڈیڑھ بجنے والے تھے۔ سورج مکمل آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سرسبز چراہ گاہ سے کچھ دور موجود پہاڑوں سے سفید پانیوں کی آبشار نیچے گر کر چشمے کی صورت میں چراہ گاہ کا رخ کرتی تھی۔ زمین پر سرسبز گھاس کا قالین بچھا ہوا تھا۔ جس میں جا بجا سرخ نیلے پیلے پھولوں کے گلدستے جگہ جگہ نمایاں تھے۔

چراہ گاہ کے ایک جانب مقامی لوگ رنگین کے بنے ہوئے خیمے لئے بیٹھے تھے۔ یہ خیمے کرائے پر رات گزارنے کے لئے دیئے جاتے تھے۔ وہاں قریب ہی ایک پہاڑی ہوٹل موجود تھا۔ جس کی دیواریں لکڑی کے مضبوط تختوں پر مشتمل تھیں۔ اور کرسیوں میز کے علاوہ وہاں چارپائیاں بھی موجود تھیں۔

چونکہ یہاں غیر ملکی سیاحوں کی بھرمار تھی۔ اس لئے شراب کی بوتلیں عام دستیاب تھیں۔ البتہ لائسنس کا ہونا ضروری تھا۔ وہاں قریب ہی ایک پہاڑی ٹیلہ موجود تھا۔ جس پر سرسبز جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ایک شہتوت کا درخت بھی اگا ہوا تھا۔ جس کی چھاؤں میں لکڑی کا بنچ نصب تھا۔ ریحان نے سرسبز ٹیلے کے پاس گاڑی روکی۔ اور فیمی کے ہمراہ ٹیلے کے اوپر موجود شہتوت کے درخت کی جانب چل دیا۔

بنچ پر بیٹھنے کے بعد فیمی خوابیدہ لہجے میں بولی۔

"بہت خوب صورت چراہ گاہ ہے۔ کیا یہاں قریب کوئی آبادی بھی ہے؟"

ریحان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "پہاڑی آبشار کے دوسری جانب چھوٹے موٹے گاؤں کی صورت ہے۔ شہروں کا نام و نشان موجود نہیں ہے۔"

فیمی آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔ "آئیڈیل جگہ ہے۔ مجھے ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی۔" اس نے جھکتے

کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ پھر معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اور تمہارے جیسے ساتھی کی..... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اور تم ایک دو دن یہاں رک جائیں۔'' ریحان نے ہڑبڑا کر فیمی کی جانب دیکھا۔ پھر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم کیسی باتیں کررہی ہو۔ میرے گھر میں میری پیار کرنے والی بیوی میری منتظر ہے۔ میں اس کے بغیر یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں چند گھنٹے گھومنے کے لئے درکار ہیں۔ اس کے بعد ہم واپس شہر روانہ ہوجائیں گے۔ اگر تم یہاں مزید رکنا چاہتی ہو۔ تب میں بندوبست کئے دیتا ہوں۔''

فیمی غصیلے لہجے میں بولی۔ ''تم اپنی بیوی سے اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ وہ تمہیں مار نہیں ڈالے گی۔ تمہاری طرح وہ بھی انسان ہے۔ کچھ حوصلہ کرو۔''

ریحان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ڈر یا خوف نہیں ہے۔ محبت ہے۔ وہ میری ہمسفر ہے۔ میں اس کے بغیر کھانا کھانے کو بھی اچھا نہیں سمجھتا ہوں۔ تم رات گزارنے کی بات کرتی ہو۔''

فیمی جواب دیئے بغیر ٹیلے سے نیچے اتر کر پہاڑی ہوٹل کی جانب چل دی۔ اس نے وہاں سے شراب کی بوتل خریدی۔ ساتھ میں چھوٹے گوشت کے تکوں کی پلیٹ اور دوبارہ ٹیلے کے اوپر بنے ہوئے درخت کے نیچے بنچ پر آبیٹھی۔

ریحان طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''میرا مقصد تم کو ناراض کرنا نہیں تھا۔ لیکن بات میرے اختیار میں نہیں اس لئے حامی بھرنا بھی ممکن نہیں۔''

فیمی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''سب ٹھیک ہے۔ میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگی۔ میرے تمہارے درمیان کاروباری رابطے کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ مجھے تم سے اتنی توقعات وابستہ کرنی ہی نہیں چاہئے تھی۔''

ریحان بولا۔ ''تم ایک اچھی لڑکی ہو؟ میں دلی طور پر تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اور تمہاری ناراضگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنا ضرور کرسکتا ہوں کہ آج کی شام تمہارے نام کردوں۔ سامنے خیمہ کرائے پر دستیاب ہے۔ میں یہاں ٹیلے پر لے آتا ہوں۔ تاکہ ہمارے درمیان کوئی مداخلت نہ کرپائے۔''

فیمی کا چہرہ گلاب کے پھول کی مانند کھل اٹھا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ ریحان تیز قدموں کے ساتھ ٹیلے سے نیچے موجود مقامی باشندوں کی جانب چل دیا۔ جو خیمے کرائے پر دیتے تھے۔ اسے فیمی کی نفسیات کو سمجھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ وہ نہایت آزاد خیال لڑکی دکھائی دیتی تھی۔

ریحان نے دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ آج کی شام کے بعد فیمی سے کسی بھی قسم کا تعلق رکھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ یہی فیصلہ اس کے حق میں بہتر ثابت ہوسکتا تھا۔ اس نے خیمے والوں سے خیمہ کرائے پر لیا۔ اور مقامی مزدوروں کے ہمراہ اسے ٹیلے پر نصب کردیا۔ فیمی اس دوران تکے کی پلیٹ کا صفایا کرچکی تھی۔ لیکن شراب کی بوتل اس کے ہاتھوں میں محفوظ تھی۔ دونوں خیمے کے اندر آبیٹھے۔ چمکدار سورج کی روشنی اور آسمانی رنگ کے خیمے کی بدولت اندر کا ماحول نہایت خوابناک معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دونوں سمندر کے نیلگوں پانی کے درمیان براجمان ہوں۔ فیمی کے چہرے پر فاتحانہ تاثرات ثبت تھے۔ وہ خوشی سے مغلوب لہجے میں بولی۔

''میں تمہارے لئے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔ وقت گزرتا جارہا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ ہم دونوں زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ گزاریں۔'' وہ جواب سنے بغیر نیچے ہوٹل کی جانب چلی گئی۔

پندرہ منٹ کے بعد دونوں کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ مچھلیوں کے قتلے، آلو کے چپس اور سرخ رنگ کا خوشبودار جوس..... ایسا جوس ریحان نے پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔ اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اسے رہ رہ کر عینی کی یاد ستارہی تھی۔ آج سے پہلے اس نے کبھی بھی عینی کے بغیر کھانا نہیں کھایا تھا۔ نجانے وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ ریحان اسے کہہ کر آیا تھا کہ ''وہ تین سے چار کے درمیان واپس آجائے گا۔''

سرخ مشروب پیتے ہی اسے ایسا محسوس ہونے

لگا جیسے اس کا جسم نہایت ہلکا پھلکا ہوگیا ہو۔ دماغ پر موجود بوجھ تیزی کے ساتھ چھٹنے لگا۔ اور اس کے چہرے پر اطمینان کی دبیز چادر تننے لگی۔ فیمی نے برتن سمیٹے اور باہر موجود ہوٹل کے نوکر کے حوالے کرنے کے بعد پے منٹ کردی۔ پھر خیمے میں واپس آ گئی۔

دوپہر کے چار بجنے والے تھے۔ مغرب کی جانب سے سیاہ بادل امڈ کر آسمان کا گھیرا کر رہے تھے۔ لوگوں نے واپس تاملی شہر کی جانب جانا شروع کردیا۔ لیکن زیادہ تر منچلے خیموں کی تنصیب میں مشغول تھے۔ ان کا ارادہ رات الجبیہ میں گزارنے کا تھا۔ فیمی خیمے میں سر جھکائے ہوئے ریحان کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ایک جانب موجود بیگ میں سے نہایت مختصر لیکن جدید کیمرہ باہر نکالا۔ اور اسے پتلے دبلے اسٹینڈ پر نصب کرنے لگی۔ ریحان نے پوچھا۔

''یہ کیا کررہی ہو؟''

فیمی بولی۔'' مووی کیمرہ نصب کررہی ہوں۔ کچھ یادگار لحات کو قید کرنے کے لئے...... فارغ اوقات...... میں یاد کروں گی...... کہ میں نے تمہارے ساتھ کبھی بہت اچھا وقت گزارا تھا۔'' ریحان جھنجلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔''فیمی میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں، اور اس بات سے بخوبی آگاہی رکھتا ہوں کہ میری شخصیت میں کوئی بھی ایسی بات موجود نہیں ہے جو مجھے دوسروں سے ممتاز کرسکے۔ آج صبح سے مجھے تمہارا رویہ کچھ مشکوک محسوس ہورہا ہے۔ تم مجھے بہت زیادہ اہمیت دے رہی ہو۔ میرے خیال کے مطابق نہیں دینی چاہئے۔ ظاہر ہے اگر تم ایسا کررہی ہو تو کسی وجہ سے کررہی ہو۔ مہربانی کرکے اس ڈرامے کو ختم کردو اور مجھے بتاؤ کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟''

فیمی مسکراتے ہوئے بولی۔'' ریحان تم بہت شکی مزاج ہو۔ یقین کرو۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ بات، اگر کچھ ہے تو صرف اتنی ہے کہ پہلی نظر میں ہی میں تم پر فدا ہوگئی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ تم شادی شدہ ہو۔ اور ایک عدد پیار کرنے والی بیوی کے شوہر بھی ہو۔ مجھے اس سے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو صرف تمہارے پیار کی طلب گار ہوں۔ جو کچھ لمحے ہم اکٹھے گزاریں گے انہیں نہایت خفیہ طریقے سے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ میرا تاملی شہر کی جانب آنا نہیں ہوتا۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ آئندہ سال میں دو دفعہ یہاں ضرور آؤں گی صرف تمہاری خاطر...... اور تمہارے دیدار کی خاطر...... میرے خیال میں اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔ تمہارے مذہب میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت موجود ہے۔ تو پھر ایک پیار کی کیوں نہیں......؟'' فیمی خاموش ہوگئی۔

ریحان بولا۔'' اور تمہارا مذہب کیا ہے؟ کیا تم مسلمان نہیں ہو۔''

فیمی مسکراتے ہوئے بولی۔'' میرا مذہب محبت ہے۔ اور میری دنیا تم ہو۔ آج کے بعد تمہارے دل و دماغ اور جسم پر میری حکومت ہوگی۔ عینی چونکہ مجھ سے پہلے تمہاری زندگی میں آئی تھی۔ اس لئے میں اسے برداشت کرلوں گی۔ لیکن مزید کو نہیں۔ میری جانب سے زور زبردستی نہیں ہے۔ تم خودمختار ہو۔ جیسا کہو گے ویسا ہی ہوگا۔''

ریحان سوچ میں پڑگیا۔ وہ جو باتیں کررہی تھی۔ غلط نہیں تھیں۔ لڑکی نہایت خوب صورت تھی۔ کسی بھی انسان کے لئے یہ بات فخر سے کم نہیں تھی کہ اس جیسی حسین وجمیل لڑکی اس پر فدا ہوجائے۔ رہی عینی کی بات...... تو ریحان کو محبت صرف عینی سے ہی تھی۔ لیکن اگر جسمانی محبت کے لئے فیمی کا انتخاب کرلیا جاتا تو کیا مضائقہ تھا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا۔ حرام مال کو بھی حلال سے تشبیہ دینے کے بعد استعمال کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ تو پھر جسمانی محبت کے لئے، کیوں نہیں۔ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد ریحان دوبارہ بولا۔

''اور اگر میری بیوی کو معلوم ہوگیا۔ تب میری ازدواجی زندگی متاثر ہوکر رہ جائے گی۔ اس کے متعلق

تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اسے کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔" فیمی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "ہم دہقان نو کی عمارت میں اجنبیوں کی طرح رو رہیں گے۔ اگر ملنے کی ضرورت درپیش آئی۔ تب میرے خیال میں الحبیبہ سے بہتر جگہ ہمیں پورے تاملی شہر میں دستیاب نہیں ہوسکتی۔"

اس دفعہ ریحان نے مطمئن انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ پھر خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔ "اب میرے خیال میں ہمیں جلد از جلد دہقان نو کا رخ کرلینا چاہئے۔ میری بیوی کو اگر شک ہوگیا تب آئندہ کی ملاقاتوں پر یہ بات اثر انداز ہوسکتی ہے۔" فیمی نے اثبات میں سر ہلایا اور خیمے کا کھلا ہوا دروازہ بند کرکے زپ اوپر چڑھادی۔ اب خیمے کو باہر سے کوئی بھی نہیں کھول سکتا تھا۔

ریحان کی آنکھ کھلی۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں کمرے کی چھت کو گھورتا رہا۔ اس کے دماغ نے جلد ہی کام کرنا شروع کردیا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے کمرے کی چھت کا رنگ نیلاہٹ مائل نہیں تھا۔ بلکہ آف وائٹ تھا۔ لیکن آج چھت کا رنگ نیلا تھا۔ اس نے کروٹ بدلتے ہوئے عینی کی جانب دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن عینی موجود نہیں تھی۔ لیکن جو وجود خواب استراحت کی حالت میں موجود تھا۔ اس کے بال براؤن تھے۔ عینی کے سیاہ تھے۔ پھر اسے گزشتہ شام تمام واقعات جھماکے کی صورت میں یاد آنے لگے۔ فیمی کے ہمراہ الحبیبہ کا رخ کرنا۔ خیمے کا انتظام، لذیذ کھانے کا ذائقہ اور چند گھٹیا قسم کے معاہدوں پر مبنی رسا کشی...... پھر تمام زندگی نہ بھولنے والے لذت آمیز لمحات...... اس نے طویل سانس لیتے ہوئے سرہانے کے پاس موجود گھڑی کو اٹھایا...... اور اس میں موجود چھوٹے سے بلب کو روشن کردیا۔

صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے پہلو میں موجود فیمی نے کروٹ بدلی۔ اور جھٹکے کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ ریحان نے ایک جانب موجود اپنا لباس اٹھایا اور اسے عجلت میں پہننا شروع کردیا۔ فیمی کوئی بھی بات کئے بغیر دلچسپی کے ساتھ اس کی حرکات کا معائنہ کررہی تھی۔

ریحان غراتے ہوئے بولا۔ "ہمارے درمیان رات گزارنے کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ تمہیں مجھے وقت کے متعلق آگاہ کردینا چاہئے تھا۔ میں نے آج سے پہلے کبھی بھی رات باہر نہیں گزاری۔ عینی کو بھلا کیسے مطمئن کروں گا۔"

فیمی طنزیہ لہجے میں بولی۔ "یہ بات تمہیں ہوش و حواس کھونے سے پہلے سوچنی چاہئے تھی۔ میں تو شراب کے نشے میں چور تھی۔ وقت کا تعین بھلا کیسے کرتی۔"

ریحان بدستور غصیلے لہجے میں بولا۔ "اب اگر سامان سمیٹنے میں میری مدد کرو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔ بصورت دیگر میں تمہیں یہیں خیمے میں تن و تنہا چھوڑ جاؤں گا۔"

فیمی نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور اٹھ کر اپنے لباس کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولی۔

میں نے تم سے زیادہ ڈرپوک انسان اور زن مرید شوہر آج تک نہیں دیکھا۔ تم اپنی بیوی سے نہایت خوفزدہ دکھائی دیتے ہو۔" اس نے ایک جانب موجود اسکرٹ اٹھا کر پہنی، وہ منہ میں بڑبڑاتے چلی جارہی تھی۔

"مرد بنو مرد...... اس کے چہرے پر الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ مار کر اسے اس کی حیثیت یاد دلا دو۔ کہیں بعد میں ایسا نہ ہو کہ نامرد بن کر تم اس کے سوالوں کا جواب دیتے رہو۔"

ریحان کو اپنے جسم میں موجود خون کھولتا ہو محسوس ہونے لگا۔ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر یکے بعد دیگرے دو تھپڑ فیمی کے چہرے پر رسید کردیئے۔ وہ اوندھے منہ خیمے کے فرش پر جاگری۔ اسی اثناء میں ریحان کپڑے تبدیل کرچکا تھا۔ اس نے خیمے کے دروازے کو کھولا اور باہر نکلتے ہوئے فیمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"میں جیپ میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ پانچ

منٹ تک اگر تم باہر نہیں آئیں۔ تب میں تمہیں یہیں چھوڑ کر تاملی چلا جاؤں گا۔'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے جیپ کی جانب چل دیا۔

خیمے کی پے منٹ پہلے ہی کی جا چکی تھی۔ اس لئے ریحان کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ فیمی کو خیمے کی پے منٹ کے لئے نیچے چراہ گاہ کی جانب جانا پڑے گا۔ دو منٹ کے بعد فیمی منہ بسورتے ہوئے اسے اپنی جانب آتی دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات ثبت تھے۔ جیپ کے پاس پہنچنے کے بعد اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اور خاموشی کے ساتھ اندر بیٹھ کر دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ ریحان کافی حد تک اپنی حالت پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے تاسف بھری نگاہوں کے ساتھ فیمی کی جانب دیکھتے ہوئے شرمندہ لہجے میں کہا۔

''معاف کرنا میں نے جذباتی ہو کر تم پر ہاتھ اٹھا لیا۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں۔ میاں بیوی کے رشتے کے درمیان اعتماد و یقین کی حیثیت نمایاں اہمیت کا اختیار رکھتی ہے۔ تمہاری وجہ سے اعتماد کے اس رشتے میں میرے خیال کے مطابق دراڑ آنے کا خدشہ پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے آج پہلی دفعہ اسے وجہ بتائے بغیر رات باہر گزاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرے گی۔ لیکن آئندہ محتاط رہے گی۔ شاید ہمارے درمیان سرد مہری کی دیوار بھی حائل ہو جائے۔ نہ جانے کتنے سال لگ جائیں گے اس رشتے کو دوبارہ قائم کرنے میں......''

فیمی نے کوئی بھی جواب نہیں دیا۔ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ فرنٹ شیشے سے باہر دیکھنے میں مصروف تھی۔ ریحان نے طویل سانس لیتے ہوئے فیمی کی جانب دیکھا۔ اور اس دفعہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

''اگر مجھے معاف نہیں کرو گی تو میرا چہرہ تمہارے سامنے ہے۔ جتنے چاہے تھپڑ چہرے پر رسید کر دو۔ میں اف تک نہیں کروں گا۔'' بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے جیپ کو بریک لگا کر روک دیا۔ اور چہرہ فیمی کی جانب کر دیا۔ جیپ تاملی شہر سے ابھی کافی دور تھی۔ فیمی نے جیپ کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئی۔ اس کا بیگ اس کے کاندھے پر موجود تھا۔ دروازے کو جھٹکے کے ساتھ بند کرنے کے بعد اس نے مڑے بغیر اونچی آواز میں ریحان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میں تم دونوں کے درمیان آنا نہیں چاہتی۔ جو کچھ بھی ہوا۔ اس میں میری ناسمجھی کا زیادہ عمل دخل ہے۔ لیکن اب مجھے سمجھ آ گئی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ واپس نہیں آنے کے لئے...... تم اعتماد کا رشتہ قائم کرتے رہو۔''

پھر وہ تیز قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی غائب ہو گئی۔

ریحان ہڑبڑا کر جیپ سے نیچے اتر آیا۔ صبح کے ساڑھے پانچ بجنے والے تھے اور سورج طلوع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ اس لئے منظر واضح تھا۔ جیپ پہاڑی علاقے کے درمیان کھڑی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب پہاڑ تھے۔ جو کافی حد تک سڑک سے ہٹ کر تھے۔ ان تک پہنچنے کے دوران نگاہوں کے سامنے سے غائب ہونا ممکن نہیں تھا۔ لیکن وہ غائب ہو گئی تھی۔

پہاڑی سلسلے کے درمیان مختصر درے کے اثرات دکھائی دیتے تھے۔ ''شاید وہ اسی جانب گئی ہو گی۔'' ریحان نے سوچا۔ درے کی جانب اس پہر جانا ممکن نہیں تھا۔ وہاں بھیڑیوں کے غول موجود تھے۔ سردیوں کے دنوں میں وہ بھوک کی بدولت انسانوں پر حملہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ ریحان نے جیپ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر اسے گھر کی جانب بھگانے لگا۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب ریحان دہقان نو کی عمارت میں داخل ہوا۔ عمارت میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی کی آواز گونجتے ہی اوپری منزل کی کھڑکی جھٹکے کے ساتھ کھلی۔ اور عینی کا ستا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ ریحان نے جیپ کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر آیا۔ عینی نے جھٹکے کے ساتھ کھڑکی بند کی۔ اور سیڑھیاں اتر کر نیچے کی جانب چلی آئی۔ ریحان نے جیپ کا دروازہ بند کیا۔ اور پشیمان قدموں کے ساتھ سیڑھیوں کی جانب چل دیا۔ عینی سیڑھیاں اتر کر اس کی جانب چلی آ رہی

تھی۔ اس کے چہرے سے صاف محسوس کیا جاسکتا تھا کہ وہ تمام رات سکون کے ساتھ سو نہیں پائی۔ ریحان نے آگے بڑھ کر اسے جھٹکے کے ساتھ اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ اس سے نگاہیں نہیں ملانا چاہتا تھا۔ عینی بے اختیار لہجے میں بولی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ناں...... میں بہت پریشان تھی۔ آپ نے خلاف معمول آج سے پہلے رات کبھی بھی باہر نہیں گزاری۔ یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔''

ریحان طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''بات کچھ ایسی ہی ہے۔ میں تمہیں سب کچھ بتادینا چاہتا ہوں۔ لیکن یہاں نہیں کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔'' اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بارش کا آغاز ہوگیا۔ دونوں مزید کوئی بات چیت کئے بغیر کمرے میں چلے آئے۔ عینی نے آتش دان میں لکڑیاں ڈالیں۔ اوران پرمٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگادی۔ ماحول میں آگ کی صورت گردش کرنے لگی۔ عینی نے اسے بتایا کہ باتھ روم میں پانی گرم رکھا ہوا ہے۔ جب تک وہ غسل کرکے باہر نکلے گا۔ تب تک وہ ناشتہ تیار کرے گی۔

ریحان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور خاموشی کے ساتھ باتھ روم میں گھس کر غسل کرنے لگا۔ اسے عینی کے گنگنانے کی آواز باتھ روم میں بھی باآسانی سنائی دے رہی تھی۔ یہ اس بات کی گواہی تھی کہ وہ دماغی طور پر پوری طرح سے الجھی ہوئی ہے۔ گزشتہ ازدواجی زندگی کے دوران جب بھی کوئی ایسا لمحہ آیا۔ جب اسے ذہنی کوفت سے دوچار ہونا پڑا۔ تب ہمیشہ اس نے اپنی کیفیت کا اظہار ایسے ہی کرکے دکھایا تھا۔ شاید وہ اپنے آپ کو مطمئن ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ یا پھر دماغ کو پرسکون رکھنے کے۔ لئے کسی من پسند گانے کا سہارا لے کر اسے گنگنا کر تفریح طبع کی کوشش کرتی تھی۔ جو بھی تھا۔

بہرحال وہ ان اوقات میں یقیناً ڈپریشن محسوس کررہی تھی۔ ریحان نے جلدی جلدی غسل کیا اور باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ میز پر ناشتہ تیار تھا اور عینی اس کی منتظر تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔

ریحان اچھی طرح جانتا تھا کہ مسکراہٹ حقیقی نہیں تھی۔ اس میں جھوٹ کا عنصر نمایاں تھا۔ دراصل وہ ریحان کو اپنے رویے کی بدولت پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی محبت کی انتہا تھی۔ ریحان اپنے آپ کو اس کے کردار کے سامنے نہایت چھوٹا محسوس کرنے لگا۔ وہ وفاداری کے پاس نہیں رکھ پایا تھا۔ لیکن عینی باوفا تھی۔ جو بھی تھا وہ اس کی نگاہوں میں گرچکا تھا۔ ناشتے کے دوران خاموشی طاری رہی۔ ریحان الفاظ کا انتخاب کرتا رہا۔ تاکہ معاملے کو کسی نہ کسی حد تک سنبھالا دے سکے۔ ناشتہ زہر مار کرنے کے بعد عینی نے برتن سمیٹے اور انہیں کچن میں چھوڑ آئی۔ پھر ریحان کے سامنے صوفے پر آبیٹھی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ریحان بولا۔

''عینی مجھے معاف کرنا۔ میں نے اپنی ازدواجی زندگی میں پہلی دفعہ رات باہر گزاری ہے۔ یہ سب اس حرافہ فہمینا کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے اسے دہقان نو میں لانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اگر تم یقین کرو۔ تب اسٹیشن سے اس کے امراہ باہر نکلنے کے بعد میں نے دس دفعہ یہ سوچا تھا کہ اسے دہقان نو ساتھ نہیں لے کر جاؤں۔ لیکن اسے پارکنگ کے منیجر نے ہوٹل کے متعلق بتاکر میرے ارادوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا۔ تب مجبوراً مجھے اسے دہقان نو لانا ہی پڑا۔ آج صبح اس نے مجھے تاملی گھمانے پھرانے کے لیئے ہائر کیا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن مالی حالات اور قرضوں کے بوجھ کو مدنظر رکھتے ہوئے حامی بھرنی ہی پڑی۔

تاملی شہر کی جانب سفر کرتے ہوئے اس نے اچانک ہی الحبیبہ جانے کی ضد کی۔ تب میں نے گاڑی چراہ گاہ کی جانب موڑ دی۔ الحبیبہ میں مختصر وقت اکٹھے گزارنے کے دوران میں نے اس کے رویے میں اپنے لئے دلچسپی کے تاثرات محسوس کئے۔ تب اس سے دور ہونے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بعض نہ آئی۔ تب میں نے واپس تاملی جانے کے ارادے کا اظہار کیا۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ بعدازاں مجھ سے فلرٹ کرنے کی بچکانہ کوشش کی۔ تب میں نے اسے بتایا کہ ''میں تم سے

کتنی محبت کرتا ہوں اور تم سے بے وفائی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔‘‘

اس نے حاسدانہ جذبات سے مغلوب ہو کر میرے کھانے میں نہ جانے ایسی کیا چیز ملادی کہ مجھے کچھ بھی ہوش نہ رہا۔ اور میں بیگانہ ہو کر زمین پر گرتا چلا گیا۔

میری آنکھ صبح سویرے کھلی۔ میں نے اسے برا بھلا کہا اور واپس تامیلی چلا آیا۔ ریحان خاموش ہوگیا۔

عینی کے چہرے پر کچھ خاص تاثرات موجود نہیں تھے۔ وہ خلاؤں میں گھورتی چلی جارہی تھی۔ ریحان نے پریشان نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ پھر پختہ لہجے میں بولا۔

’’شاید تم نے میری باتوں پر یقین نہیں کیا۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے جیسا تمہیں بتایا ہے۔ ویسا ہی الحبیبہ میں ہوا تھا۔ میں نے اسے سختی کے ساتھ دھتکار دیا تھا۔ صرف تمہاری خاطر...... میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔ وہ اب دہقان نو میں دوبارہ واپس نہیں آئے گی۔ میں نے اسے باہر نکال دیا ہے۔ یہی بات میری سچائی کا اظہار کرتی ہے۔‘‘

عینی کے سپاٹ چہرے پر اچانک ہی مسکراہٹ کے تاثرات نمودار ہوئے اور اس نے اپنا سرد ہاتھ ریحان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر بولی۔

’’مجھے تمہاری باتوں پر ایسے یقین ہے جیسے اپنی زندگی پر یقین ہے۔ پرسوں رات کو جب میں نے اس عورت کو تمہاری جیپ سے نیچے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ تب ہی مجھے اس کے طور و اطوار اچھے معلوم نہیں ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ وہ ہمارے ہوٹل کی کسٹمر تھی۔ اس لئے میں اپنی سوچ کا اظہار نہیں کرپائی۔ اچھا ہوا تم نے اسے فارغ کردیا۔ اب میرے خیال میں ہمیں اس فرسودہ موضوع کو چھوڑ کر کچھ کاروباری معاملات پر بات چیت کرلینی چاہئے۔ تمہارے الحبیبہ جانے کے بعد کمپنی والوں کا ٹینکر دہقان نو آیا تھا۔ انہوں نے ایک ہفتے کا پیٹرول ٹینکی میں ڈال دیا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر ہاشم ریپئرنگ کے لئے اپنی گاڑی سروس اسٹیشن میں چھوڑ گئے ہیں۔ عدنان گاڑی کے نقص کو جان نہیں پایا۔ اس لئے وہ دونوں تمہارے منتظر ہیں۔ ہاشم صاحب نے آج بارہ بجے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ وقت کچھ کم ہے اگر ہوسکے تو تم ابھی گاڑی پر توجہ دینا شروع کردو۔‘‘ ریحان نے مسکراتے ہوئے عینی کے ہاتھوں کو چوما اور اٹھ کر نیچے گیراج کی جانب چلا آیا۔

گاڑی میں خرابی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ پھر بھی اسے دور کرتے کرتے ساڑھے گیارہ بج ہی گئے۔ بارہ بجے کے قریب ہاشم صاحب گیراج میں داخل ہوئے۔ اور گاڑی لے کر واپس چلے گئے۔ بارش طوفانی انداز میں برس رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دینے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ موسم کی مناسبت سے کام بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ ریحان شیشے کے کمرے میں فارغ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔ اسے شدت کے ساتھ گزشتہ رات کے نہ بھولنے والے لمحات یاد آرہے تھے۔

فیمی ایک خوب صورت اور جاندار لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ گزرے مختصر لمحات کو ریحان تو کیا کوئی بھی خبط الحواس انسان بھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ وہ جتنا بھی اس کے خیالوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ اتنا ہی خیالات میں شدت آتی جاتی تھی۔ دراصل میں عینی خوب صورت نہیں تھی۔ وہ قبول صورت تھی۔ ریحان کسی حد تک حسن پرست واقع ہوا تھا۔ مالی معاملات کے اتار چڑھاؤ کی بدولت عینی اپنے رکھ رکھاؤ پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتی تھی۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے ضرور ہوتے تھے۔ لیکن نئے فیشن کے مطابق نہیں ہوتے تھے۔

ریحان کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے آخری دفعہ اسے کپڑے خریدتے ہوئے گزشتہ سال دیکھا تھا۔ ان تمام معاملات میں عینی کا قصور نہیں تھا۔ ریحان بھی حسن پرست تھا۔ اسے فیشن کرتی ہوئی نیم عریاں لڑکیاں زیادہ پسند تھیں۔ بہ نسبت پردہ دار خواتین کے...... اور عینی پردہ دار خاتون تھی۔

بارش اچانک ہی رک گئی اور بادلوں کی جانب سے سورج نے اپنی چند شعاعیں زمین کی جانب منتقل

کردیں۔ قوس وقزح کی کیفیت نمایاں ہوئی۔ ریحان کو مزید کچھ سوچنے کا موقع میسر نہ آسکا۔ کمرے کا دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلا۔ اس نے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ تمام تر رعنائیوں کے ساتھ سامنے موجود تھی۔ اس کے چہرے پر خفیف مسکراہٹ کے تاثرات تھے۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔ ریحان نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ وہ شوخ لہجے میں بولی۔

''اتنی حیرت کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے تم نے کسی خطرناک سانپ کو دیکھ لیا ہو۔ کیا مجھے بیٹھنے کے لئے نہیں کہو گے؟''

ریحان ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بیٹھو...... لیکن تم یہاں کیوں آئی ہو؟ میری بیوی نے اگر تمہیں یہاں دیکھ لیا تب اچھا نہیں ہوگا۔ میں نے اسے بمشکل راضی کیا ہے۔''

فیمی طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''زن مرید...... تم نہیں بدل سکتے۔ کچھ تو مردانگی دکھاؤ۔ تمہاری جگہ اگر میں ہوتی۔ تب۔ اسے تین لفظوں میں اس کی اوقات یاد دلا دیتی طلاق...... طلاق...... طلاق۔'' ریحان نے غصیلی نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''تم کیوں میری زندگی کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ یہاں تمہاری دال نہیں گلنے والی...... جاؤ کہیں اور کوشش کر کے دیکھو۔''

فیمی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''محبت اور نفرت ایک دفعہ کی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چہرے کے تاثرات ہی کافی ہوتے ہیں۔ پھر بھی تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ میں تم سے ہی محبت کرتی ہوں۔ اور تم سے ہی نفرت بھی کرتی ہوں۔''

ریحان نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ فیمی کی جانب دیکھتے ہوئے تفہیمی لہجے میں پوچھا۔ ''محبت اور نفرت ایک ہی انسان سے کیونکر ہوسکتی ہے۔ میرے خیال میں تم پاگل خانے سے بھاگی ہوئی پاگل ہو۔ بہتری اسی میں ہے کہ واپس چلی جاؤ۔''

فیمی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تم سے بے اندازہ محبت کرتی ہوں اور نفرت صرف اس لئے کرتی ہوں کہ تم میری محبت ہونے کے باوجود بھی میرے نہیں ہو۔ بلکہ کسی اور کے ہو، احتیاط کرنا، میں اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لئے، کچھ بھی کرسکتی ہوں۔ کسی کو بھی اپنے راستے سے ہٹانا میرے لئے ناممکن نہیں ہے۔ میرے خیال میں موضوع تلخ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اسے بدل دینا چاہئے۔'' آخری الفاظ کے دوران اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اور وہ آنکھوں کو بند کرتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے پھر بولی۔

''مجھے کل رات کے لحات بھولے نہیں بھولتے۔ میں ایسے ہی مزید کچھ لحات کی خواست گار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ اگر تمہارے خیالات میرے جیسے ہیں۔ تو میں اپنے کمرے، میں آج کی رات تمہارا انتظار کروں گی۔ اور مجھے امید ہے کہ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ تم ضرور آؤ گے۔ اور اگر نہیں آئے تب مجھے بلانا پڑے گا۔'' اس دفعہ وہ سرد لہجے میں بولی اور کرسی سے اٹھ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر چلی گئی۔

دوپہر کھانے کے دوران خاموشی طاری رہی۔ آسمان کھل گیا تھا اور چمکیلی دھوپ کی بدولت ماحول نکھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن ریحان اور عینی کے دلوں کا ماحول اب بھی گھٹن زدہ تھا۔ وہ دلوں میں بہت کچھ چھپائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور کہنے کی ہمت دونوں میں نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بدظن ہوتے چلے جارہے تھے۔ لیکن منافقت کا لبادہ جسموں پر طاری کئے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد عینی نے قہوے کی پیالیاں میز پر رکھ کر انہیں لبالب قہوے کے ساتھ بھر دیا۔ ریحان بغور عینی کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں عام تاثرات کے علاوہ کوئی خاص بات موجود نہیں تھی۔ ریحان نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کھنکھارتے

ہوئے گلا صاف کیا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔

''اس کی واپسی میں میرے ارادوں کا عمل دخل موجود نہیں ہے۔ وہ خود واپس آئی ہے۔ انکار کرنا میرے اختیار میں اس لئے نہیں تھا کہ مالی حالات حد سے زیادہ تجاوز کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک گاہک کی ادائیگی بھی ہمارے مالی حالات کے لئے نہایت اہمیت اختیار رکھتی ہے۔ تمہاری ناراضگی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تمہیں اس کے متعلق صرف اس لئے بتائے دے رہا ہوں تاکہ بعد میں بدمزگی پیدا نہ ہو۔''

عینی جبراً مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ جو بھی کریں گے۔ دہقان نو اور میرے لئے بہتر ہی کریں گے۔ رہی اس لڑکی کی بات تو وہ ہمارے رشتے کے درمیان کسی بھی قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مجھے آپ کے کردار پر مکمل اعتماد ہے۔

ریحان کو شدید شرمندگی کا احساس ہوا۔ لیکن اس نے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور خاموشی کے ساتھ قہوے کی چسکیاں لینے لگا۔ کمرے میں دوبارہ گھمبیر خاموشی طاری ہوگئی۔ قہوے کے اختتام پر عینی نے برتن سمیٹے اور خاموشی کے ساتھ کچن کی جانب چلی گئی۔ چند لمحے کمرے میں بیٹھ کر فیمی کے متعلق سوچتے رہنے کے بعد ریحان بھی اٹھ کر پیٹرول پمپ میں آ بیٹھا۔ اس کے ہوش وحواس پر فیمی کا خوب صورت سراپا چھایا ہوا تھا۔ وہ رات کو کمرے سے فرار کے لئے بہانے کا انتخاب کر رہا تھا۔ لیکن اس کے دماغ میں ایسا کوئی بھی بہانہ نہیں آ رہا تھا۔ جسے استعمال کرکے وہ رات فیمی کے ہمراہ گزار سکتا۔ اس کی سوچ درمیان میں ہی رہ گئی۔

پیٹرول پمپ کے سامنے گاڑی آ کر رکی۔ اور مسز نور گاڑی سے برآمد ہوئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔ گاڑی سے اترنے کے بعد اس نے شیشے کے کمرے کے بجائے اوپر رہائشی کمروں کا رخ کیا۔ وہ عینی کی گہری سہیلی تھی۔ اور اکثر اوقات گاڑی ٹھیک کرانے کے بہانے گیراج کا رخ کرتی رہتی تھی۔ چند منٹ کے بعد شیشے کے کمرے کے باہر آہٹ پیدا ہوئی۔ اور مسز نور عینی کے ہمراہ شیشے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مسز نور نے ریحان کو سلام کیا۔ ریحان نے جواب دینے کے بعد آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب عینی بولی۔

''مسز نور کی گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ اور انہیں کل صبح ضروری کام سے قریبی شہر تک جانا ہے۔ آپ اگر ان کے ہمراہ گھر جا کر گاڑی کا کام کردیں تو ان کی مشکل حل ہوسکتی ہے۔ ریحان کے دماغ میں رات باہر گزارنے کی تدبیر جھماکے کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس نے فوراً ساتھ جانے کی حامی بھرلی۔ مسز نور اپنے ہمراہ ہمسائیوں کی گاڑی لائی تھی۔ ریحان نے اسے گھر جانے کی ہدایت کی۔ پھر اپنی جیپ میں اوزار رکھنے لگا۔

مسز نور نے چند لمحے عینی کے ساتھ بات چیت کی۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کی جانب چلی گئی۔ ریحان نے جیپ کو اسٹارٹ کیا اور مسز نور کے پیچھے ان کے گھر کی جانب چل دیا۔ ان کا گھر دہقان نو کی عمارت سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ریحان اور عینی اکثر اوقات ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ مسز نور کی پرانی ٹیوٹا کار گیراج میں کھڑی تھی۔ چند منٹ کے معائنے کے بعد ریحان کو معلوم ہوگیا کہ گاڑی میں زیادہ خرابی نہیں تھی۔ صرف انجن تک پیٹرول پہنچانے والی تار میں کچرا آ گیا تھا۔ اگر اسے نکال دیا جاتا تب گاڑی باآسانی اسٹارٹ ہوجاتی۔ گاڑی کا چند لمحے تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد ریحان سرکھجاتے ہوئے بولا۔

''گاڑی میں کام کچھ زیادہ ہے۔ اور میں مکمل اوزار بھی ہمراہ نہیں لایا ہوں۔ اگر کہتی ہیں تو گاڑی کو جیپ کے ساتھ ٹوچین کے ہمراہ گیراج تک لے جاتا ہوں۔ ٹھیک کرنے کے بعد واپس چھوڑ جاؤں گا۔''

مسز نور پریشان لہجے میں بولی۔ ''کیا یہ صبح تک ٹھیک ہوجائے گی۔ مجھے نہایت ضروری کام سے قریبی شہر تک جانا ہے۔ اس لئے گاڑی کا ہونا شدید ضروری ہے۔''

چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد ریحان ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''آپ کی پریشانی کی نوعیت کو میں باآسانی محسوس کرسکتا ہوں۔ یقیناً گاڑی صبح سے پہلے ٹھیک ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ میں رات گیراج میں ہی کام کرتا رہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔''

مسز نور پشیمان لہجے میں بولیں۔ ''تکلیف دہی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن اگر ایسا ہوجائے تو شاید ہی اس سے بہتر مزید کچھ ہوسکے۔'' ریحان نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں یہاں کام کرنے کے لئے بخوشی تیار ہوں۔ لیکن میری ایک درخواست ہے کہ آپ عینی کو فون کرکے کام کی نوعیت سے مطلع کرنے کے بعد یہاں رات گزارنے کے متعلق بھی بتادیں۔ اس کے علاوہ مجھے کام کے دوران تنگ نہ کیا جائے۔ میں مکمل یکسوئی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔ گاڑی میں کام کی نوعیت پریشان کن ہے۔'' مسز نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور ریحان اوزار لینے کے لئے دوبارہ دہقان نو کی جانب چل دیا۔ رات دس بجے تک ریحان نے مسز نور کے گیراج میں کام کیا۔ گاڑی کی مرمت کرنے کے بعد اس نے مسز نور کی گاڑی میں ہی دہقان نو کا رخ کیا۔

گاڑی کو دہقان نو کی عمارت کے پچھلے جانب موجود متروک شدہ شیڈ میں کھڑی کرنے کے بعد فہمی کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ اس کی منتظر تھی اور نہایت پرجوش دکھائی دیتی تھی۔ ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔ اور انگ انگ میں خوشی کا اظہار چھلکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی بانہیں ریحان کے گلے میں حمائل کردیں۔ رات نہایت تیزی کے ساتھ گزر گئی اور وقت کا پتا نہیں چلا۔

صبح جاگتے ہی عجلت کے عالم میں ریحان نے کپڑے زیب تن کئے۔ گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور باہر نکل کر گاڑی کی جانب چل دیا۔ گاڑی متروک شدہ شیڈ میں ویسے ہی کھڑی تھی۔ جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ اور مسز نور کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے ستے ہوئے چہرے پر سوچ کے تاثرات ثبت تھے۔ آج کا دن بہت سے فیصلوں پر مشتمل سنسنی خیز اور اذیت ناک دن کی حیثیت اختیار رکھتا تھا۔ مسز نور کے گھر میں گاڑی چھوڑنے کے بعد اس نے اپنی جیپ ہمراہ لی اور دوبارہ ہائی وے کی جانب چلا آیا۔ سوچوں کے سلسلے نے دوبارہ شدت اختیار کرلی۔ نہ ختم ہونے والے جھوٹوں کا سلسلہ مزید سے مزید تر طویل ہوتا چلا جارہا تھا۔ وہ جتنا بھی انہیں کم کرنا چاہتا تھا۔ اتنا ہی وہ بڑھتے چلے جارہے تھے۔ اس کی ازدواجی زندگی خطرناک حدوں کی جانب گامزن تھی۔ لیکن وہ اسے بچانے کے لئے کوئی محفوظ اقدام نہیں کرپارہا تھا۔

جیپ تاملی شہر کی جانب بھاگی چلی جارہی تھی۔ اب تو عینی کے ساتھ دوبارہ ملنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اسے تاملی شہر میں رہ کر مزید روزگار کی تلاش کرنی تھی۔ زندگی کو دوبارہ نئے سرے سے شروع کرنا تھا۔ وہ ایسا بخوبی کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھوں میں ہنر موجود تھا۔ سرمائے کی بدولت کچھ مشکلات ضرور درپیش آسکتی تھیں۔ لیکن وہ دوسروں کے گیراج میں کام کرکے ان مشکلات کا سامنا بخوبی کرسکتا تھا۔

جیپ تاملی شہر میں داخل ہوگئی۔ اس کی جیب میں بمشکل تمام پانچ سو روپے کی رقم موجود تھی۔ اس نے چھوٹے سے ہوٹل کے پاس جیپ کو روک کر ناشتہ کیا۔ پھر پانچ، چھ گھنٹے کی دوڑ دھوپ کرنے کے بعد جیپ کو مناسب رقم کے عوض فروخت کردیا۔ رقم کے بندوبست کے بعد اس نے سستے سے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر حاصل کیا۔ اور قریبی موجود کچہری کی عمارت کی جانب چل دیا۔

مختلف وکیلوں سے مشورہ کرنے کے بعد جو معلومات وہ اکٹھی کرسکا وہ یوں تھیں۔ عینی کو طلاق دینے کے لئے مناسب وجوہات کا ہونا بے حد ضروری تھا۔ بعد از وجوہات عینی اسے کورٹ میں طلب کرسکتی تھی۔ مقدمے بازی کا آغاز ہوتا۔ فضول وقت ضائع

ہوتا۔ اور رقم علیحدہ...... وکیل نے جب طلاق کی وجوہات طلب کیں۔ تب ریحان اپنی بغلیں جھانکنے لگا۔ ایسی کوئی بھی وجہ اس کے دماغ میں موجود نہیں تھی۔ جسے بتا کر وہ وکیل کو مطمئن کرسکتا۔ بالآخر کافی دیر خاموش رہ کر وہ سوچتے رہنے کے بعد اس نے کمال چالاکی کے ساتھ پینترا بدلا۔ اور کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

''میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایسا نہیں چاہتی ہے۔ بحالت مجبوری مجھے اسے طلاق دینی پڑ رہی ہے۔ ورنہ میں ایسا کبھی بھی نہیں کرتا۔''

وکیل مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ایسی صورت میں آپ کو طلاق دینے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہئے، آپ اسے علیحدہ گھر لے کر دے سکتے ہیں۔ اگر مالی حالات آڑے آتے ہیں تب آپ دونوں بیویوں کو ایک ہی گھر میں علیحدہ کمروں میں رکھ سکتے ہیں۔''

ریحان جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایسا ممکن نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے وجود سے نفرت کرتی ہیں۔ وہ اکٹھے رہنے کی طلب گار نہیں ہیں۔''

وکیل بولا۔ ''لیکن آپ کے کہنے کے مطابق دہقان نو کی عمارت پندرہ کمروں پر مشتمل ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ آپ دو عورتوں کو وسیع و عریض عمارت میں اکٹھا نہیں رکھ سکتے۔ معاف کیجئے گا لیکن عدالت میں ہم دونوں سے یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے۔ اس لئے آپ کو مجھے مطمئن کرنا ہی ہوگا۔''

ریحان طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے سچ بتائے دیتا ہوں۔ ویسے چھپانے کی کچھ خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ پچھلی دو سالہ ازدواجی زندگی کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے خاموش رہنے کی نہایت کوشش کی۔ اب کھل کر بتائے دیتا ہو کہ میرا اس سے دل بھر چکا ہے۔ ان مختصر ایام کے دوران وہ مجھے بچے جیسی نعمت سے ہمکنار نہ کرسکی۔ شاید اس وجہ سے بھی میں اس سے بدظن ہوچکا ہوں۔ جب بھی ہے میں اسے طلاق دے کر فیمی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وکیل نے اس دفعہ اثبات میں سر ہلا دیا اور مختار فارم پر کرنے لگا۔ تاکہ نوٹس عینی کو بھجوایا جاسکے۔

دوسری جانب، دو دن تک ریحان کا انتظار کرتے رہنے کے بعد جب عینی کو ریحان کی جانب سے طلاق کا نوٹس موصول ہوا۔ تب اسے اپنے سر پر آسمان ٹوٹتا دکھائی دیا۔ وہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لیکن کاغذات پر موجود دستخط کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ یقیناً وہ دستخط ریحان کے ہی تھے۔ اور وجوہات کے خانے میں ریحان نے اولاد نہ ہونے کی وجہ درج کی تھی۔ یہ سراسر جھوٹ پر مبنی وجہ تھی۔ عینی اچھی طرح جانتی تھی کہ ریحان کو بچوں کے وجود سے رتی برابر بھی دلچسپی نہیں تھی بلکہ عینی کو تھی۔ لیکن ریحان علاج و معالجے کے لحاظ سے بھی نہایت سستی برتتا تھا۔ بات کچھ اور بھی جسے عینی سے چھپایا جارہا تھا۔

عینی نے کافی غور و خوض کرنے کے بعد دہقان نو کی عمارت میں موجود جمع پونجی کو اکٹھا کیا اور عمارت کو تالا لگانے کے بعد عدنان کو چند دنوں کی چھٹی دی۔ پھر قریبی ہائی وے سے بس پکڑ کر تاملی شہر کی جانب چل دی۔ وہ ریحان سے روبرو بات چیت کرنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس ریحان کا ایڈریس موجود نہیں تھا۔ لیکن اس وکیل کا ضرور تھا۔ جس کے ذریعے ریحان نے نوٹس بھجوایا تھا۔

بس کا تمام سفر روتے ہوئے گزر گیا۔ دوپہر کے دو ڈھائی بجے جب وہ تاملی شہر کی مختصر کچہری میں داخل ہوئی۔ تب سورج بادلوں کے پیچھے سے نمودار ہو رہا تھا۔ وکیل تک پہنچنے میں اسے کسی بھی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی عینی نے کوئی بھی بات چیت کئے بغیر نوٹس کو اس کی میز پر رکھ دیا۔ وکیل نے تفہیمی نگاہوں کے ساتھ عینی کی جانب دیکھتے ہوئے، آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب عینی رو دینے والے لہجے میں بولی۔

''میں اپنے شوہر کی رہائش کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے آئی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کسی بھی قسم کی معلومات درکار نہیں ہیں۔''

وکیل نے نوٹس کے اوپر موجود ریحان کے نام کو پڑھتے ہوئے چند لمحات کی پس وپیش کے بعد اسے ریحان کے ہوٹل کے متعلق بتادیا۔

عینی نے کچہری کی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد ٹیکسی پکڑی اور ہوٹل کی جانب چل دی۔ ہوٹل کچہری کی عمارت سے زیادہ دور نہیں تھا۔ معلوماتی کاؤنٹر سے اسے باآسانی معلومات حاصل ہوگئیں کہ ریحان کمرہ نمبر پچیس میں رہائش پذیر ہے۔ اس نے اوپر نیچے ہوتے ہوئے سانس کو درست کیا۔ اور ایک جانب موجود ٹوائلٹ میں گھس کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔ چہرہ آنسوؤں کی برسات کی بدولت صدیوں کے بیمار کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ سفر کی دھول نے مزید نقش و نگار کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ٹھنڈے پانی نے جہاں اس کے چہرے کو تروتازگی بخشی۔ وہاں گم ہوتے ہوئے حواس کو بھی بحال کردیا۔ اب وہ اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ اور ریحان کے کمرے کی جانب چل دی۔ کمرہ نمبر پچیس کے دروازے پر ''تنگ مت کیجئے'' کی تختی لگی ہوئی تھی۔ عینی نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دے دی۔

''کون؟'' اسے ریحان کی آواز سنائی دی۔

لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ عینی نے جواب دیئے بغیر دوبارہ دستک دے دی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ وہ سامنے موجود تھا۔ بال بکھرے ہوئے، کپڑے چڑ مڑ اور چہرہ صدیوں کے مریض کی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ عینی کو سامنے کھڑے دیکھ کر اس نے دروازے کو بند کرنے کی کوشش کی۔ لیکن عینی پھرتی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگئی۔ ریحان غصے کے عالم میں چیختے ہوئے بولا۔

''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ واپس دہقان نو چلی جاؤ۔ میں فیمی کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں۔''

عینی درد بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں تمہیں شادی سے روکنے کے لئے یہاں نہیں آئی ہوں۔ میری آمد کا مقصد صرف اتنا ہے کہ تم سے معلوم کرسکوں کہ طلاق کی وجہ کیا ہے؟ نوٹس میں جو وجہ تحریر ہے۔ وہ جھوٹ کے علاوہ مزید کچھ نہیں ہے۔ میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی...... مجھے حقیقت بتادو۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔''

ریحان گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''حقیقت کے متعلق میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اگر بضد ہو تو دوبارہ بتائے دیتا ہوں۔ میں اور فیمی جلد از جلد شادی کرنے والے ہیں۔ وہ مجھ میں دلچسپی رکھتی تھی اور رکھتی ہے۔ تم اس بات سے بخوبی آگاہی رکھتی ہو۔ لیکن اس کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ میں جتنی جلدی ہوسکے تمہیں طلاق دے دوں۔ اسے کھونا میرے لئے ممکن نہیں ہے اور تمہیں طلاق دیئے بغیر اسے پانا اختیار سے باہر ہے۔ مجبوراً مجھے اس کی شرط کے آگے سر جھکانا ہی پڑا۔''

عینی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے ریحان سے اتنی سنگدلی کی امید نہیں تھی۔ لیکن وہ تو مرنے مارنے کے لئے آمادہ دکھائی دیتا تھا۔ عینی کو یوں تڑپ کر روتے ہوئے دیکھ کر ریحان کا چہرہ مختصر لمحے کے لئے تاریک ہوتا چلا گیا۔ لیکن پھر دوبارہ سپاٹ ہوگیا۔ وہ غراتے ہوئے بولا۔

''یہاں سے واپس چلی جاؤ۔ تمہاری دال یہاں نہیں گلنے والی۔ تم صرف اپنا وقت برباد کررہی ہو۔''

''کہاں چلی جاؤں......؟'' عینی ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے علاوہ میرا یہاں ہے ہی کون......؟ میں جدا ہونے پر مرجانے کو ترجیح دیتی ہوں۔''

ریحان بولا۔ ''اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ مہربانی کرکے واپس چلی جاؤ۔ ورنہ میں ہوٹل کے عملے کو یہاں بلانے پر مجبور ہوجاؤں گا۔ اس میں تمہاری بھی تذلیل ہوگی۔ اور میری بھی......'' آخری الفاظ کے اختتام پر ریحان نے عینی کو بازوؤں کے پاس سے تھاما۔ اور کھینچتے ہوئے اسے کمرے سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔

عینی بے اختیار اس کے جسم کے ساتھ لپٹ گئی۔

یہ بات ریحان کی توقع کے برخلاف تھی۔ اس نے عینی کو یکلخت چھوڑ دیا۔ اور گھبرا کر پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر کوئی بھی بات کیے بغیر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ عینی حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اسے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسے حواس درست کرنے میں چند لمحات کی دیر ہوئی۔ دروازے کے باہر سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ پھر کمرے کا دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ سامنے فیمی کھڑی تھی۔ اس کے ہمراہ ریحان بھی موجود تھا۔ عینی کی جانب استہزائیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ بولی۔

''تمہیں طلاق کا نوٹس مل چکا ہے۔ ابھی تک اس کے بہت سے قانونی معاملات پر عمل درآمد نہیں ہوپایا۔ اس لئے میں درگزر کررہی ہوں۔ لیکن آئندہ محتاط رہنا۔ میں برداشت نہیں کرپاؤں گی۔ نتائج کی ذمہ داری تم پر ہی عائد ہوگی۔ اگلے ہفتے ہم دونوں ملک سے باہر جارہے ہیں۔ ہنی مون منانے کے لئے...... کوشش کرنا جلد سے جلد طلاق کے مقدمے سے فراغت حاصل ہوجائے۔ اب یہاں سے دفع ہوجاؤ۔ ورنہ میں دھکے دے کر تمہیں باہر نکال دوں گی۔'' عینی نے ملتجیانہ نگاہوں سے ریحان کی جانب دیکھا۔ لیکن اس نے منہ دوسری جانب پھیرلیا۔

فیمی غراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ریحان کی جانب دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب میرا ہے۔ جو میں کہوں گی وہی کرے گا۔ تمہیں ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔'' آخری الفاظ کی ادائیگی کے فوراً بعد فیمی نے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ اور عینی کو کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

عینی کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنے شروع ہوگئے۔ اس نے لاچار نگاہوں کے ساتھ ایک دفعہ پھر ریحان کی جانب دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہاں اجنبیت کے علاوہ مزید کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ مجبوراً عینی کمرے سے باہر نکل آئی۔ اسے اپنے پیچھے دھماکے کے ساتھ دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بے جان قدموں کے ساتھ دروازے کے پاس زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کمرے کے دروازے کے علاوہ زندگی کا دروازہ بھی اس کے لئے بند کردیا گیا ہو۔ اندرونی کمرے سے اسے فیمی کے قہقہہ لگا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ریحان غصیلے لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ عینی نے بے اختیار دروازے کے ساتھ کان لگادیئے۔ اسے ریحان کی آواز سنائی دی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''اچھی طرح خوش ہولو۔ آج کے بعد تمہیں مزید خوش ہونے کا موقع میسر نہیں آسکے گا۔ میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔''

فیمی کی آواز سنائی دی۔ ''مجھے مارنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں روپ بدلنے والی ناگن ہوں۔ مجبور انسان نہیں ہوں۔ جسے گولی مار کر ہلاک کیا جاسکے۔ میری طرح اب تمہاری زندگی بھی تباہ ہوچکی ہے۔ تم چاہتے ہوئے بھی اپنی تنہائیوں کا خاتمہ نہیں کرسکو گے۔ یہی میرا پیغام ہے۔ تم سے اور تمہاری بیوی سے......''

کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔

عینی نے بے اختیار کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ ریحان نے دروازہ کھول دیا۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ فیمی جاچکی تھی۔ ریحان نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ عینی کی جانب دیکھتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''تم دوبارہ کیوں یہاں آئی ہو۔ ہمارا ساتھ ٹوٹ چکا ہے۔ اور اب دوبارہ جڑنا ممکن نہیں ہے۔'' عینی بولی۔

''میں تمہاری اور فیمی کی بات چیت سن چکی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس معاملے میں تم بے قصور ہو۔ میں معاملے کے متعلق تفصیلاً جاننا چاہتی ہوں۔ دو سال کی رفاقت کے بعد اتنا تو میرا حق بنتا ہی ہے کہ میں طلاق کی وجہ دریافت کرسکوں۔''

ریحان نے طویل سانس لیتے ہوئے اسے کمرے میں آنے کے لئے کہا۔ اور خود سامنے لگے ہوئے بیڈ پر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ عینی نے کمرے کا دروازہ بند کردیا۔ پھر آگے بڑھ کر ریحان کے بالوں میں ہاتھ

پھیرنے کی کوشش کی۔ تب وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوگیا۔ اور زخم خوردہ لہجے میں بولا۔

''مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کرنا۔ میرا جسم زہر سے بھر چکا ہے۔ تمہیں طلاق دینے کی وجہ یہی ہے۔ میں اب کسی بھی انسان کے ہمراہ زندگی گزارنے کے لائق نہیں رہا ہوں۔ میری کوشش یہی ہے کہ جلد از جلد ہمارے درمیان طلاق ہوجائے۔ اس کے بعد میں لوگوں کے جم غفیر کو چھوڑ کر یہاں سے کہیں دور ویرانے کی جانب چلا جاؤں گا۔''

عینی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے محبت کے عالم میں بولی۔ ''جیسے دھقان نو...... تمہارے پوشیدہ رہنے کے لئے وہ ویرانہ مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ لیکن مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی ہے کہ تم حالات کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے فرار کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ غور فکر کیوں کررہے ہو۔ ہم دونوں مل کر حالات کو اپنے موافق کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارا خدا ہمارا ساتھ دے گا۔''

ریحان جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا تم روپ بدلنے والی ناگن کا مقابلہ کرسکتی ہو؟ کیا تم میرے جسم میں خون کے ساتھ دوڑتے ہوئے زہر کو جسم سے باہر نکال سکتی ہو۔ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میرے زہر آلود جسم کی بدولت تمہیں رتی برابر بھی نقصان اٹھانا پڑے۔''

عینی طنزیہ انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر زخمی لہجے میں بولی۔ ''اگر تم مجھے اپنے ہاتھوں سے گلا دبا کر مار ڈالو گے۔ تب شاید مجھے افسوس محسوس نہیں ہو پائے گا۔ لیکن طلاق دینے کی اذیت اس سے کم نہیں کہ تم مجھے زدو کوب بھی کرو۔ اور اذیت سے چھٹکارا پانے کے لئے مرنے بھی نہ دو۔ مجھے تمہاری محبت کی نوعیت سمجھ نہیں آرہی۔ میاں بیوی مل جل کر ہر مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن تم نے بجائے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے اپنے ساتھ میری زندگی کو بھی مسئلوں کا پہاڑ بنا ڈالا ہے۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے واسطے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ اسے اپنے اوپر سوار مت کرو۔''

''کیسے سوار نہ کروں۔'' ریحان جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں۔ لیکن تمہاری زندگی پر آنچ برداشت نہیں کرسکتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے ہمراہ رہوں گا۔ تب تمہارے وجود کو چھونے کے لئے مجبور ہوں گا۔ اور اگر ایک دفعہ میں نے تمہیں چھولیا۔ تب دوبارہ تمہیں حاصل نہیں کر پاؤں گا۔ تم میری زندگی سے دور چلی جاؤ گی۔''

عینی بولی۔ ''میں تمہاری دلی کیفیت کے بارے میں بخوبی اندازہ لگا سکتی ہوں۔ تمہارے خیال کے مطابق مجھے چھوتے ہی میری زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ تو ٹھیک ہے۔ پھر بھلا ہمیں علیحدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم یقین جانو۔ جب تک مسئلہ حل نہیں ہوجاتا۔ میں کوشش کروں گی کہ تمہارے جسم کے ساتھ میرا جسم مس بھی نہیں ہونے پائے۔''

ریحان کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں نمودار ہونے لگیں۔ عینی کی بات میں وزن تھا۔ ایک دوسرے کو چھوئے بغیر زہر اپنا اثر نہیں دکھا سکتا تھا۔ تب پھر بھلا طلاق کی کیا ضرورت تھی۔ بات صرف احتیاط کی حد تک تھی۔ اور اس احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے فیمی کے چہرے پر بھرپور طمانچہ بھی لگایا جاسکتا تھا۔

ریحان نے طویل سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اور عینی کو بتایا کہ ''فیمی روپ بدلنے والی وہ ناگن ہے، جس کے ناگ کو ریحان کے باپ نے نادانستگی میں مار ڈالا تھا۔ فیمی کے سو سال انسانوں سے پوشیدہ رہنے میں چند سال بقایا تھے۔ اس نے ریحان کے باپ کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر اپنا زہر ان کے جسم میں داخل کردیا۔ یوں ان کی موت واقع ہوگئی۔ لیکن روپ بدلنے والی ناگن کے دل میں ٹھنڈ نہ پڑسکی۔ اور اس نے سو سال مکمل ہونے کے بعد دوبارہ دھقان نو کی عمارت کا رخ کیا۔ اپنی خوب صورتی کے ذریعے ریحان کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے بعد مختصر ملاقاتوں کے

دوران اپنا زہر اس کے جسم کے اندر شامل کردیا تا کہ ریحان اپنی بیوی کے ہمراہ مطمئن زندگی نہ گزار پائے۔ یہی اس کا انتقام تھا کہ جس طرح وہ اپنے ناگ کی جدائی میں تڑپتی رہی ہے۔ اسی طرح ریحان اور عینی بھی ملن کی آس میں تڑپتے رہیں۔“

بہر حال عینی نے ریحان کو یقین دلایا کہ وہ مکمل احتیاط کرے گی کہ ان دونوں کے درمیان محتاط دوری ہمیشہ قائم رہے۔ ریحان نے مطمئن انداز میں سر کو اثبات میں ہلایا اور دونوں ہوٹل سے نکل کر دہقان نو واپس چلے آئے۔

رات کا کھانا دونوں نے الگ بیٹھ کر کھایا۔ اور ایسا ان کی ازدواجی زندگی میں پہلی دفعہ ہوا۔ عینی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ لیکن وہ ریحان کے ساتھ مطمئن تھی۔ طلاق کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اکٹھے بیٹھ کر کھانا نہ کھانا وقتی مسئلہ تھا۔ لیکن تھوڑی سی کوشش کی بدولت مسئلے کو حل کیا جا سکتا تھا۔

باہر گرج چمک کے ساتھ بارش کا آغاز ہو گیا تھا۔ دونوں نے کھانا مکمل خاموشی کے ساتھ تناول کیا۔ پھر عینی قہوہ بنانے کے لئے کچن کی جانب چلی گئی۔ کمرے میں ریحان تنہا رہ گیا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھا گہری سوچوں میں گم تھا۔ اس کی سوچوں کا محور عینی کا دلفریب وجود تھا۔ کیا وہ ہمیشہ کے لئے عینی سے دور رہ سکتا تھا۔ جان بوجھ کر نا سہی...... اس سے غلطی بھی تو ہو سکتی تھی۔ یہ غلطی عینی کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔

کمرے میں سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ ریحان نے چونک کر سامنے کی جانب دیکھا۔ عینی کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور فیمی سامنے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر براجمان تھی۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ نگاہوں کا مرکز ریحان کا وجود تھا۔ اس نے عینی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ دہقان نو میں کیا کرتی پھر رہی ہے۔ تمہارا وجود اس کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

ریحان زہر خند لہجے میں بولا۔ ”تم ہار چکی ہو فیمی...... ہمیں جدا کرنا تمہارے اختیار میں نہیں۔ ہم جب تک زندہ ہیں ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ رہی زہر کی بات...... تو یہ زہر بھی ہماری جدائی کا باعث نہیں بن سکتا۔ ہم تمہارے سامنے ہیں۔ اگر جدا کر سکتی ہو تو کر کے دکھا دو۔“

فیمی پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”جدا تو میں کر چکی ہوں۔ تمہارا کھانا پینا علیحدہ ہو چکا ہے۔ ایک بستر پر اکھٹے سونا تمہارے اختیار میں نہیں رہا۔ اس سے زیادہ میری جیت بھلا اور کیا ہوگی۔ مجھے مزید کچھ نہیں چاہئے۔“

ریحان مسکراتے ہوئے بولا۔ ”عینی میرے ہمراہ ہے۔ تب مجھے تمہاری رتی برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ ہم مل جل کر موجودہ مسئلے کا حل جلد از جلد تلاش کر لیں گے۔ تمہاری موجودہ سازش کا شیرازہ تقریباً بکھر چکا ہے۔ باقی ماندہ کا بھی قلع قمع عنقریب ہونے والا ہے۔“

فیمی نے غضبیلی نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ پھر زمین پر گر کر لوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ چند منٹ بعد وہ سانپ کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس کا چمکیلا وجود زمین پر پھرتی کے ساتھ رینگتا ہوا دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ پھر دروازے کے نیچے موجود درز میں داخل ہونے کے بعد غائب ہو گیا۔ ریحان نے سکون بھرا سانس لینے کے بعد ایک جانب کھڑی ہوئی ہکا بکا عینی کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت کی شدت کی بدولت تقریباً پھٹنے والی تھیں۔ فیمی کے باہر نکلنے کے بعد وہ بولی۔

”مجھے اس ناگن کے تیور ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ ہمیں کل سے ہی اپنی جدوجہد کا آغاز کر دینا ہوگا۔“

ریحان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ ہم جدوجہد کا آغاز کہاں

سے کریں، معاملہ انتہائی گھمبیر ہے۔"

عینی بولی۔ "جسم میں زہر کا پھیلنا اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ تمہارے جسم میں موجود خون میں زہر سرایت کر چکا ہے۔ زمانہ ترقی کی جانب گامزن ہے۔ سائنس کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ انسان چاند پر جا پہنچا ہے۔ تو پھر خون میں موجود زہر کی نکاسی کیوں نہیں۔ مجھے اچھی طرح ایسے بہت سے کیسز یاد ہیں جن میں، انسان کے خون سے فاسد مادوں کو نکالنے کے بعد خون واپس جسم میں شامل کر دیا گیا۔ گردوں کے امراض میں ایسا عموماً ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔ ایک دفعہ تمہارے مسئلے کا کوئی مثبت حل نکل آیا۔ تب یہ ناگن ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں پائے گی۔"

ریحان نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہاری بات میں وزن ہے۔ ہمیں کسی ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کرنا ہوگا۔ صبح شہر جا کر ڈاکٹر کو تلاش کریں گے۔ تم جمع پونجی کا جائزہ لو۔ علاج کے لئے ہمیں اچھی خاصی رقم کی ضرورت پڑے گی۔"

عینی نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر پریشان لہجے میں بولی۔ "رقم کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم دہقان نو کی عمارت کو فروخت کر کے با آسانی بندوبست کر سکتے ہیں۔ مجھے تو پریشانی اس بات کی محسوس ہو رہی ہے کہ وہ ناگن ہمارے رہائشی کمرے میں گھستی چلی آتی ہے۔ اور ہمیں خبر بھی نہیں ہو پاتی۔ اگر اس نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ تب ہم اپنے بچاؤ کے لئے کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔"

ریحان بولا۔ "میں جانتا ہوں۔ وہ ایسا ہی کرے گی۔ لیکن حفاظتی تدابیر سے لاعلم میں بھی نہیں ہوں۔ سانپ چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کے ذریعے کمرے میں داخل ہو سکتا ہے۔ اگر کمرے میں سوراخ ہی نہ ہو۔ تب وہ لاکھ جتن کرنے کے باوجود بھی ہم تک نہیں پہنچ پائے گی۔"

عینی بولی۔ "یعنی ہمیں اپنے کمرے کو کیموفلاج کرنا ہوگا۔ کیا ایسے ممکن ہو سکتا ہے؟"

ریحان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "بے شک ایسا ممکن ہے۔ تم پیٹرول پمپ کے ساتھ بنے ہوئے کمرے کو نظر انداز کر رہی ہو۔"

عینی پرجوش لہجے میں بولی۔ "واقعی میں نے اسے بھلا دیا تھا۔ وہ تو ہماری بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

ریحان بولا۔ "تو پھر آؤ۔ اگلے چند دن ہمیں وہیں گزارنے ہوں گے۔ اس لئے انتظام بھی مکمل کرنا ہوگا۔ بستر وہاں منتقل کرنے کے علاوہ ہمیں کچن کا مخصوص سامان بھی وہاں ترتیب دینا ہوگا۔ یہ بھی اچھا ہے کہ وہاں ٹائلٹ، اور باتھ روم کی سہولت موجود ہے۔ ہمیں پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی۔" عینی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور دونوں تن دہی کے ساتھ کام میں مگن ہو گئے۔

وہ رات دونوں نے شیشے سے بنے ہوئے کمرے میں گزاری۔ صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ریحان اور عینی نے لانگ شوز پہنے۔ یہ جوتے ان کے گھٹنوں تک پہنچ کر ختم ہوتے تھے۔ انہوں نے تمام جمع پونجی بمعہ جیپ والی رقم کے اپنی جیبوں میں منتقل کی۔ اور دہقان نو سے کچھ دور موجود ہائی وے کے قریب موجود بس اسٹینڈ کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ بس نے انہیں مختصر سفر کے بعد تاملی شہر پہنچایا۔ یہاں بہت سے ڈاکٹروں کے ساتھ ان کی جان پہچان پائی جاتی تھی۔ ان میں زیادہ تر ڈاکٹر ریحان کے والد کے دوست تھے۔ ان میں ایک ڈاکٹر کا تعلق کینسر کے مرض سے تھا۔

ڈاکٹر کا نام ابن خالدی تھا۔ ریحان نے اسے تفصیل کے ساتھ اپنے موجودہ مسئلے کے متعلق انفارم کیا۔ وہ حیرت بھرے انداز میں بات چیت سنتا رہا۔ پھر سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"یقیناً ایسا ہو سکتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد

ہے۔ تمہارے والد محترم سلمان صاحب جب زہروں پر ریسرچ کررہے تھے۔ تب ایک دفعہ ان سے ملاقات کے دوران انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس کچھ ایسے زہر موجود ہیں۔ جو انسان کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاسکتے۔ لیکن اگر ان کی مخصوص خوراک روزانہ جسم میں داخل کردی جائے۔ تب انسان کے جسم میں موجود تمام خون زہر آلود ہوسکتا ہے اور ایسی صورت میں انسان انسانوں کی آبادی سے دور جانے کو ترجیح دیتا ہے۔''

عینی بولی۔ ''خالدی صاحب...... کیا ایسا ہونا ممکن ہے کہ جسم میں موجود خون میں سے اس زہر کو علیحدہ کرلیا جائے۔ ایسی صورت میں ریحان کے عضلات پر غلط اثرات تو مرتب نہیں ہوں گے۔ کیا وہ دوبارہ انسانوں کے درمیان میں رہنے کے قابل ہوجائے گا۔''

ڈاکٹر خالدی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بیشک ایسا ہوتا ہے، یہ کوئی جادو ٹونے کا کھیل نہیں ہے۔ معاملہ سانپوں کا ہے۔ سانپ صرف اپنے زہر کو استعمال کرتا ہے۔ وہ بھی ایسی صورت میں جب وہ انسان کے قریب پہنچنے کی کوشش کرے۔ بصورت دیگر وہ انسانوں کے لئے مضر ثابت نہیں ہوسکتا۔ قریب پہنچنے کے بعد وہ اپنا زہر انسان کے جسم میں سرایت کردیتا ہے۔ یہی زہر انسان کی موت کا سبب بنتا ہے۔ ریحان کے کیس میں ایسا ہی ہوا ہوگا۔ مختصر مقدار میں زہر اس کے جسم میں داخل کردیا گیا۔ اگر جلد از جلد اس زہر کو ختم کردیا جائے۔ تب ریحان دوبارہ صحت یاب ہوسکتا ہے۔ ورنہ کچھ عرصے کے بعد اس کی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔''

عینی نے پریشان نگاہوں کے ساتھ ڈاکٹر خالدی کی جانب دیکھا۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ ڈاکٹر خالدی دلاسہ دینے والے لہجے میں بولے۔

''میرے اندازے کے مطابق ابھی تک دیر نہیں ہوئی۔ اس لئے رونے دھونے سے بہتر ہے کہ علاج پر توجہ دی جائے۔ ہمیں سب سے پہلے ریحان کا خون ٹیسٹ کروانا ہوگا تاکہ معلوم ہوسکے کہ زہر کی کتنی مقدار جسم میں ہے......'' عینی نے اثبات میں سر ہلادیا اور ڈاکٹر خالدی دونوں کے ہمراہ ہی بنی ہوئی لیبارٹری کی جانب چل دیئے۔

ریحان کا خون نکالا گیا۔ بعدازاں اسے ٹیسٹ کیا گیا۔ کم وبیش آدھے گھنٹے کے بعد رپورٹ خالدی صاحب کے سامنے موجود تھی۔ اس نے رپورٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے ریحان اور عینی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''خطرے کی بات نہیں ہے۔ خون میں زہر کی مقدار موجود ہے۔ لیکن موت واقع ہونے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ خون کی صفائی ممکن ہے۔ ہم جلد از جلد علاج کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس دوران تم دونوں کو اسپتال میں ہی رہنا ہوگا۔'' ریحان نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنا سامان لینے دہقان نو کی جانب چل دیا۔ عینی اسپتال میں ہی رک گئی۔

دوسرے دن ریحان کے خون کے مزید ٹیسٹ کروائے گئے۔ شوگر لیول چیک کیا گیا۔ بلڈ پریشر کی رپورٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے شیشے کے کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ شیشے کے کمرے کا انتخاب اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی کیا گیا تھا کہ ریحان اور عینی کو فیمی کے زہریلے وجود کی جانب سے خطرہ لاحق تھا۔ وہ انہیں نقصان پہنچاسکتی تھی۔

بہرحال شیشے کے کمرے میں سکون تھا۔ تیسرے دن ریحان کو بے ہوش کرنے کے بعد مختلف نالیاں اس کے جسم میں داخل کی گئیں۔ جن کے ذریعے زہر آلود خون کو باہر نکالا جانے لگا۔ یہ خون نالیوں کے ذریعے ایک ایسی مشین میں داخل ہوتا جاتا تھا۔ جس کا کام خون میں سے فاسد مادوں کو باہر نکالنے کے بعد دوبارہ نالیوں کے ذریعے آگے منتقل کرنا تھا۔ مشین کے دوسری جانب موجود یہ نالیں صاف خون کو دوبارہ جسم میں منتقل

کر دیتی تھیں۔

عینی شیشے کے کمرے کے باہر بیٹھی خشوع خضوع کے عالم میں خدا سے اپنے شوہر کی صحت یابی کے لئے دعا مانگ رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد خون کی صفائی کا مرحلہ مکمل ہوگیا۔ اور ڈاکٹر خالدی نے اسے علاج مکمل ہونے کی خوشخبری سنادی۔ ریحان بے ہوشی کے عالم میں شیشے کے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ چند لمحات کے بعد اسے ہوش آ گیا۔

ڈاکٹر خالدی کے کہنے کے مطابق ابھی تک اس کا گھر واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ مختلف قسم کے انجکشن اسے لگائے جا رہے تھے۔ ان احتیاطی ادویات کے بعد ریحان کا خون دوبارہ ٹیسٹ کیا جانا تھا۔ رپورٹ کے اوکے ہونے کے بعد اسے چھٹی مل سکتی تھی۔

عینی نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ پھر خدا کے حضور جھکتے ہوئے اس کا شکر ادا کیا۔

دوسرے دن ریحان کے خون کی مثبت رپورٹ آ گئی۔ تب ڈاکٹر خالدی نے عینی کو مبارکباد دیتے ہوئے ریحان کو ہمراہ لے جانے کی اجازت دے دی۔ ریحان اور عینی دہقان نو واپس چلے آئے۔ ان کی جمع پونجی تمام کی تمام ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن دہقان نو کی عمارت بکنے سے بچ گئی تھی۔ یہ بھی ڈاکٹر خالدی کی مہربانی تھی۔ انہوں نے تمام اخراجات ڈاکٹروں کے فنڈ کے ذریعے برداشت کئے تھے۔ ورنہ ریحان اور عینی کو باقی کی زندگی فٹ پاتھ پر بسر کرنی پڑتی۔

بہر حال خطرہ تو اب بھی سر پر منڈلا رہا تھا۔ فیمی کی صورت میں...... وہ زندہ تھی اور اس کی زندگی ریحان اور عینی کی زندگیوں کے لئے خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ فیمی نے دہقان نو کا رخ نہیں کیا۔ لیکن ریحان کو اس کا انتظار تھا۔ وہ اس کے استقبال کے لئے مختصر تیاریاں کئے ہوئے تھا۔ شیشے کے کمرے کو ہر قسم کے سامان سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ وہاں اب سوائے ریحان اور عینی کے بستروں کے علاوہ مزید کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ موسم کے تیور بدلنے لگے تھے۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ عدنان دوبارہ کام پر آنے لگا تھا۔ لیکن ریحان کو اب کام میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اسے فیمی کا انتظار تھا۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔

ایک صبح جب ریحان نے کمرے سے باہر نکل کر پیٹرول پمپ کا رخ کیا۔ تب فیمی کو پیٹرول پمپ کی ٹینکی کے پاس اپنا منتظر پایا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور وہ نہایت ہیجان خیز لباس زیب تن کئے ہوئے تھی۔ ریحان کو سامنے کھڑا دیکھ کر وہ تحیر آمیز لہجے میں بولی۔

''نئی زندگی مبارک ہو۔ لیکن میں ہارنے والی نہیں ہوں۔ یہ تو شروعات تھی۔ آگے بہت کچھ ابھی باقی ہے۔ جس سے بچنا تمہارے لئے ممکن نہیں ہوگا۔''

ریحان طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''فیمی میری اور تمہاری دشمنی صرف اتنی سی ہے کہ میں اس باپ کا بیٹا ہوں جس نے تمہارے ناگ کو انجانے میں قتل کر دیا۔ اس کے علاوہ مزید کوئی بھی بات ایسی ہمارے درمیان موجود نہیں جو دشمنی کا سبب بن سکے۔ تو پھر ہم اپنی زندگیوں کو کیوں تباہ کریں۔ میں اپنے باپ کی جانب سے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اس دشمنی کو ختم کردو۔ اور اچھے دوستوں کی طرح نئی زندگی کا آغاز کرو۔'' اسے اپنے پیچھے شیشے کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی۔ ریحان جانتا تھا کہ وہ عینی ہی ہوسکتی تھی۔ اس لئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ فیمی استہزائیہ لہجے میں بولی۔

''میں دوستی کرنے نہیں آئی ہوں۔ میرا مقصد اپنے ناگ کا بدلہ لینا ہے۔ اگر اس مقصد کی تکمیل کے دوران مجھے اپنی جان بھی گنوانا پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گی۔'' عینی کمرے سے باہر نکلنے کے بعد ریحان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ریحان نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد فیمی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ تم جسے چاہو ختم کرسکتی ہو، ہم انکاری نہیں ہوں گے۔''

فیمی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''اگر میں ایسا چاہتی تو کب کی کر چکی ہوتی۔ مجھے تم دونوں کی موت نہیں چاہئے۔ میرا انتقام تم دونوں کی دوری میں پوشیدہ ہے۔ میں تمہیں علیحدہ کرنا چاہتی ہوں۔ جیسے میں اپنے ناگ سے علیحدہ ہوکر تڑپ رہی ہوں۔ اس طرح میں تم دونوں کو بھی تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔''

ریحان طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ ہمیں علیحدہ علیحدہ کرکے دکھاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری محبت ہمارا عزم تمہارے مقصد میں رکاوٹ بن کر دکھائے گا۔ جو بھی کرنا ہے کر ڈالو...... سوچو نہیں۔ ہم تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔''

فیمی نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ ریحان کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر مشکوک پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ ریحان کا موجودہ رویہ اس کی عقل وفہم سے مبرا تھا۔ وہ تو لڑنے مرنے کی نیت سے آئی تھی۔ لیکن یہاں تو معاملہ کچھ اور تھا۔ اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے خیالات کو منتشر کیا۔ پھر تنقیدی نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد بولی۔

''میں تمہیں اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی ہوں۔ یہاں سے بہت دور سانپوں کی دنیا میں...... جہاں سے تم واپس آنا بھی چاہو تب بھی واپس نہیں آسکو گے۔ اگر تم نے انکار کیا۔ تب مجھے مجبوراً تمہاری بیوی کو ختم کرنا ہوگا۔ اور میں ایسا بخوبی کرسکتی ہوں۔ میرے جسم میں موجود زہر کو روکنا تمہارے ان لانگ شوز یا پھر حفاظتی تدابیر کے اختیار سے باہر ہے۔ میں سب کچھ کرسکتی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' ریحان بولا۔ ''تم سب کچھ کرسکتی ہو۔ لیکن میں عینی سے چند لمحات کی ملاقات مکمل تنہائی میں کرنا چاہتا ہوں۔ شیشے کے اس کمرے میں......'' اس نے اپنے آفس کی جانب اشارہ کیا۔ فیمی طنزیہ لہجے میں بولی۔

''یعنی آخری ملاقات...... پیار محبت...... عہد و پیمان...... شاید تم کچھ نصیحتیں بھی کرنا چاہتے ہوگے۔ اچھی طرح کرلو۔ آج کے بعد شاید تمہیں دوبارہ موقع نہ مل سکے۔'' ریحان نے اثبات میں سر ہلایا اور عینی کا ہاتھ تھام کر شیشے کے کمرے میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا۔ فیمی بغوران دونوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ شیشے کی دیواروں سے سب کچھ باآسانی دیکھ سکتی تھی۔

کمرے کا دروازہ بند کرنے کے فوراً بعد ریحان نے عینی کو بانہوں میں بھرتے ہوئے اس کے ہونٹوں کا طویل بوسہ لیا۔ فیمی کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرنے لگے۔ ریحان ایسا ہی کچھ چاہتا تھا۔ اس نے عینی کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''میں ناگن کی قبر تیار کرنا چاہتا ہوں، تم ایسا کرنے کے لئے ہوشیار رہنا۔ بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ انجانے میں گھبرا کر کچھ غلط نہ کربیٹھنا۔'' فیمی غصیلی نگاہوں کے ساتھ دونوں کی جانب دیکھ رہی تھی۔

سائیکل کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ عدنان پیٹرول پمپ کی عمارت میں داخل ہوا۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ فیمی کی جانب دیکھتے ہوئے سائیکل کا رخ دہقان نو کی عمارت کی جانب کردیا۔ فیمی نے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں آگے بڑھ کر شیشے کے دروازے پر دستک دی۔ ریحان نے عینی کو باآہستگی سے جسم کے ساتھ سے علیحدہ کیا۔ پھر آگے بڑھ کر جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ فیمی تیر کی مانند کمرے میں داخل ہوئی۔ اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہاں کیا کررہے ہو۔ میں سازش کی بو محسوس کررہی ہوں۔'' وہ کمرے میں آگے تک گھستی چلی آئی۔ اس نے تنقیدی نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ کمرہ ہر قسم کے فرنیچر سے مبرا تھا۔ دیواروں پر پردے لگے ہوئے تھے۔ انہیں ایک جانب ہٹا کر دیواروں سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔ کمرے کے درمیان میں بستر لگا ہوا تھا۔ جس پر کمبل اور تکیے موجود

تھے۔ وہ بغور جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ ریحان نے اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عینی کو بازوؤں کے پاس سے تھاما اور پھرتی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل کر اس نے کمرے کا دروازہ جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا پھر چلاتے ہوئے بولا۔

''میں نے اسے قید کر دیا ہے۔ وہ لاکھ سر پٹختی رہے۔ شیشے کی دیوار کو توڑ نہیں سکتی ہے۔''

عینی ہراساں لہجے میں بولی۔ ''لیکن اسے ختم کئے بغیر ہمیں اس کے شر سے نجات نہیں مل سکتی۔''

ریحان نے جواب دیئے بغیر ایک جانب موجود پیٹرول پمپ کی ٹینکی پر لگا ہوا پائپ اٹھایا۔ اور پیٹرول کی بوچھاڑ کمرے کی دیواروں کے اوپر کرنے لگا۔ عدنان ایک جانب کھڑا حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ ریحان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شیشے کی دوسری جانب فیمی سانپ کا روپ دھارنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔

ریحان نے عدنان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''دہقان نو کی عمارت میں موجود تمام لکڑی کا سامان شیشے کے کمرے کی دیواروں کے ساتھ رکھنا ہوگا۔ عجلت کی ضرورت نہیں ہے۔ اطمینان کے ساتھ کام کرنا ہے۔ ناگن کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔'' عدنان نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور دہقان نو کے تینوں افراد مکمل تن دہی کے ساتھ کام میں جت گئے۔

انہیں کام مکمل کرنے میں آدھا گھنٹہ سے زیادہ کا وقت لگا۔ آسمان مکمل طور پر صاف تھا۔ اس مناسبت سے دن نہایت چمکدار اور موسم خوشگوار تھا۔ فیمی سانپ کی صورت اختیار کرنے کے بعد شیشے کی دیواروں سے سر ٹکراتی پھر رہی تھی۔ لیکن کمرے سے باہر نکلنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ شیشے کے کمرے کی دیواریں چاروں جانب سے لکڑی کے فرنیچر سے مکمل طور پر چھپ گئیں۔ ریحان نے دوبارہ پیٹرول پمپ کے پائپ کو تھاما اور فرنیچر پر پیٹرول چھڑکنے لگا۔

عینی بولی۔ ''تم کیا کرنے والے ہو؟ ایسے تو دہقان نو کی عمارت کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔'' ریحان جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تمہیں عمارت عزیز ہے یا پھر شوہر کی زندگی......''

عینی چپ ہوگئی۔

ریحان دلاسہ دینے والے لہجے میں بولا۔ ''عمارت دوبارہ بھی بن سکتی ہے۔ لیکن ہاتھ میں آئی ہوئی ناگن دوبارہ ہتھے نہیں چڑھ پائے گی۔ اس لئے موقع کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہئے۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس کو باہر نکالا اور تیلی جلا کر پیٹرول سے بھیگے ہوئے فرنیچر کی جانب اچھال دی۔ بھک کی آواز کے ساتھ فرنیچر نے آگ پکڑ لی۔ ماحول یکلخت روشن ہوا۔ حدت کی بدولت آگ کے قریب کھڑے ہونا دشوار محسوس ہونے لگا۔

ریحان نے عینی اور عدنان کا ہاتھ تھاما اور انہیں کھینچتے ہوئے آگ سے دور لے گیا۔ آگ نے کمرے کا محاصرہ کر لیا تھا۔ شعلوں کی بدولت کمرہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔ اور انہیں یہ جاننے میں دشواری پیش آرہی تھی کہ اس حال میں کمرے کے اندر مقید ناگن پر کیا بیت رہی تھی۔ پھر انہیں شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً بعد ماحول فیمی کی دردناک چیخوں سے گونجنے لگا۔

عینی نے بے اختیار اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور ریحان کے ساتھ لپٹ کر کھڑی ہوگئی اور عدنان ہراساں نگاہوں کے ساتھ آگ کے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ ریحان نے عدنان اور عینی کو ہاتھوں کے پاس سے تھاما۔ اور مطمئن قدموں کے ساتھ دہقان نو کی عمارت کے باہر کی جانب چل دیا۔ آگ بجھنے کے بعد اسے دہقان نو کی عمارت کے نقصان کا تخمینہ بھی لگانا تھا۔ تاکہ بعد میں عمارت کی زمین کو فروخت کیا جاسکے۔

☠

شک

شائستہ سحر۔راولپنڈی

اچانک ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ اندھیری رات میں ایک تخت پر ایک نوجوان بیٹھا تھا اور اس کے سامنے ایک عورت گریہ وزاری کررہی تھی، وہ دو روحیں تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک منظر نے لوگوں کو دہلا کر رکھ دیا

کسی کے دماغ میں اپنی بات ڈالنا مشکل ہی نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے

رشیداں چند روز قبل ہی چوہدری فیاض کے گاؤں میں آئی تھی: جب سے وہ اس گاؤں میں آئی تھی لوگوں کی نظریں جیسے اس پر جم کررہ گئی تھیں۔ وجہ یہ نہیں کہ وہ بہت خوب صورت اور جوان عورت تھی یا وہ کسی غیر معمولی صلاحیت کی مالک تھی۔ بلکہ وجہ اس کی ڈھلتی ہوئی عمر اور بدہیبت چہرہ تھا اور سونے پر سہاگہ اس کی مردوں جیسی بھاری بھرکم آواز مگر ان تمام خامیوں کے باوجود ایک خوش شکل چوبیس پچیس سالہ نوجوان کا اس پر فدا ہوجانا اور محبت میں اس حد تک گزر جانا کہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر رشیداں سے شادی کرلینا سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔ کیونکہ رشیداں میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو کسی مرد کی توجہ حاصل کرنے کا باعث بنتی جو اس طوطا مینا کی جوڑی کو دیکھتا تشش وپنج میں مبتلا ہوجاتا تھا۔

کئی لوگ اس بے جوڑ شادی کو اس نوجوان کا ذہنی خلل سمجھتے تھے، جبکہ آس پڑوس کی کئی عورتوں اور لڑکیوں کا یہ خیال تھا کہ رشیداں نے اس نوجوان پر سفلی علم کروایا ہے

جو وہ رشیداں جیسی عورت کی زلفوں کا اسیر بن چکا تھا۔
بہر حال رشیداں کے شوہر سلیم کے عشق کو دیکھ کر واقعی اس کہاوت میں صداقت نظر آتی تھی کہ "محبت اندھی ہوتی ہے۔"
لوگوں کے ان دونوں میاں بیوی کے متعلق خیالات اپنی جگہ مگر رشیداں سلیم کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی جہاں سلیم نے رشیداں کے لئے اپنا گھر چھوڑا تھا، وہیں رشیداں نے بھی سلیم کی خاطر اپنے تین عدد بچوں سمیت اپنے شوہر کو چھوڑ دیا تھا۔
وہ بڑی شدت سے سلیم کو چاہتی تھی اور اسے کھونے کے خیال سے بھی لرز اٹھتی تھی۔
سلیم نے گاؤں کے چوہدری فیاض کے ہاں ملازمت کرلی تھی۔ سلیم پڑھا لکھا تھا اس لئے چوہدری فیاض نے سلیم کو حساب کتاب کا کام سونپ دیا تھا وہ سلیم سے کافی حد تک متاثر لگتا تھا۔
رشیداں خوش تھی سلیم کو اچھا کام مل گیا ہے گھر کا خرچہ اچھا چل جائے گا۔ وہ ایک تابعدار بیوی کی طرح سلیم کا بہت خیال رکھتی تھی۔ مگر وہ دل میں ڈرتی تھی کہ اس اندیشے سے کہ کہیں سلیم کی محبت کسی روز بدل نہ جائے، کیونکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ گاؤں کی کئی لڑکیاں سلیم کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش میں رہتی ہیں اور پھر ایک دن اس کی ایک پڑوسن نے اس کے اندیشے کو گویا ہوا دے دی۔
"ارے رشیداں۔" اس کی پڑوسن زاہدہ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی جیسے چلائی۔ رشیداں اس وقت سلیم کے لئے کھانا بنا کر فارغ ہوئی تھی۔ کچن سے نکلتے ہی بولی۔ "زاہدہ! آج تو نے کیسے میرے گھر کی راہ دیکھ لی؟"
زاہدہ صحن میں پڑی بان کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"بات ہی کچھ ایسی ہے روز سوچتی ہوں تجھے بتاؤں پر کیا کروں تیرے گھر آنے کا وقت ہی نہیں ملتا، تجھے تو پتہ ہے کہ میں چوہدری صاحب کی حویلی میں کام کرتی ہوں وہاں سے رات کو فارغ ہو کر گھر آتی ہوں پھر شوہر اور بچوں کو سنبھالتی ہوں۔"
"تو یہ بتا کہ بات کیا ہے۔" رشیداں اس کی وضاحت سے اکتا کر بولی۔ "آج کل چوہدری صاحب نے تیرے میاں سلیم کی ڈیوٹی چھوٹی بی بی شبانہ کو کالج چھوڑنے اور کالج سے لانے کی لگائی ہے وہ روزانہ اسے گاڑی پر کالج چھوڑتا اور لے کر آتا ہے۔" زاہدہ فوراً بولی۔
"یہ شبانہ کون ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں اگر سلیم کو نوکری کی وجہ سے یہ کام کرنا پڑتا ہے۔" رشیداں قدرے لاپرواہی سے بولی۔
زاہدہ نے حیرت سے رشیداں کو دیکھا۔ "بڑی بھولی ہے تو بھی!"
"چھوٹی بی بی چوہدری صاحب کی اکلوتی بیٹی ہے اور میں نے غور کیا ہے کہ وہ سلیم میں کافی حد تک دلچسپی لینے لگی ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیرے میاں کی نظریں ہی نہ پھر جائیں۔"
"اری ہٹ تیرے منہ میں خاک!" رشیداں ایک دم غصے سے بولی۔ "میرا سلیم ایسا ہرگز نہیں ہے وہ میرے علاوہ کسی اور کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔" رشیداں بڑے ناز سے بولی۔
"اگر کوئی دیکھنے والی چیز ہو تو میں مان سکتی ہوں اس سے نظریں ہٹانا مشکل ہو جاتا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الگ ہے۔" زاہدہ اسے سرتاپا گھور کر بولی۔
"مطلب کیا ہے تیرا؟" رشیداں گویا بھڑک گئی۔
"مطلب وطلب کو چھوڑ اگر تو مجھے کہے تو میں سلیم کے حویلی میں گزرنے والے ہر پل کی خبر تجھے دے سکتی ہوں۔" زاہدہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔
"تیرا مطلب ہے کہ تو میرے خاوند کی جاسوسی کرے گی۔" رشیداں فوراً بولی۔ "ہاں سیدھی سی بات ہے۔" زاہدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
"مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں میرا سلیم بہت اچھا ہے وہ مجھے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔" رشیداں گویا سلیم پر اپنے بھروسے کا دفاع کرتے ہوئے بولی۔
زاہدہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھ رشیداں!

مرد کی محبت کبھی آخری نہیں ہوتی اسے بار بار محبت ہوتی ہے اس لئے کبھی بھی مردوں کی محبت پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے بلکہ مرد کی محبت کسی بے لگام گھوڑے کی طرح ہے اس کی لگام میں جتنا کس کر رکھو گی اتنا تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔"

"ہاں شاید تو ٹھیک ہی کہتی ہے۔" رشیداں ہار مانتے ہوئے بولی۔

زاہدہ پھر اسے حقیقت کا آئینہ دکھاتے ہوئے بولی۔ "مردوں کا دل تو بڑی اچھی اچھیوں سے بھر جاتا ہے تو پرامت منانا تو خود اپنے متعلق سوچ، میں تیرا بھلا چاہتی ہوں۔" اس بار زاہدہ کی بات رشیداں کو بری نہیں لگی وہ شک کی دلدل میں دھنستی چلی جارہی تھی۔

"ٹھیک ہے تو اپنا کام شروع کردے۔" یہ کہتے ہوئے رشیداں کو اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"یہ ہوئی ناں بات۔" زاہدہ نے رشیداں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا اور بات مکمل کی۔ "مگر اس کے بدلے مجھے بھی کچھ چاہئے ہوگا۔"

"اس کی تو فکر مت کر مجھ سے جو ہوا تجھے دوں گی۔" رشیداں گہری سنجیدگی سے بولی۔ زاہدہ تھوڑی دیر بعد چلی گئی مگر رشیداں اس وقت تک چارپائی پر کسی بے حس و حرکت مجسمے کی طرح بیٹھی رہی جب تک سلیم نہ آگیا۔

"کدھر گم ہو؟" سلیم اسے ہلاتے ہوئے بولا۔

رشیداں اچانک سلیم کو اپنے سامنے پاکر گڑبڑا سی گئی۔ "کک...... کہیں نہیں۔" وہ ہکلا کر بولی۔ سلیم اس کے ہاتھوں کو تھام کر بولا۔ "آج بہت بھوک لگ رہی ہے جلدی سے کھانا گرم کرو، میں ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔" سلیم کے لہجے میں بے پناہ محبت اور اپنائیت تھی جس نے زاہدہ کی باتوں کو اس کے دماغ سے بالکل نکال دیا اور وہ مسکرا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اگلے دن زاہدہ نے اپنا کام شروع کردیا۔ وہ شبانہ اور سلیم پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔

شبانہ ایف اے کی اسٹوڈنٹ تھی اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی تھی۔ وہ واقعی سلیم کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگی تھی سلیم اور رشیداں کی بے جوڑ شادی کے متعلق وہ جان چکی تھی۔ رشیداں کے سراپے کے متعلق بھی وہ کافی باتیں جانتی تھی اور یہ ساری باتیں اسے بتانے والی ہستی زاہدہ ہی تھی جو دونوں طرف اپنا کام کررہی تھی۔ شبانہ نے زاہدہ کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ وہ سلیم کی گھریلو زندگی کے متعلق اسے زیادہ سے زیادہ معلومات دیتی رہے۔ اس کے بدلے میں وہ اسے خاصے پیسے دیتی رہتی تھی۔

شبانہ پڑھائی میں مدد لینے کے بہانے سلیم کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ دوسری طرف چوہدری فیاض سلیم کی موجودگی میں خود کو کافی بے فکر محسوس کرتا تھا۔

سلیم نو عمر ہونے کے باوجود معاملہ فہم اور عقل مند تھا اس لئے، چوہدری فیاض نے اپنے زمینی معاملات کی ذمہ داری سلیم کو سونپ دی تھی۔ وہ بہت کم عرصے میں سلیم پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ وہ جہاں جاتا سلیم کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا اس لئے شبانہ کو اب کم ہی سلیم کی شکل دکھائی دیتی تھی۔ وہ بہت زیادہ بے چین تھی آخر اس کی بے چینی اس حد تک پہنچ گئی کہ اس نے سلیم کے سامنے اپنا حال دل بیان کرنے کا فیصلہ کرلیا اس نے زاہدہ سے کہا کہ "وہ سلیم کے ساتھ اس کی ملاقات کا بندوبست کرے۔" اس کے عوض اس نے اپنے قیمتی ملبوسات اور پیسوں سے زاہدہ کی مٹھی گرم کردی تھی۔

زاہدہ نے موقع دیکھ کر سلیم سے شبانہ کے متعلق بات کی کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ آج رات حویلی کی پچھلی جانب موجود باغ میں۔ سلیم پہلے تو حیران ہوا پھر اس نے شبانہ سے ملنے کی حامی بھرلی۔

زاہدہ نے عورتوں کی فطری عادت، ادھر کی بات ادھر کرنے کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ خبر رشیداں تک پہنچادی۔ زاہدہ نے رشیداں کو بس اتنا ہی بتایا تھا کہ سلیم شبانہ سے آج رات مل رہا ہے مگر وہ کہاں مل رہا ہے یہ زاہدہ نے رشیداں کے بار بار پوچھنے کے باوجود نہیں بتایا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی رشیداں وہاں پہنچ کر ہنگامہ کھڑا کردے گی۔

اس رات رشیداں بہت بے چین رہی کیونکہ

سلیم رات کے دس بجے کے باوجود گھر نہیں آیا تھا عموماً وہ رات کے آٹھ بجے تک آجایا کرتا تھا۔ رشیداں فوراً گھر سے نکلی اور سلیم کا پتہ کرنے زاہدہ کے گھر کی جانب بڑھ گئی مگر زاہدہ کے گھر کے مرکزی دروازے پر لگا تالا اسے منہ چڑا رہا تھا۔ ''زاہدہ اپنے گھر والوں سمیت اس وقت کہاں چلی گئی؟'' رشیداں سوچ میں پڑ گئی۔

اس کے ذہن میں یہ خیال سرعت سے ابھرا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ واپس پلٹ گئی۔ اور اپنے گھر کے کشادہ صحن میں غصے کی حالت میں ٹہلنے لگی۔ سلیم کا شبانہ کے ساتھ ہونے کا خیال ہی اس کے لئے باعث اشتعال تھا۔ وہ اس قدر غصے میں تھی کہ ہر چیز کو تہس نہس کر دینا چاہتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد سلیم گھر میں داخل ہوا۔ وہ خاصا پریشان دکھائی دیتا تھا۔ رشیداں نے بغور سلیم کا جائزہ لیا۔ سلیم نے اس کا حال چال پوچھا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ آج اس کی آنکھوں اور لہجے میں وہ والہانہ محبت رشیداں کو محسوس نہیں ہوئی جس کا اظہار وہ ہر روز کام سے آکر کرتا تھا۔ بلکہ اس کی جگہ بیزاری چھلکتی ہوئی محسوس ہوئی سلیم نے کھانا بھی نہیں کھایا اور خاموشی سے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

''محبوبہ سے چند گھنٹے بچھڑنے کا دکھ اسے اداس کر رہا ہے۔''

رشیداں نے دل ہی دل میں حقارت سے سوچا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اگلے روز بھی سلیم خاصا پریشان تھا وہ بہت چپ چپ اور گم سم سا تھا۔ رشیداں نے بھی اس کے اس رویے کی وجہ دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا تھا وہ اپنی دانست میں اس کی وجہ جانتی تھی۔ اس لئے بار بار مشتبہ اور ملامت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سلیم اس قدر پریشان تھا کہ وہ رشیداں کی آنکھوں میں جلتی رقابت کی آگ کو نہ دیکھ پایا تھا۔ اس نے چپ چاپ ناشتہ کیا اور کام پر چلا گیا۔

رشیداں نہیں جانتی تھی کہ رات کو سلیم اور شبانہ کی ملاقات میں کیا بات ہوئی۔ البتہ زاہدہ ضرور اس بات کا علم رکھتی تھی۔ مگر وہ رات سے ہی اپنی فیملی سمیت کہیں غائب تھی۔ رشیداں نے آس پڑوس کی عورتوں کے متعلق دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ''زاہدہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ وہ اسے لے کر اسپتال گئی ہے۔''

رشیداں سخت پریشان تھی پہلے اس نے سوچا حویلی جا کر خود شبانہ سے بات کرے مگر شبانہ سے بات کر کے کیا ہوتا وہ سب کچھ جاننے کے باوجود سلیم کو پسند کرتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ اس کا دل کئی وسوسوں کا شکار ہو چکا تھا۔

جس شخص کی خاطر اس نے اپنی ممتا کا گلا دبا دیا اپنی پندرہ سالہ ازدواجی زندگی کو تباہ کر ڈالا۔ لوگوں کے طعنے اور عمر بھر کی بدنامی اپنے نام کر لی وہ آج سے تہی دامن کر کے چھوڑ رہا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اسے چھوڑ دے۔ مگر مرد ذات کے لئے سب کچھ ممکن ہوتا ہے۔ محبت کرنے پر آئے تو اپنی جان تک سے گزرنے سے دریغ نہیں کرتا اور اگر بدلنے پر آئے تو عورت کی کسی قربانی کا پاس نہیں رکھتا۔

وہ دکھی تھی سب کچھ کھو دینے کے خیال سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

دل میں اس قدر غم اور غصہ تھا کہ وہ سلیم کا گریبان پکڑ کر اس سے ہر بات کا حساب لینا چاہتی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی اس کی آہ و بکا کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ اپنی بے بسی پر وہ اس قدر آبدیدہ ہوئی کہ تکیے میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میں تمہیں کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی سلیم۔''

وہ روتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''تمہیں پتہ چلنا چاہئے سلیم میری محبت میں اور اس شبانہ کی محبت میں کتنا فرق ہے وہ واہیات لڑکی تمہاری ظاہری خوب صورتی سے محبت کرتی ہے میں اس پوری دنیا میں وہ واحد عورت ہوں جو تمہاری بدصورتی سے بھی محبت کر سکتی ہے اور اس

بات کا احساس میں تمہیں ضرور دلاؤں گی۔"

وہ گویا دیوانہ ہوگئی تھی اور دیوانگی کے عالم میں ہذیان بکنے لگی تھی۔ اسی رات، اس نے اپنی اس بات کو حقیقت کا رنگ دے ڈالا۔

اس رات سلیم تھکا ہارا کام سے لوٹا اور کھانا کھانے کے بعد گہری نیند سوگیا۔ رشیداں نے تیزاب کی بوتل اٹھائی اور سلیم کے منہ پر انڈیل دی۔ تیزاب منہ پر پڑتے ہی سلیم جلن اور اذیت سے بلبلا اٹھا۔ اس کی اذیت ناک چیخوں سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔ رشیداں سلیم کو تکلیف میں دیکھ کر خود بھی دیوانوں کی طرح چیخنے لگی۔

آس پڑوس کے لوگ چیخ و پکار سن کر دیواریں پھلانگ کر گھر میں داخل ہوئے۔ رشیداں سلیم کی حالت دیکھ کر تڑپ گئی۔ اپنی دانست میں تیزاب اس نے سلیم کے منہ پر پھینکا تھا مگر اس تیزاب نے سلیم کے چہرے اور گردن کو بری طرح مسخ کرڈالا تھا۔ ان لوگوں نے سلیم کو فوری طور پر اسپتال پہنچایا۔

رشیداں کے ہاتھ میں موجود تیزاب کی بوتل اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ تیزاب اس نے ہی سلیم پر پھینکا تھا۔ اس لئے رشیداں کو فوراً پولیس کے حوالے کردیا گیا جبکہ سلیم دو روز تک مسلسل موت و حیات کی کشمکش میں رہا تیسرے روز بڑی مشکل سے اسے ہوش آیا۔ پولیس اس کا بیان لینے آئی تو اس نے اپنے بیان سے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

سلیم کا کہنا تھا کہ "میری بیوی رشیداں نے ہی مجھ پر تیزاب پھینکا ہے مگر میں اپنے ہوش و حواس میں اپنی بیوی رشیداں کو معاف کرتا ہوں اور قانون سے گزارش کرتا ہوں کہ اسے سزا نہ دی جائے۔"

سلیم اپنا بیان دینے کے چند گھنٹوں بعد اس دنیا سے چل بسا اور سلیم کے اس بیان کی وجہ سے رشیداں کو چھوڑ دیا گیا۔ رشیداں پر سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ اس کی عقل سلیم کا بیان سننے کے بعد دنگ رہ گئی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو رشیداں کو بری سزا دلوا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا، کیا وہ واقعی رشیداں سے محبت کرتا تھا؟

اگر ایسا تھا تو پھر وہ شبانہ کو کیوں بیچ میں لے آیا تھا؟ ایسے بہت سے سوال اس کے دماغ کو کچوکے لگا رہے تھے۔ وہ چپ تھی اس کے پاس بولنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا بس ذہن میں بہت سے سوالات تھے جنہوں نے اسے حیرت سے ششدر کردیا تھا۔ اسے نہیں معلوم کب سلیم کی تدفین ہوئی اور کب سلیم کو مرے ہوئے تین دن گزر گئے۔ وہ تو گویا اپنا ہوش کھو بیٹھی تھی۔ محلے کی چند ہمدرد عورتیں اس کی دیکھ بھال کردیتی تھیں۔

اس شام وہ صحن میں بیٹھی تھی جب زاہدہ اس کے گھر میں داخل ہوئی، رشیداں کو اس حالت میں دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اسے جھٹکا لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"رشیداں یہ سب کیا ہوگیا، میں اپنے بیٹے کو چند روز کے لئے اسپتال لے کر گئی۔ یہاں تو دنیا ہی بدل گئی۔ سلیم پر تو نے تیزاب کیوں پھینکا؟"

یہ سارے سوال کرتے وقت زاہدہ کو احساس ہوا، وہ یہ سوالات کسی جیتے جاگتے انسان سے نہیں بلکہ کسی پتھر سے کررہی ہے۔ رشیداں بت بنی زمین کو گھورے جارہی تھی۔

زاہدہ رشیداں کے مزید نزدیک ہوگئی اور سرگوشی کے انداز سے بولی۔

"ویسے سلیم بھائی بڑا ہی نیک اور اچھا بندہ تھا مجھے پہلی بار اسے دیکھ کر احساس ہوا، اس دنیا میں آج بھی وفا کرنے والے مرد موجود ہیں۔ اس رات شبانہ نے سلیم کو شادی کی پیشکش کی تھی تو سلیم سختی سے بولا۔

"میں تو صرف رشیداں سے محبت کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی زندگی گزاروں گا، آئندہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی تو میں نوکری چھوڑ دوں گا۔" زاہدہ مسلسل بولے جارہی تھی۔

اچانک رشیداں کے اعصاب کو جھٹکا لگا اس کے بے حس و حرکت وجود میں جنبش پیدا ہوئی اس پر طاری سکتے کی کیفیت ٹوٹ سی گئی اور اس نے زاہدہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔

''زاہدہ تو پہلے کہاں تھی۔ میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اسے مار ڈالا وہ کتنا اچھا تھا ناں! کتنی محبت کرتا تھا مجھ سے اور میں کتنی بری ہوں اس پر شک کیا اس پر تیزاب پھینک دیا، میں کس قدر بری ہوں۔'' وہ اپنا چہرہ نوچ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

زاہدہ اس کی کیفیت دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ رشیداں خونخوار نظروں سے زاہدہ کو گھورتے ہوئے غرائی۔ ''مگر تو نے کہا تھا وہ قابل اعتبار نہیں وہ شبانہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر زاہدہ پر ٹوٹ پڑی اور اپنے ناخنوں سے زاہدہ کے چہرے کا زاویہ بگاڑنے لگی۔

زاہدہ اس اچانک حملے سے بلبلا اٹھی اور خود کو رشیداں کے چنگل سے چھڑاتے ہوئے چلائی۔ ''چھوڑ مجھے پاگل عورت'' آس پاس موجود عورتیں فوراً بھاگی ہوئی آئیں اور بڑی مشکل سے انہوں نے زاہدہ کو رشیداں کی گرفت سے نکالا، رشیداں کو پکڑ کر ان عورتوں نے ایک کمرے میں بند کردیا، وہ کمرے میں بند ہونے کے بعد بھی دروازے کو مسلسل پیٹتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

''کمینی عورت تو نے میرے ہاتھوں سے میرے شوہر کو مروا ڈالا، تو نے میرے دل میں شک کا بیج بویا، میں تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔''

رشیداں کے منہ سے تمام تر حقیقت سننے کے بعد زاہدہ چور نگاہوں سے اردگرد موجود عورتوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بدشکل پاگل عورت! پتہ نہیں کیا بکواس کیئے جارہی ہے، اس سے ہمدردی کرنا خود کو مصیبت میں ڈالنا کے برابر ہے۔ اپنے شوہر کو مار کر اب دوسروں کے سر اس کا الزام تھوپ رہی ہے۔'' وہ غصے سے بولی اور وہاں سے کھسک گئی۔

رشیداں کافی دیر تک چیخ چیخ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی پھر اس کے کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد رشیداں کے کمرے کا دروازہ کھولا گیا تو وہاں موجود عورتوں نے ایک دلخراش منظر دیکھا۔ رشیداں کا بے حس و حرکت وجود چھت کے پنکھے کے ساتھ جھول رہا تھا۔

''شک'' وہ خوفناک عفریت ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے کئی ہنستے بستے گھروں کو برباد کردیتا ہے۔ اور جب میاں بیوی کے خوب صورت رشتے میں شک کا بیج بودیا جائے تو اس کا انجام بہت بھیانک ہوتا ہے۔ رشیداں اپنے ہی ہاتھوں اپنی پرسکون زندگی تباہ کربیٹھی تھی۔ محبت کرنے والے شوہر کو کھو چکی تھی۔

سلیم نے اسے معاف کرکے اس دنیا کی عدالت میں تو سزا سے بچالیا تھا مگر وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں سزا سے نہ بچ پائی تھی اور وہ سزا تھی ''موت'' جس پر عمل درآمد کرتے ہوئے اس نے خود کو پھانسی لگا کر خودکشی کرلی تھی۔

رشیداں کی موت کے بعد، سلیم کا گھر ویران ہوگیا۔ لے دے کے دو میاں بیوی ہی تھے، کوئی رشتے دار تو تھا نہیں۔ رشیداں کو گاؤں والوں نے دفنا دیا۔ اور ان کے گھر کو لوگوں نے کنڈی لگادی۔

دفنانے کے ٹھیک دسویں رات چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے ساڑھے 12 بجے پاس پڑوس والوں نے اس گھر سے بہت دلخراش چیخ سنی تو وہ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ گھر کے پاس ہی تخت پر ایک شخص بیٹھا ہے وہ ہیولہ کی صورت میں تھا اور اس کے سامنے ایک عورت کا ہیولہ اچھل کود کرتے ہوئے چیخ رہا ہے۔'' میں ظالم ہوں، میں نے ہی ظلم کیا، وہ......وہ...... مجھے بچالو...... مجھے بچالو......'' اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ اوپر سے ایک پھندا نیچے کو آیا اور اس پھندے میں وہ عورت جکڑ دی گئی۔ اور پھر وہ پھندا اوپر کو آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد سارا معاملہ نظروں سے غائب ہوگیا۔

دیکھنے والے انگشت بدنداں تھے، یہ لوگوں نے جان لیا کہ مرد کا ہیولہ سلیم کا تھا اور عورت جو چیخ رہی تھی یقیناً رشیداں کی تھی۔ آج اس واقعہ کو کئی سال بیت گئے ہیں لیکن ہر چاند کی چودھویں رات کو یہی دلخراش اور ناقابل فراموش منظر لوگوں کو نظر آتا ہے۔

☠

پراسرار سانپ

خلیل جبار۔حیدرآباد

برس ہا برس سے وہ سانپ آزادانہ کاٹھ کباڑ والے کمرے میں رہتا تھا، دروازے کے پاس ایک بل بھی تھا جس میں آرام کرتا مگر ایک دن کسی خطرے کے پیش نظر اس کے بل کو بند کردیا کہ اچانک اس گھر پر تباہی و بربادی ٹوٹ پڑی اور پھر ایک خطرناک واقعہ رونما ہوا۔

ایک عجیب شاخسانہ جو کہ پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دے گا۔سبق آموز کہانی

میں اس وقت نیو سعید آباد کے شاہی بازار کے نکڑ پر کھڑا ہوں۔ یہ شاہی بازار کبھی چند دکانوں پر مشتمل تھا۔ مگر اب شاہی بازار بہت بڑھ چکا ہے۔ دکانوں کی تعداد بھی آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھ چکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ صبح کے وقت بھی شاہی بازار میں سناٹا ہوا کرتا تھا اب پورا دن شاہی بازار میں رونق نظر آتی ہے۔ دکانیں بھی سامان سے بھری ہوئی ہیں۔

حیدر آباد سے تقریباً دو گھنٹے کی مسافت پر نیو سعید آباد ہے۔ جس کا شمار گاؤں میں ہوتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے آبادی اتنی پھیل چکی ہے کہ وہ گاؤں کے بجائے شہر معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے ایک کزن کے ولیمے اور اس کی بہن کی شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔ میں ابھی شادی اور ولیمے کا کھانا کھا کر فارغ ہوا ہوں۔ شہروں میں بڑی سختی ہونے پر بھی شادی ہال میں

کھانا اتنی تاخیر سے ملتا ہے کہ اپنے گھر پہنچتے پہنچتے رات کے دو ڈھائی بج جانا معمول بن چکا ہے۔

نیو سعید آباد میں کسی بھی قسم کی کوئی سختی نہیں ہے پھر بھی بارات کا کھانا صبح گیارہ بجتے ہی شروع کر دیا جاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ آتے ہیں کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ جب تک بارات شہر سے پہنچے گاؤں کے لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ بارات آنے پر کھانا کھانے کے لئے صرف باراتی رہ جاتے ہیں۔ باراتیوں کو کھانا کسی ہال میں نہیں بلکہ گلی کے کسی بڑے مکان کو ایک دن کے لئے خالی کرا کر اس کے اندر کھانا کھلایا جاتا ہے۔

شہر سے بارات ابھی پہنچی نہیں تھی مگر میں کھانا کھا کر فارغ ہو چکا تھا۔ اس گاؤں سے میرے بچپن کی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ جب تک بارات شہر سے آجائے میں نے سوچا ان بچپن کی یادوں کو پھر سے تازہ کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر میں اکیلا ہی بازار کی طرف نکل آیا تھا۔ میں جس جگہ کھڑا ہوں یہ مین سڑک ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر جدھر تک بھی نظر دوڑاؤ دونوں اطراف میں دکانیں ہی دکانیں ہیں جن میں زیادہ تر ہوٹل ہیں۔ اس سڑک پر کبھی چند دکانیں تھیں اور ہوٹل بھی گنتی کے تھے۔

شاہی بازار کے نکڑ سے دو یا تین دکانیں چھوڑ کر میرے نانا اسماعیل کی پرچون کی دکان تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی حکیم سلیمان نے اس دکان کو سنبھال لیا تھا۔ میں نے اپنے نانا اسماعیل کو نہیں دیکھا مگر ان کے بھائی نانا حکیم سلیمان کو ہی دیکھا تھا۔ وہ دکان اب ختم ہو چکی ہے اور وہ دکان تین چھوٹی دکانوں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ میرے سیدھے ہاتھ کی جانب چند دکانوں کے بعد ایک چھوٹی سی گلی ہے، گلی ختم ہونے پر اس کے دوسرے سرے پر ریلوے اسٹیشن ہے جو اب اجڑ چکا ہے۔ اسٹیشن کی ٹوٹی ہوئی خستہ حال عمارت اور ریلوے کی پٹریاں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ کبھی یہاں سے ٹرین گزرا کرتی تھی۔ اب ریلوے کی جگہ پر تجاوزات قائم ہو چکی ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل اس علاقے میں ہندوؤں کی آبادی تھی۔ ان گلیوں میں مکانات سارے ایک ہی طرز پر بنے ہوئے تھے۔ دروازے کے ایک جانب باتھ روم، دروازے کے دوسری جانب بیٹھک، صحن اور کمرے کے درمیان مٹی کا چولہا ہوا کرتا تھا۔ جب کہ دوسری جانب صراحی یا مٹکے کسی چیز پر رکھے ہوتے تھے اور ان پر گلاس رکھا ہوتا تھا۔ سونے کے کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا کمرہ ہوتا جس میں سامان رکھا ہوتا اور ایک حصے کو رات میں باتھ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

خواتین اور لڑکیوں کے لئے تفریح صرف ریڈیو تھا۔ جو سیل سے چلا کرتا تھا۔ کھانا پکاتے ہوئے یا لسی بناتے ہوئے اس ریڈیو کو آن کر دیتی تھیں۔ ریڈیو سے گانے یا نئی آنے والی فلم کی مختصر کہانی اور گانے خواتین میں مقبول تھے۔ ان فلموں کی کہانی اور گانے سن کر خواتین پروگرام بنایا کرتی تھیں۔ حیدر آباد جانے پر سینما میں یہ فلم ضرور دیکھنی ہے۔

بچوں کی تفریح گرمیوں میں جا کر نہر میں نہانا، کنچے کھیلنا، لٹو چلانا، گدھوں کو چھیڑنا یا ان کی سواری کرنا ان سب کھیلوں میں ایک کھیل بڑا مقبول ہوا لیکن زیادہ نہیں چل سکا۔ وہ کھیل یہ تھا کہ کسی بھی ایک بچے کو پرانا سا سہرا پہنا کر گدھے پر بیٹھا کر سڑک اور گلیوں کی سیر کرانا۔ گدھے کے پیچھے بچے باراتی ہوتے تھے۔

فالسے کے موسم میں جب شام کو فالسے بیچنے والا گلی میں آتا تھا۔ وہ بچوں کے پاس پیسے نہ ہونے پر ان سے گندم لے کر فالسے دے دیتا تھا۔ بچے خوب فالسے کھاتے اور کچھ شربت بنا کر پیتے تھے۔

گرمی کے دنوں میں رات میں تھکے ہارے بوڑھے اور جوان گلی میں چارپائی پر بیٹھ جاتے تھے۔ دن بھر کی مصروفیات پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ قصے کہانیوں کے دور چلتے۔ درمیان میں حقہ رکھا ہوتا تھا۔ جن کو بیڑی پینے کا شوق تھا وہ حقے کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر کش لگاتے تھے۔ ریڈیو سے خبریں سن کر ملکی حالات سے

باخبر رہتے تھے۔ رات کے جیسے ہی نو بجتے سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے، جلد سو جانے سے انہیں فجر کی نماز پڑھنے میں آسانی رہتی تھی۔

ان ہی گلیوں میں میرے نانا اسماعیل کا گھر تھا۔ جس میں ان کے بڑے بھائی حکیم سلیمان بھی رہتے تھے۔ میرے نانا نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے میری والدہ برکت اور خالہ خاتون پیدا ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی کے انتقال پر دوسری شادی کی لیکن اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ بیٹوں کی حیدر آباد میں شادیاں ہوجانے پر وہ اس فرض سے فارغ ہوگئے تھے۔ ان کے انتقال ہوجانے پر ان کی پرچون کی دکان حکیم سلیمان نے سنبھال لی تھی۔ وہ اکیلے ہی تھے ان کی بیوی اور تین لڑکوں کا انتقال ہوگیا تھا جس کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ دوسری شادی نہ کرنے کی وجہ مایوسی تھی۔ ان کے یہاں صحت مند بچے پیدا ہوتے تھے لیکن کچھ ماہ جی کر انتقال کرجاتے۔ ہم سب بہن بھائی دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے نیو سعید آباد ضرور جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے نانا کے گھر میں ایک کالے سانپ کو پہلی بار دیکھا۔ وہ بہت تیزی سے بیٹھک کے اندر سے نکلا۔ اور چولہے کے قریب آٹا پیسنے کی چکی کے نیچے چھپ گیا۔

میں اس وقت چکی کے پاس بچھی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کالے سانپ کو دیکھ کر میرے جسم میں کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ میں چارپائی پر سہا بیٹھا ہوا تھا۔ سانپ چکی کے نیچے سے نکلا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ سانپ کے کمرے کے اندر جانے پر میرا خوف کچھ کم ضرور ہوگیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ والدہ صاحبہ جب پڑوس سے آئیں تو میں نے انہیں سانپ کے بارے میں بتایا۔ سانپ کے ذکر پر وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''اس سانپ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ کچھ نہیں کہے گا۔''

''وہ کیوں؟''

۔۔۔ یہ میں اس وقت سے دیکھ رہی ہوں جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے اس نے آج تک کسی انسان کو نہیں کاٹا ہے۔ یہ بیٹھک میں ہی رہتا ہے اسی لئے ہم نے بیٹھک کو استعمال کرنے کے بجائے اس میں کاٹھ کباڑ اور فالتو سامان ڈالا ہوا ہے۔‘‘

اس دن کے بعد میں نے بارہا اس کالے سانپ کو دیکھا۔ وہ تیزی سے بیٹھک سے آٹے کی چکی کے نیچے آتا پھر کمرے کے اندر سے ہوتا ہوا رات کے وقت میں باتھ روم کے طور پر استعمال ہونے والا چھوٹے کمرے کے اندر چلا جاتا۔ اس کمرے میں ایک سوراخ تھا جس کے اندر وہ جاتا تھا لیکن ہم میں سے کسی کو بھی اس نے کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔

اس سانپ کے لئے مشہور تھا کہ یہ کوئی عام سانپ نہیں ہے بلکہ اس گھر میں خزانہ دفن ہے جس کی یہ نگرانی کرتا ہے۔ اس سانپ کے حوالے سے ایک واقعہ بھی مشہور ہے کہ سانپ محمد یوسف عرف جوسا کے بھینس کے باڑے میں رات کی تاریکی میں چھپ کر اس کی بھینسوں کا دودھ روزانہ پی جاتا تھا۔

ایک رات جوسا کی آنکھ کھل گئی وہ گھر کے باہر گلی میں چارپائی بچھا کر سوتا تھا۔ گھر کے سامنے بھینسوں کے باڑے میں اسے روشنی نظر آئی دن کا سماں لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن یہ حقیقت تھی۔ وہ خاموشی سے چارپائی سے اٹھا اور باڑے کی جانب بڑھا جوسا کو دیکھ کر بھینسوں نے شور کیا۔ جس سے سانپ گھبرا کر بھاگ اٹھا اور اپنا منکا (سانپ کا مہرہ) وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ منکا سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ چھوٹا سا گول سا پتھر کی طرح کی چیز تھی جس سے روشنی پھوٹ رہی تھی وہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور سانپ کا منکا ہے۔ جوسا نے فوراً اس منکا کو اپنی جیب میں رکھ لیا اور گھر میں لاکر چھپا دیا۔

دوسرے دن جوسا کی بیوی سکینہ خالہ کے منہ سے یہ واقعہ نکل گیا جس پر نیوسعید آباد کی عورتیں وہ منکا دیکھنے کو ٹوٹ پڑیں کہ ہمیں بھی وہ منکا دکھاؤ کہ دیکھیں کیسا ہوتا ہے جوسا بھی اسی وقت گھر میں کام سے لوٹا تھا اسے جب پتا چلا کہ یہ عورتیں منکا دیکھنے آئی ہیں تو وہ بیوی پر گرم ہو گیا اور عورتوں کو بتایا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی منکا نہیں ہے جوسا کو اپنی بیوی پر گرم ہوتا دیکھ کر عورتیں ایک ایک کرکے وہاں سے کھسک گئیں۔ جوسا نے ساری زندگی اس بات سے انکار ہی کیا کہ اس کے پاس منکا ہے لیکن لوگ یہی کہتے ہیں کہ سانپ کا منکا ملنے پر ہی جوسا نے بہت ترقی کی اس سے پہلے اس کے پاس اتنا مال نہیں تھا۔

میری والدہ بچوں کی اسکول کی چھٹیاں گزارنے نیوسعید آباد آئی ہوئی تھیں۔ اس واقع پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے گاؤں کی عورتوں سے کہا۔

’’یہ سانپ برسوں سے ہمارے گھر میں ہے اور فائدہ پڑوسیوں کو پہنچا رہا ہے۔‘‘

رات کو وہ جب سوئیں تو خواب میں وہی سانپ نظر آیا وہ سانپ انسانی آواز میں بولا۔

’’تو کیوں غم کرتی ہے اس گھر میں اتنا خزانہ دفن ہے کہ اگر تیری سات پشتیں بھی کھائیں پھر بھی کم نہیں ہوگا۔ دن کے بارہ بجے صحن کو کھودنا شروع کردے۔ سارا خزانہ تیرا ہو جائے گا لیکن میری ایک شرط ہے کہ زمین کھودنے سے پہلے تو میرے نام کا دودھ اور مچھلی پر نیاز دلادے۔‘

والدہ محترمہ یہ خواب دیکھ کر بڑی خوش ہوئیں کہ سانپ نے اپنا خزانہ دینے کا کہہ دیا ہے اور کوئی بھینٹ بھی نہیں مانگی ورنہ ایسے خزانوں کے محافظ سانپ بھینٹ لئے بغیر خزانہ نہیں لینے دیتے۔

میرے والد عبدالجبار کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ اردو اور انگریزی کی کتابیں بہت آسانی سے پڑھ لیا کرتے تھے۔ اس دور میں انگریزی دور کی بات لوگوں کو صحیح سے اردو پڑھنا نہیں آتی تھی۔ اس خواب کی تعبیر انہوں نے والدہ محترمہ کو بتاتے ہوئے کہا۔

’’سانپ نے دودھ اور مچھلی کی نیاز کا جو کہا ہے

س سے اس کی مراد پہلا لڑکا اور پہلی لڑکی کی بھینٹ ہے کیا تم اس خزانے کو حاصل کرنے کو اپنی اولاد کی بھینٹ دو گی؟

خواب کی تعبیر سن کر والدہ محترمہ ڈر گئیں اور بولیں۔

''اپنی اولاد کی بھینٹ دے کر خزانہ حاصل کرنے سے بہتر ہے میں روٹی اور چٹنی سے کا نا کھانا منظور کرلوں گی لیکن اپنی اولاد کی بھینٹ کسی صورت نہیں دوں گی۔''

نانا اسمٰعیل کے گھر میں ایک نیم کا گھنا درخت بھی تھا جس کی کئی شاخیں تھیں ان شاخوں پر لگنے والی چھوٹی چھوٹی نیم کی گٹھلیاں جنہیں بچے نیم کی نسبت سے نمولیاں کہتے تھے۔ ان گٹھلیوں میں بچوں کے لئے بڑی کشش ہوتی تھی۔ بچے صبح صبح گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر گھر میں گھس جاتے اور زمین پر پڑی پکی ہوئی گٹھلیوں کو اپنی جھولی بھرنے لگتے تاکہ انہیں وہ چوس کر آم کا سا مزہ لے سکیں۔ ذرا سی آہٹ پر بچے گھبرا کر بھاگ جاتے کہ کہیں کوئی ان کی چوری نہ پکڑ لے۔

نیم کے درخت کے پاس کچی زمین ہونے پر جگہ ٹھنڈی ہوتی تھی اس جگہ پر پالتو کتیا آرام کیا کرتی تھی۔ بظاہر وہ آنکھیں بند کئے ہوئے ہوتی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ ذرا سی آہٹ پر چونک کر آنکھیں کھول دیتی تھی۔ اس سے باتیں کرنے پر اس طرح سے سنتی جیسے وہ ہماری بات کو بڑی توجہ سے سن اور سمجھ رہی ہے۔

ایک بار کتا مار مہم چل رہی تھی کتوں کو زہر دے کر ہلاک کیا جا رہا تھا۔ والدہ محترمہ نے کتیا کو مخاطب کیا کہ ''آج باہر نہیں جانا کتوں کو زہر دے کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔'' اس نے والدہ محترمہ کو ایسے دیکھا کہ جیسے وہ ان کی بات کو سمجھ گئی ہے۔ اور اس روز وہ پورا دن گھر سے باہر ہی نہیں نکلی۔

نیم کے درخت کے سامنے ایک لکڑی کا تخت ہر وقت بچھا رہتا تھا۔ جس پر بچے کھیلتے تھے بڑے بھی گرمیوں میں ہوا کھانے کو بیٹھ جاتے تھے۔

نیم کا درخت میرے لئے بڑی کشش کا باعث تھا۔ میں نیم کے درخت پر آنے والے پرندوں جن میں مینا، کوئل، کوے، طوطا، چڑیا، چیل، کبوتر اور فاختہ سمیت مختلف پرندے اس پر آکر بیٹھا کرتے تھے۔ میں انہی پرندوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ ان پرندوں میں چڑیا ایسا پرندہ ہے جو زمین پر دانہ چگنے کو آجاتی تھی۔ میں نے بچپن میں چڑیا کو پکڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کبھی ہاتھ نہیں آئی۔

ایک دن صبح کے وقت میری والدہ پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ میرے بڑے بھائی محمد سلیم، محمد جمیل، بہن جمیلہ اور پڑوسیوں کے بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ ہم چھوٹے بچے تخت پر بیٹھے ہوئے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اچانک کمرے کے ساتھ چھوٹا کمرہ جو رات میں باتھ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس سے چوزے کے چیخنے کی آواز آنے لگی۔

ان دنوں گاؤں میں لوگ بکرے، بکری، مرغ و مرغیاں، خرگوش اس لئے پالتے تھے کہ اچانک مہمان آجانے کی صورت میں انہیں ذبح کر کے مہمان داری کرسکیں۔ گھر میں چیز ہونے پر کوئی پریشانی بھی نہیں ہوتی تھی۔

ہمارے چوزے چھوٹے کمرے میں دانہ چگ رہے تھے۔ وہاں سے چوزے کی آواز آنے پر میرے بھائی سلیم نے دیکھا کہ کوئی چیز چھوٹے سوراخ میں سے چوزے کو اندر کھینچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے فوراً سے چوزے کو پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ چوزے کے ساتھ اس کو کھینچنے والا وہی کالا سانپ تھا۔ سانپ شدید غصے میں تھا وہ تیزی سے میرے بھائی سلیم کی طرف لپکا مگر بچوں نے سانپ، سانپ کا شور مچا دیا۔ میرا بھائی جس کے سانپ کو دیکھ کر اوسان خطا ہوگئے تھے۔ بچوں کے شور پر اسے حوصلہ ہوا اور باہر کی جانب لپکا۔ دوسرے بچے بھی سانپ، سانپ کہتے باہر نکل گئے، سانپ کا شور سن کر ہم چھوٹے بچے تخت پر بیٹھے سہم گئے۔ محلے

نے جب سانپ، سانپ کا شور سنا وہ بھی گھر میں آگئے۔ لیکن سانپ جوڑے سمیت غائب ہو چکا تھا۔ سب مایوس ہو کر چلے گئے۔

مغرب کے وقت نانا سلیمان دکان بند کر کے آگئے۔ انہیں بھی محلے والوں کے ذریعے سے صبح کے واقعہ کا علم ہو گیا تھا۔ اس واقعہ کا سن کر انہیں تشویش ہوئی کہ کہیں وہ سانپ، غصے میں کسی بچے کو نقصان نہ پہنچا دے، اس سوراخ میں آگ کے دہکتے کوئلے ڈال دیئے تاکہ وہ سانپ، آگ سے جل بھن کر مر جائے۔ اتنا کچھ کرنے پر بھی وہ سانپ زندہ رہا۔ اسے ذرا سا بھی آگ نے نقصان نہ پہنچایا تھا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے پر ہم اپنے گھر حیدر آباد آگئے۔

ان دنوں نیو سعید آباد میں گندم کی فصل کٹنے پر سال بھر تک استعمال ہونے تک گندم کا اسٹاک گھر میں کر لیا جاتا تھا۔ اور ضرورت کی استعمال کی چیزیں جمع کی جاتی تھیں بعض گھروں میں اب بھی یہ رجحان ہے اس طرح انہیں سارا سال چیزیں لانے سے نجات مل جاتی ہے۔ گندم خراب بھی نہیں ہوتی۔ حسب ضرورت گندم کو چکی میں پیس لیا جاتا تھا۔ میرے نانا حکیم سلیمان نے بھی مکان میں سال بھر کا اسٹاک کر رکھا تھا۔ وہ کسی کام سے حیدر آباد آئے تھے۔ شام کو دیر ہو جانے پر ان کی بس نکل گئی تھی۔ اس لئے وہ حیدر آباد میں ہی رک گئے۔

دوسرے دن جب وہ نیو سعید آباد پہنچے۔ انہیں معلوم ہوا کہ رات میں ہمارے نانا کے مکان سے تین گھر چھوڑ کر چوتھے گھر میں رہنے والے دو بھائیوں شبراتی اور رمضان نے تالا توڑ کر گھر پر قبضہ کر لیا ہے اور مکان سے کسی بھی صورت میں قبضہ چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ پولیس کی مدد حاصل کرنے پر گلی کے لوگ جمع ہو گئے۔

پولیس جب شبراتی کو گرفتار کر کے لے جانے لگی تو اس نے کلمہ پڑھ کر کہا کہ "یہ گھر اس کا ہے اور حکیم سلیمان اس کے پاس رہتا ہے۔ اس پر وہاں موجود لوگوں اور نانا حکیم سلیمان نے کلمہ پڑھنے پر اس کو سامان، گھر میں موجود رقم سمیت مکان دے دیا اور پھر کبھی پلٹ کر اس مکان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ حیدر آباد میں ہمارے گھر چلے آئے۔ یہیں ان کا انتقال ہوا۔

لیکن کلمہ پڑھ کر مکان حاصل کرنے والے شبراتی کے گھر پر مصیبتیں ٹوٹ پڑیں اور پریشانیوں نے وہاں ڈیرہ جما لیا۔ شبراتی اور اس کا بھائی اس دنیا میں نہیں۔ سنا ہے کہ اب اس گھر میں شبراتی کا پوتا رہتا ہے جو کہ نشئی ہو گیا ہے۔ مکان میں مشکوک لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے۔

مکان پر بظاہر قبضہ عام سی بات لگتی ہے کہ پڑوسیوں نے لالچ میں آکر قبضہ کر لیا کہ حکیم سلیمان کے کوئی وارث ہیں نہیں اس لئے مکان پر قبضہ آسان رہے گا۔ مگر یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ یہ واقعہ اس کے واقعہ کے بعد ہی کیوں ہوا۔ وہ پہلے بھی مکان پر قبضہ کر سکتے۔ سانپ کے بل میں آگ کے کوئلے ڈالنے کے بعد ہی کیوں مکان پر قبضہ ہوا۔ یہ بات آج تک ذہن قبول نہیں کر سکا۔ ایسا لگتا ہے دونوں واقعات ایک دوسرے کی کڑی ہیں۔ سانپ کی ناراضگی کے بعد ہی مکان پر قبضہ ہوا۔

اس مکان پر کیا قبضہ ہوا ہمارا نیو سعید آباد جانا ہی چھوٹ گیا۔ کئی کئی سال گزر جاتے ہیں۔ نیو سعید آباد آنا ہی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھار کسی شادی کی تقریب منعقد ہونے پر ہی گھر والوں کا نیو سعید آباد آنا ہوتا ہے۔ میری صحافتی مصروفیات کے سبب میں نے مجبوری ہی میں چالیس سالوں میں چند ہی شادی کی تقریبات میں شرکت کی ہو گی۔

اچانک میرے موبائل پر میرے کزن کی مس کال آگئی۔ جس کا مطلب تھا کہ شہر سے بارات پہنچ چکی ہے۔ اور مجھے فوری وہاں پہنچنا ہے۔ میں ماضی سے حال میں آچکا تھا۔ اور میرے قدم شادی والے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ جو کبھی گلی نمبر 8 ہوا کرتی تھی۔ اب نیو سعید آباد اتنا پھیل چکا ہے کہ گلیاں گننا مشکل ہو گیا ہے۔

خونی رات

قیصر جمیل پروانہ۔ماموں کانجن

راستہ بھٹک کر نوجوان آسیبی علاقے میں پھنچ گیا اور جب اسے ہوش آیا تو پانی سر سے گزر چکا تھا، اس کی موت یقینی تھی کئی آسیب اس کی طرف قہر آلود نظروں سے بڑھے مگر اچانک وہ جھٹکا کھا کر دور جاگرے آخر کیوں؟ کھانی پڑھ کر دیکھیں۔

سطر سطر حیرت سے دوچار کرتی اور دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی دل فگار کہانی

ہمارے استادمحترم قاری غلام احمد بہت نیک اور پرہیزگار انسان تھے۔ وہ لوگوں کا روحانی علاج کرتے تھے۔ ان کے روحانی علاج سے مستفید ہونے کے لئے ہمارے قصبے کے علاوہ دوسرے علاقوں بلکہ دور، دور سے لوگ آتے تھے۔ ان کے پاس ظاہر ہے...... مسلمانوں کا ہی آنا جانا تھا......

ایک دن میں قرآن مجید پڑھ رہا تھا کہ قاری صاحب کے ساتھ ساتھ میں اور دیگر تمام لڑکے بھی چونک پڑے۔ ایک شخص آیا اور استاد کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسے دیکھ کر استاد بولے۔ ”ہاں بھئی کیسے آنا ہوا، جو بھی بات ہے کھل کر بتاؤ۔“

وہ ہندو تھا، ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، استاد کی بات سن کر وہ گویا ہوا، ”قاری صاحب میرا بیٹا سخت بیمار ہے۔ اور اس کی

بیمار ن جو میں بیان ارہی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں۔"

"ٹھیک ہے رام داس اسے کل اسی وقت لے آنا دیکھ لیں گے۔"

یہ سن کر رام داس بولا...... "جی ٹھیک ہے۔" کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

اگلے دن ٹھیک اسی وقت رام داس ایک بیس بائیس سالہ لڑکے کو، ساتھ لے کر مدرسے میں داخل ہوا۔ قاری صاحب کمرے میں پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پہلے سے آئی ہوئی ایک عورت کو دم کر رہے تھے۔ اس عورت پر کسی نے جادو ٹونا کیا ہوا تھا۔

رام داس اور اس کا بیٹا، قاری صاحب کے سامنے بیٹھ گئے، تو قاری صاحب نے اس سے پوچھا۔

"اب بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

"یہ میرا بیٹا آج سے کوئی ایک ہفتہ پہلے غلطی سے اس طرف شکار کے لئے چلا گیا جہاں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں جن، بھوت، چڑیلیں اور خوفناک بلائیں رہتی ہیں اور اس طرف کسی کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تب سے اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے، عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے، نہ سوتا ہے نہ کھاتا ہے۔ اور جب کھاتا ہے تو دس بارہ روٹیاں کھا جاتا ہے، پانچ چھ جگ پانی پی جاتا ہے، اور اوپر سے خوفناک اور بھیانک قسم کے قہقہے لگاتا ہے...... اور سب سے حیرانگی کی بات یہ ہے کہ یہ جب بولتا ہے تو کبھی تو اپنی آواز میں یا پھر کبھی عورت کی آواز میں بولتا ہے، میں نے کئی پنڈت کو دکھالیا ہے مگر کہیں سے آرام نہیں آیا۔"

قاری صاحب نے لڑکے سے پوچھا۔ "اس کا نام شنکر تھا۔ "ہاں شنکر!" کیا ہوا ہے تمہیں اور کہاں گئے تھے؟"

"جی ایک ہفتہ پہلے، غلطی سے لوگوں کا وہم سمجھتے ہوئے شکار کے لئے، اس علاقے میں چلا گیا تھا، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ ادھر بھوت اور چڑیلیں رہتی ہیں، وہاں جانا تو ایک طرف، اس جگہ کا نام سن کر لوگ خوف سے تھر تھر کانپتے ہیں، اور ڈر کی وجہ سے نہیں جاتے، اور پھر جو بھی ادھر جاتا ہے اس کی اگلے دن، لاش اس علاقے سے باہر ملتی ہے اور یہ بات سچ بھی ہے۔"

"تم زندہ کیسے بچ گئے؟" قاری صاحب نے کہا۔

"جب میں اس علاقے میں شکار کے لئے گیا تو میں نے دیکھا کہ ہر طرف لمبی لمبی جھاڑیاں اور کانٹے دار خودرو پودے، اور کہیں کہیں شیشم اور پیپل کے درخت تھے۔ کوئی انسان مجھے نظر نہ آیا۔ پرندہ بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ لیکن مجھے کوئی شکار نہ ملا، میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ اور پھر میں ایک پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

اچانک میری نظر جھاڑیوں اور درختوں سے ہوتی ہوئی ایک محل نما عمارت پر پڑی تو میں چونک پڑا کیونکہ اس عمارت سے دھواں نکل رہا تھا اور سیدھا اوپر کو جا رہا تھا۔ میں بڑا حیران تھا کہ یہ دھواں کیسا ہے؟

اچانک میرے سامنے نشانے پر ایک بڑا پرندہ آ بیٹھا، تو میں بڑا خوش اور میں نے اس کا ابھی نشانہ باندھا ہی تھا کہ وہ پرندہ اچانک وہاں سے غائب ہو گیا اور میں بڑا حیران ہوا۔ اچانک وہ پرندہ پھر ظاہر ہوا تو میں نے پھر نشانہ باندھا مگر پھر وہ غائب ہو گیا تو میں ڈر گیا۔ اور خوفزدہ ہو کر خوف سے کانپنے لگا...... کیونکہ جس پیپل کے نیچے میں بیٹھا ہوا تھا اس پر سے نسوانی آواز میں قہقہے لگانے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے اوپر دیکھا تو کچھ نہیں تھا۔ لیکن قہقہے مسلسل سنائی دے رہے تھے۔ اور پھر خوفزدہ ہو کر میں نے دوڑ لگا دی۔ ابھی میں تھوڑا ہی آگے بڑھا تھا کہ میرے پاؤں جیسے جکڑ گئے اور کسی نادیدہ قوت کی نسوانی آواز سنائی دی۔

"تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یہاں آنے کی۔ کوئی ادھر آ کر زندہ واپس نہیں گیا۔ مگر تمہیں زندہ چھوڑنا ہماری مجبوری ہے لیکن تمہیں یہاں آنے کی سزا

گی۔"

ں خوفزدہ ہو کر پھر دوڑنے لگا، راستے میں میں ں بار گرا، پھر گھر پہنچا تو میرا بہت برا حال تھا۔ پھر آدھی رات کے وقت جب میں سویا ہوا تھا تو کسی نے مجھے جگایا۔ میں اٹھا تو میرے سامنے ایک بدشکل چڑیل کھڑی تھی، جس کے لمبے لمبے بال، لمبے لمبے دانت اور بڑی بڑی بھیانک آنکھیں تھیں، ہونٹ تو اتنے بڑے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ میں چیخنے لگا اور پھر اسی چڑیل نے مجھے بالوں سے پکڑا اور زمین سے کئی فٹ اوپر اٹھایا اور پھر زور سے زمین پر پھینک کر غائب ہوگئی، اس دن سے خاص کر رات میں روزانہ وہ چڑیل مجھے کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور پہنچاتی ہے۔" یہ بول کر شنکر خاموش ہوگیا۔

قاری صاحب نے شنکر کی ساری بات سن کر مجھے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔" شنکر کا ہاتھ تھام کر کچھ پڑھنے لگے، کافی دیر تک وہ پڑھتے رہے کہ اچانک اس لڑکے کو جھٹکا لگا اور وہ ہلنے لگا۔ قاری صاحب نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟" اب عورت کی آواز آ رہی تھی۔

"میں اپنا نام نہیں بتاؤں گی۔" لڑکے کے منہ سے نسوانی آواز نکلی۔

"تجھ کو بتانا ہوگا۔" یہ بول کر قاری صاحب پھر پڑھنے لگے۔

اچانک وہ رونے لگی تو قاری صاحب نے پھر پوچھا۔

"ہاں اب بتا کیا نام ہے تیرا۔"

"پہلے پڑھنا بند کرو، پھر بتاتی ہوں۔" یہ سن کر قاری صاحب نے پڑھنا بند کردیا۔ "میرا نام دیویہ ہے۔"

"کیوں اسے تنگ کر رکھا ہے۔" قاری صاحب بولے۔

"یہ ہمارے علاقے میں داخل ہوا تھا، اس لئے۔" جواب ملا۔

"لیکن یہ تو کوئی جرم نہیں ہے، یہ تو خدا کی زمین ہے اور ویسے بھی...... یہ تمہارے علاقے سے کوئی چیز نہیں لایا تھا...... اس لئے اب اس کی جان چھوڑ دے، اب اسے کافی سزا مل چکی ہے۔"

"میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔" شنکر کے منہ سے نسوانی آواز نکلی۔

"چڑیل ایک بات بتاؤ جو بھی...... تمہارے علاقے میں جاتا ہے...... تم سب اسے جان سے مار کر...... اگلے دن اپنے علاقے سے باہر...... پھینک دیتی ہو...... لیکن تم نے اسے نہیں مارا؟"

"ایک مجبوری نے ایسا کرنے سے روک لیا تھا۔"

"مجبوری کیسی؟" قاری صاحب نے پوچھا تو اس نے...... یہ بتا کر حیران کردیا کہ "ہم نے اسے اس لئے...... زندہ چھوڑ دیا کیونکہ یہ ہمارے ہی مذہب کا تھا...... یہ بھی ہندو ہے اور ہم بھی...... جن کو ہم مار دیتے ہیں وہ مسلمان ہوتے ہیں...... ہم مسلمان کے جسم کا...... خون پی کر اپنے علاقے سے...... باہر پھینک دیتے ہیں۔" چڑیل کی آواز سنائی دی۔

"میں تجھ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا......" قاری صاحب تیز آواز سے بولے۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگے۔

"جوں جوں...... قاری صاحب قرآنی آیات پڑھتے گئے تو چڑیل...... چیخنے چلانے لگی...... اور...... اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگی......

"بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو...... آئندہ کسی بھی مسلم کو نہیں ماروں گی۔"

"میں تجھے زندہ...... نہیں چھوڑوں گا۔" قاری صاحب نے آنکھیں کھول کر کہا اور قرآنی آیات پڑھنے لگے کہ اچانک چڑیل نے کہا۔ "تم جو کچھ...... پڑھ رہے ہو تم کو اسی کا واسطہ! مجھے چھوڑ دو۔" یہ سنتے ہی قاری صاحب نے پڑھنا بند کردیا اور بولے۔

"جس کا تو نے واسطہ دیا ہے...... اس کے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔ میں تجھ کو چھوڑتا ہوں...... لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ تو اس لڑکے کو تنگ نہیں کرے گی۔ اور چلی جائے گی۔ اور آج کے بعد تم کسی بھی مسلم کو نہیں مارو گی۔"

''میرا...... وعدہ ہے آئندہ...... بھی کسی مسلم کو نہیں ماروں گی اور نہ ہی اس لڑکے کے...... پاس آؤں گی۔'' چڑیل بولی تو قاری صاحب نے اس لڑکے کا ہاتھ چھوڑ دیا...... تو وہ لڑکا بے ہوش ہوگیا...... کچھ دیر کے بعد وہ ہوش میں آیا...... تو وہ...... اپنی ہی زبان میں بول رہا تھا۔ قاری صاحب...... رام داس سے بولے۔

''لے جاؤ اپنے بیٹے کو اب یہ...... بالکل ٹھیک ہے آئندہ کوئی چڑیل اسے تنگ نہیں کرے گی۔''

رام داس اپنے بیٹے کو لے کر چلا گیا جبکہ میں قاری صاحب کے کندھے دبانے لگا۔

☆......☆......☆

ہندو...... مسلم فسادات...... بڑھتے جارہے تھے اور یہ خبریں بھی...... آرہی تھیں کہ مسلمان...... ہندوستان کو چھوڑ کر...... ہمیشہ کے لئے...... پاکستان جانا شروع ہوگئے ہیں اور ہندوؤں...... سکھوں نے ان مسلمانوں کو جو پاکستان کی طرف جارہے ہیں...... ان کو مارنا شروع کردیا ہے......

میں گھر میں...... بیٹھا ہوا تھا اور تمام گھر والے مشورہ کررہے تھے کہ تمام مسلمان پاکستان جانا شروع ہوگئے ہیں! اب ہم سارے محلے والوں کو بھی پاکستان کی تیاری کرنی چاہئے۔ ابو نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں کل ہی...... مسجد میں تمام لوگوں سے بات کرتا ہوں۔''

''میں...... اور میری بہنیں بہت خوش تھیں کہ ہم اپنے نئے وطن پاکستان...... جائیں گے۔

اگلے دن ابو نے تمام لوگوں سے بات کی اور فیصلہ ہوا کہ آج ہی تمام تیاریاں مکمل کرلیں...... اور کل رات پاکستان کا...... سفر شروع کردیں گے۔

پاکستان کی سرحد ہمارے...... قصبے سے...... تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر دور تھی۔ آج رات ہمارے...... پورے...... محلے نے ہندوستان ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا تھا۔ اور پاکستان چلے جانا تھا۔ رات ہوئی تمام محلے والے...... ایک جگہ اکٹھے ہوئے، تمام عورتوں کو اکٹھا کیا گیا...... اور پھر تقریباً...... رات کے دس بجے ہم سب نئے وطن کے لئے نکل پڑے...... آدھے مرد آدھے پیچھے تھے۔ جبکہ عورتیں درمیان میں تھیں۔ مختصر یہ راستے پر چل پڑے۔ جو پاکستان کو جاتا تھا۔

ہم سب آہستہ آہستہ...... پاکستان...... کی باتیں کرتے جارہے تھے۔ ہم کو چلتے ہوئے تقریباً تیس چالیس منٹ ہوچکے تھے۔ اور ہم نے تقریباً پانچ کلومیٹر فاصلہ طے کرلیا تھا۔

اچانک میں نے امی اور بہنوں سے پوچھا۔

''کیا آپ نے سامان میں میرا قرآن...... مجید بھی رکھ لیا تھا؟''

''ہم نے تو نہیں رکھا...... ہمیں تو علم ہی نہیں تھا کہ ہم قرآن مجید لے آئے تھے۔ اور کہاں رکھا تھا۔''

میں پریشانی سے مردوں کے ساتھ چلنے لگا، تاکہ ابو کو شک نہ ہو، جب میں نے دیکھا کہ ابو لوگوں سے باتیں کررہے ہیں تو میں قافلے سے بچھڑ گیا اور واپس گاؤں کی طرف دوڑ لگادی، اگر میں امی ابو کو بتاتا تو شاید وہ مجھے واپس نہ آنے دیتے اور میں اپنا قرآن مجید ہر قیمت پر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہندو لوگ قرآن مجید کی بے حرمتی کرسکتے تھے۔ میں جتنی تیزی سے بھاگ سکتا تھا۔ بھاگ رہا تھا تاکہ جلد سے جلد قرآن مجید لے کر پھر قافلے سے مل سکوں، تیز دوڑتے دوڑتے میرے پیٹ میں درد ہورہا تھا لیکن میں تمام درد کو فراموش کرکے دوڑا جارہا تھا اور تقریباً بیس منٹ میں گھر پہنچ گیا، تمام محلہ سنسان پڑا ہوا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا اور الماری سے قرآن مجید لیا اور باہر نکلنے کے لئے ابھی دروازے تک آیا ہی تھا کہ میں لرز اٹھا۔

پانچ، چھ بلوائی گھر کی دیوار پھلانگ کر ہمارے گھر میں داخل ہورہے تھے۔ میں باہر بھی...... نہیں بھاگ سکتا تھا۔ قرآن مجید میرے ہاتھ میں تھا...... میں واپس کمرے میں گیا اور اندر والے دروازے سے دوسرے کمرے میں گیا لیکن میں کمرے میں چھپ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ کمروں میں تو وہ تلاش کرلیں گے، میں تیزی سے اس کمرے سے باہر نکلا، اس طرف اندھیرا تھا

بلکہ وہ لوگ دوسرے کمرے کی طرف تھے۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا...... اس جامن کے درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ جو گھر کے ایک طرف تھا یہاں مکمل اندھیرا تھا۔ میں جامن کے...... موٹے تنے کے ساتھ کھڑا ہو کر ان کو دیکھنے لگا۔ وہ کبھی باہر، کبھی اندر کمروں میں جارہے تھے۔ ایک آدمی کی آواز آئی۔ ''یار یہ تمام مسلے نہ جانے کب بھاگ گئے۔ ہمارا منصوبہ تو ناکام ہوگیا۔'' اس کے علاوہ مسلمانوں کی عورتوں کے بارے میں اپنے بے ہودہ خیالات اور منصوبوں کی باتیں کررہے تھے۔ میں خاموشی سے کھڑا قرآن مجید ہاتھ میں تھامے ان کی واہیات باتیں سن رہا تھا۔ ایک نے کہا۔ اس مولوی (میرے ابو) اور اس کے گھر والوں کو برباد کرنا، تو میری دلی خواہش تھی، اس نے، ہم کو بڑا ستایا تھا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''اگر ہم ہمت کر کے تیزی سے ان کا پیچھا کریں، تو ہماری ہر خواہش، اب بھی پوری ہوسکتی ہے۔'' میں ان کی یہ بات سن کر کانپ اٹھا، پھر وہ سب باہر چلے گئے۔ جب میں مطمئن ہوگیا کہ وہ دور جاچکے ہوں گے تو میں جامن کے نیچے سے نکلا اور پھر کمرے میں داخل ہوا اور وہاں پڑے ہوئے ایک کپڑے کو اٹھایا۔ اور قرآن مجید والماری میں رکھا اور میں نے قمیض اتاری۔ نیچے میں نے بنیان پہنی ہوئی تھی۔ پھر میں نے قرآن مجید تھاما، اور اس کو اچھی طرح غلاف میں مضبوطی سے باندھا اور اس کپڑے کی مدد سے میں نے قرآن مجید سینے پر باندھ لیا، اور اوپر قمیض پہن لی، تاکہ بلوائی مجھے اگر پکڑ بھی لیں تو قرآن مجید کو نہ دیکھ سکیں، اور بے حرمتی نہ کرسکیں، پھر میں کلمہ طیبہ کا ورد کرتا ہوا آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکلا اور پھر انتہائی احتیاط سے باہر والے دروازے کے پاس پہنچا، وہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے باہر جھانکا اور مجھے گلی میں کوئی فرد محسوس نہ ہوا، تو میں آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق رات کے بارہ بجنے والے ہوں گے۔ میں انتہائی احتیاط سے چلتا ہوا گاؤں سے باہر نکل آیا۔ اور تیزی سے، اس راستے پر دوڑنے لگا

اس سادگی پہ

ہائی وے پر نہایت تیز رفتاری سے جاتے ہوئے ایک صاحب کی گاڑی کو ٹریفک سارجنٹ نے کافی دیر تعاقب کرنے کے بعد روکا تو وہ صاحب انجان اور معصوم بنتے ہوئے بولے۔

''مجھے کس لیے، روکا ہے؟ اس سے پہلے تو کبھی مجھے اس طرح نہیں روکا گیا؟''

''جی ہاں...... میرا بھی یہی خیال ہے......'' سارجنٹ نے، دانت پیس کر کہا۔

''اس سے پہلے جس نے بھی آپ کو روکا ہوگا گاڑی کے پچھلے ٹائروں پر گولی چلا کر ہی روکا ہوگا۔''

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

جس راستے پر ہمارا قافلہ گیا تھا۔ اچانک میرے پیچھے سے ایک مردانہ آواز آئی۔

ارے دلیر سنگھ وہ دیکھو کوئی بھاگا جارہا ہے، لگتا ہے کوئی مسلا ہے۔'' وہ لوگ مجھ سے تھوڑا ہی فاصلے پر میرے پیچھے پیچھے بھاگتے آرہے تھے...... میں پوری رفتار سے بھاگتا رہا وہ مجھے للکارتے ہوئے اور تمام مسلمانوں کو گالیاں دیتے ہوئے میرے تعاقب میں تھے لیکن، کافی دور تک، بھاگنے تک بھی وہ میرے نزدیک نہ آسکے، فاصلہ ان کی آوازوں سے اتنا زیادہ بھی نہیں لگتا تھا۔ لیکن شاید میری اور ان کی رفتار ایک جیسی تھی۔ ایک آواز آئی۔

''تجھے چھوڑیں گے نہیں اور نہ ہی ان مسلوں کو جو بھاگ گئے ہیں۔'' ان کی اس بات سے میں مزید خوفزدہ ہوگیا۔ مگر بھاگتا رہا، اور اچانک میرے ذہن میں ایک بات بجلی کی طرح آئی، میں دوڑتے دوڑتے سوچنے لگا، کہ میں تو اسی راستے پر، بھاگ رہا ہوں جس راستے پر قافلہ جارہا ہے۔ اس طرح تو، میں خود ہی، اپنے قافلے کو پکڑوا دوں گا۔

''نہیں بلوائیوں کو اپنے قافلے تک نہیں پہنچنے دوں گا۔'' میں نے فیصلہ کرلیا۔ ''میں خود تو مرجاؤں گا مگر قافلے کو ضرور بچاؤں گا۔'' اور یہی سوچتے ہوئے میں نے اپنا رخ اگرچہ پاکستان کی طرف ہی تھا مگر سیدھا مغرب کے بجائے شمال مغرب کی طرف کرلیا اور میرا یہ فیصلہ درست، ثابت ہوا، لیکن اچانک مجھے جھٹکا لگا میں جس طرف بھاگ رہا تھا اس طرف کانٹے دار پودوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا میں پریشان ہوگیا اچانک مجھے آواز سنائی دی۔

''ارے دیکھو وہ تو بھوت ۔۔۔ محل کے علاقے میں داخل ہو چکا ہے۔'' یہ الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے تو میرے قدم رک گئے۔

''کیا۔۔۔؟ میں بھوت محل کے علاقے میں آگیا ہوں۔'' میں واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ البتہ انتہائی خوف کی حالت میں، میں نے جنوب کی طرف دوڑ لگادی۔ اور دوڑتے دوڑتے میں گر پڑا۔ لیکن میں نے قرآن مجید کو جو میرے سینے سے بندھا ہوا تھا۔ نیچے زمین پر لگنے نہ دیا۔ میں دوڑتے ہوئے خوف سے کانپ رہا تھا، مجھے محسوس ہورہا تھا کہ جھاڑیوں میں بھاگنے سے میرے جسم پر چھوٹے چھوٹے کٹ لگنے سے خون بہہ رہا ہے اور مجھے سخت درد ہورہا ہے۔ میں نے ہمت کی اور پھر دوڑنے کے لئے اٹھا اور جب اٹھ کر سیدھا ہوا تو میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ میرے سامنے ایک درخت تھا اور اس درخت کے نیچے روشنی ہورہی تھی اور اس روشنی میں انتہائی خوفناک اور ہیبت ناک کوئی مخلوق کھڑی تھی۔ وہ شاید چڑیلیں تھیں۔ کیونکہ ان کے لمبے لمبے بال تھے جیسے عورتوں کے ہوتے ہیں ان کی تعداد چار تھی۔ ایک چڑیل کے جسم پر بال ہی بال تھے۔ دوسری کی بڑی بڑی آنکھیں اور بڑی سی ناک تھی۔ بڑے بڑے ہونٹ تھے اور ان ہونٹوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ تیسری کافی لمبی تھی اور وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ اس ڈھانچے سے تیز شعلے نکل کر میری آنکھوں کو چندھیا رہے تھے اور چوتھی بھی بہت خوفناک تھی۔ اس کی کھوپڑی پیالہ نما تھی اور اس پیالہ نما کھوپڑی میں آگ جل رہی تھی۔ میں یہ سب دیکھ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخنے چلانے لگا۔ خوف سے میری جان نکل رہی تھی اور اچانک میرے ذہن کو خوف کا انتہائی زبردست جھٹکا لگا، میں وہیں پر گر پڑا پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

میں ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے اردگرد روشنی ہی روشنی ہے۔ آگ ہی آگ جل رہی تھی، یا شاید کوئی پرانا محل تھا میں زمین پر پڑا ہوا تھا اور میرے اردگرد خوفناک جن بھوت چڑیلیں اور بلائیں کھڑی تھیں اور ان کے قہقہوں سے میرے کان پھٹے جارہے تھے۔

اچانک ایک زوردار آواز گونجی۔ اور تمام قہقہے بند ہوگئے، میں نے اس کی طرف دیکھا تو میں خوف سے چیخ پڑا کیونکہ میرے سامنے ایک خوفناک چڑیل ایک خوب صورت تخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس چڑیل کے بڑے بڑے کان، لمبے لمبے بڑی بڑی آنکھیں اور زبان اتنی بڑی کہ وہ منہ سے باہر نکلی پڑی تھی۔

اس کی آواز سنائی دی۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ جو ہمارے علاقے میں آجائے اور وہ بھی مسلمان تو وہ زندہ واپس نہیں جاتا۔ اس کے خون سے میں اور میری رعایا اپنی پیاس، بجھاتی ہے۔''

میں کوئی جواب دینے کے بجائے روئے جارہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔

''کیا تم کوئی جادوگر ہو کہ ہم جیسی طاقت بھی تم کو نہیں چھو سکتی۔ لگتا ہے تمہارے پاس کوئی علم ضرور ہے

درتم نے یہ سینے پر کیا باندھ رکھا ہے۔

میں نے کہا۔ ”میرے پاس تو کوئی علم نہیں۔“

البتہ میرے سینے سے قرآن مجید بندھا ہوا ہے اور اس میں اتنی طاقت ہے کہ تمام بھوت چڑیل اسے چھوتے ہی جل مریں گے۔“ میری بات سن کر وہ چڑیل اچنبھے میں پڑ گئی۔ پھر ایک ایک کر کے کئی نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی وہ جیسے ہی مجھے پکڑنے کے لئے میرے جسم کو ہاتھ لگاتیں تو جھٹکا کھا کر دور جا گرتیں۔ یہ دیکھتے ہوئے وہ سب کی سب مجھ سے دور ہٹ گئیں۔

ان چڑیلوں کا ہر وار خطا ہو رہا تھا۔ اب مجھ میں تھوڑی سی ہمت پیدا ہو گئی تھی، ان کی سردار چڑیل کو شاید بہت غصہ آیا وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی۔ ”اسے زیر کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اسے سبق سکھانا پڑے گا۔“

اب مجھے پکا یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور قرآن مجید کی وجہ سے ان کا ہر وار خطا ہو رہا ہے۔ پھر وہ تابڑ توڑ مجھ پر وار کرنے لگیں تو میں اتنا بدحواس ہوا کہ آیت الکرسی پڑھنا بھول گیا اور شاید یہی میری غلطی تھی، ان چڑیلوں نے مجھے پکڑ لیا اور اوپر اٹھانے لگیں، تقریباً بیس فٹ اوپر لے جا کر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا، میں چیخ رہا تھا مجھے اپنی موت واضح دکھائی دے رہی تھی اور پھر وہ کچھ ہوا جس کا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جونہی میں زمین کے قریب پہنچا مجھے جیسے کسی نے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ ہوا اور آرام سے زمین پر رکھ دیا۔ مجھے کچھ نہ ہوا تو وہ سب حیران و پریشان مجھے دیکھنے لگیں اور میں اس غیبی امداد پر حیران تھا۔

اچانک ایک چڑیل کی آواز آئی۔ ”سب مل کر حملہ کرو، اور اس کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالو۔“ پھر اچانک بے شمار چڑیلیں میرے اردگرد آ گئیں، میں خوف سے چیخ رہا تھا اور پھر تمام چڑیلیں مجھے پکڑنے کے لئے آگے بڑھیں اور جونہی وہ میرے قریب پہنچیں، ایک زوردار نسوانی آواز فضا میں گونجی۔ ”ٹھہر جاؤ۔“ اور سب کی سب ٹھہر گئیں۔ اور اس آواز کی طرف دیکھنے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ ایک خوف ناک چڑیل تخت پر بیٹھی ہوئی اپنی سربراہ چڑیل کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے۔

”شگنی جی؟“ میں جانتی ہوں میری بات آپ کو بری لگے گی اور آپ کو غصہ آئے گا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ اس لڑکے کو ختم نہیں کر سکتیں۔“

”کیا مطلب، یہ اکیلا ہی ہم سب سے طاقتور ہے؟“ سردار چڑیل شگنی نے غصے سے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”شگنی جی، میں اس لڑکے کو پہلے سے جانتی ہوں اور دیکھ چکی ہوں۔ پچھلے دنوں جب میں آپ کے حکم سے ایک ہندو لڑکے کو تنگ کرنے پر مامور ہوئی تھی تو وہ علاج کے لئے ایک مولوی سے جو مدرسے میں پڑھاتا تھا اس کے پاس گیا تھا، وہ مولوی بھی قرآن پڑھاتا تھا، شگنی جی یہ قرآن مجید نہ جانے کتنا طاقتور ہے، اس مولوی نے نہ صرف مجھے پکڑ لیا بلکہ جوں جوں وہ قرآن پڑھتا تھا میری جان نکلی جاتی تھی۔ میں نے تو اس وقت اس کو اس قرآن کا واسطہ دے کر اس سے جان چھڑوائی تھی اور میں نے اس لڑکے کو اسی مولوی کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ اسی مولوی کا شاگرد ہے۔“

”یہ ہمارا نشانہ کیوں نہیں بن رہا؟“ شگنی بولی۔

”کیونکہ یہ نہ صرف مقدس کتاب پڑھتا ہے بلکہ اس وقت مقدس کتاب اس کے سینے پر بندھا ہوا ہے، میرا مشورہ یہی ہے کہ اپنے ساتھی اور ان کی طاقت ضائع نہ کریں۔“ یہ سن کر چڑیل شگنی سوچ میں پڑ گئی اور بولی۔ ”لگتا ہے تو ٹھیک کہتی ہے۔ کل پونم کی رات ہے اور اہم مسئلہ ہے۔“ گرو کے سامنے یہ مسئلہ رکھیں گے۔“

یہ سن کر میں قدرے مطمئن ہو گیا کہ ”چلو کم از کم اس وقت تو جان چھوٹی، کل جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ میں اس چڑیل کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے مجھ پر مزید حملہ کرنے سے روکا تھا۔ اور جس کو چند دن پہلے ہندو لڑکے میں قاری صاحب نے قابو کیا تھا اس کی رحم دلی صاف نظر آ رہی تھی اور حقیقت میں وہ میری مدد کرنا چاہتی تھی۔

اور پھر اس چڑیل نے میری طرف دیکھا اور مسکراتی ہوئی ایک طرف کو چل دی۔

مجھے ایک سیاہ کمرے میں بند کر دیا تھا۔ جہاں سے خوفناک آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے بہت پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن یہاں پانی کہاں سے ملتا، میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت لڑکی کمرے میں داخل ہوئی تو کمرہ روشنی سے جگمگا اٹھا۔

''تم نے پانی کی خواہش کی، تمہارے لئے پانی اور کھانا بھی حاضر ہے۔'' اس نے میرے سامنے پانی اور کھانا رکھ دیا۔

مجھے بھوک اور پیاس لگی ہوئی تھی، ابھی میں نے پانی کا گلاس منہ سے لگانا چاہا کہ میرے کان میں سرگوشی ہوئی۔ ''پانی اور کھانا نہ کھانا، کھانے میں اور پانی میں زہر ملا ہوا ہے۔'' یہ سنتے ہی میں نے پانی کا گلاس خوف سے نیچے رکھ دیا اور اس لڑکی کو پانی اور کھانا لے جانے کو کہا۔ تو وہ حیران ہوئی، اس نے بہت اصرار کیا، لیکن میں نے نہ پانی پیا اور نہ ہی کھانا کھایا تو وہ چلی گئی۔ اور میں بہت حیران ہوا کہ میرے کان میں سرگوشی کس نے کی تھی۔ پھر رات گزری، اور میرا دن بھی بہت تکلیف میں گزر گیا۔ پیاس اور بھوک سے میرا برا حال تھا۔

لیکن جب بھی کھانا اور پانی مجھے دیا جاتا یہی سرگوشی ہوتی کہ ''پانی اور کھانا نہ کھانا، اس میں زہر ہے۔'' ایک وقت تو میرے دل میں خیال آیا کہ یہ مجھے جان بوجھ کر کہا جارہا ہے تاکہ میں کھانا اور پانی سے دور رہوں اور بھوک، پیاس سے مرجاؤں۔

بہرحال رات آگئی مجھے کمرے سے باہر ایک پنجرے میں بند کر دیا گیا، آج چودہویں رات تھی، چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میرے سامنے بے شمار بھوت اور چڑیلیں آنے لگیں، اور بہت زیادہ دھما چوکڑی ہوئی پھر وہ آہستہ آہستہ وہاں سے چلی گئیں اور میں تنہا رہ گیا، تقریباً دس منٹ تک میں ایسے ہی بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہا میں اس وقت وہاں اکیلا تھا اور پھر اچانک میں خوفزدہ ہو گیا، میرے اردگرد زمین سے دھواں نکلنے لگا پھر ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اور تیز ہوا شروع ہوگئی اور آہستہ آہستہ اتنی تیز ہوگئی کہ اس نے آندھی کی شکل اختیار کر لی، دھواں بہت اونچائی تک چلا گیا تھا۔ تیز ہوا اور دھوئیں سے میرا کھانس کھانس کر برا حال ہو رہا تھا کہ اچانک میرے پاس ہلکی سی نسوانی آواز آئی۔

''احمد؟ گھبرانا نہیں، میں تمہاری ہمدرد ہوں، میں تمہیں آزاد کرانے آئی ہوں، میں اپنی جان کی بازی لگا کر بھی تم کو بچاؤں گی۔ چلو میرے ساتھ۔''

میں نے خوف سے کہا۔ ''تم کون ہو، اور مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہو۔''

اس کی دوبارہ آواز آئی۔ ''وقت ضائع نہ کرو چلو میرے ساتھ مجھے اجازت دو کہ میں تمہارا ہاتھ تھام لوں، اور تمہیں یہاں سے دور لے جاؤں۔''

میں نے خوف سے ہاتھ آگے کر دیا شاید وہ ڈر رہی تھی کہ مجھے چھونے سے اسے نقصان ہو سکتا ہے اس لئے اس نے پہلے مجھ سے میرا ہاتھ تھامنے کی اجازت مانگی تھی، میرے ہاتھ آگے کرتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرا کسی نے ہاتھ تھام لیا ہو۔

میرے ہر طرف دھواں تھا اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم مجھے ضرور مارنے آئی ہو۔'' اچانک میرے سامنے ایک خوب صورت لڑکی ظاہر ہوئی۔

''کون ہو تم؟''

''میں وہی لالی ہوں جس نے تم کو تمہارے استاد کے ساتھ دیکھا تھا اور تمہارے کان میں سرگوشی بھی میں نے ہی کی تھی۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے سوال کیا تو اس نے کہا۔ ''تمہارے استاد نے تمہارے سامنے مجھے زندہ چھوڑ دیا تھا اور میں اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتی ہوں دوسرا یہ کہ میں تمہاری مقدس کتاب سے متاثر ہوئی ہوں، اس مقدس کتاب کی وجہ سے ابھی تک تم زندہ ہو

اگر یہ کتاب تمہارے پاس نہ ہوتی تو اب تک تمہارا وجود نہیں ہوتا۔"

پھر اس نے کہا۔ "اپنی آنکھیں بند کرلو۔" میں نے آنکھیں بند کرلیں تو اس نے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا۔ "پاکستان، جہاں مہاجرین ہوں گے وہاں میں اپنے ماں باپ کو تلاش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے میرے پاؤں زمین سے اٹھنے لگے، میں خوف سے چیخنے والا ہی تھا کہ اس نے کہا۔ "بالکل خاموش رہو۔ تم کو کچھ نہیں ہوگا۔" تو میں خاموش ہوگیا اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد اس نے کہا۔ "پاکستان آ گیا ہے اور ہمارے نیچے مہاجرین کے کیمپ لگے ہوئے ہیں۔

اب میں تم کو ایک طرف اتارتی ہوں، پھر میں نے واپس بھی جانا ہے۔

"تم واپس جاؤ گی تو وہ تم کو ختم کردیں گے۔"

"مجھے اپنی جان کی فکر نہیں ہے تمہاری جان بچا کر مجھے خوشی ہورہی ہے۔" اور پھر اچانک اس نے کہا۔ "ارے ماری گئی وہ تو میرے پیچھے آرہے ہیں۔" پھر اس نے جلدی سے مجھے ایک طرف زمین پر اتارا اور بولی۔ "اگر انہوں نے مجھے پکڑ لیا تو وہ مجھے تڑپا تڑپا کر ماریں گے اس لئے روز روز کے مرنے سے بہتر ہے کہ ایک مرتبہ ہی ختم ہوجاؤں۔" پھر وہ بولی۔ "مجھ پر مہربانی یہ کرو کہ میرے سر کے بالوں میں لگے ہوئے اس پھول کو نکال کر پتی پتی الگ کردو۔"

میں نے انکار کردیا تو اس نے کہا۔ "میں نے تمہاری جان بچائی ہے اور اب تم مجھے روز روز مرنے سے بچاؤ۔"

اور پھر میں نے ڈرتے ڈرتے وہ پھول اس کے بالوں سے نکال لیا تو وہ عورت سے چڑیل کی شکل میں آ گئی۔ اور میں نے اس پھول کی پتیاں الگ الگ کردیں۔ میرے ایسا کرتے ہی وہ گر کر زمین پر ڈھیر ہوگئی، اور کچھ ہی دیر کے بعد اچانک اس کی لاش غائب ہوگئی۔

میں خوف سے ایک طرف دوڑ پڑا، اور مہاجرین کے کیمپ میں داخل ہوگیا، میں نے بھوت محل سے آزادی ملنے پر خدا کا شکر ادا کیا، کافی دیر تک میں خیموں میں گھومتا رہا، اپنے والد کو تلاش کرتا رہا، مجھے ایک عورت کے اونچا اونچا رونے کی آواز آئی تو میں اس طرف چل پڑا، میں اس کے قریب پہنچا، لالٹین روشن تھیں، میں نے دیکھا تو وہ میری والدہ تھیں، میں چیختے ہوئے ان سے لپٹ گیا، میرے اچانک آنے سے وہ بے قراری سے مجھے پیار کرنے لگیں، دوسرے لوگوں کو آوازیں دے دے کر پکارنے لگیں۔ سبھی لوگ اکٹھے ہوگئے اور مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، میرے ابو امی اور میری بہنیں مجھ سے لپٹی ہوئی تھیں، میں بھی خوب رویا۔ "کہاں چلا گیا تھا تو میرے بچے؟"

"بس امی میں یہ قرآن مجید لینے چلا گیا تھا تاکہ ہندو اس کو بے حرمتی نہ کریں اور امی ہم لوگ بہت اچھے وقت پر وہاں سے نکل پڑے تھے ورنہ ہندوؤں نے اسی رات ہمارے محلے پر حملہ کردیا تھا۔ امی جب میں واپس گھر گیا، تو ہندوؤں اور سکھوں نے پورے محلے پر حملہ کردیا تھا مگر وہ ہمارے نہ ملنے کی وجہ سے بہت غصے میں تھے، کچھ دور تک انہوں نے آپ لوگوں کا پیچھا بھی کیا؟ اللہ کا شکر ہے کہ میں بچ گیا اور ہمارا پورا قافلہ بھی، میں نے ان کو بھوت محل میں، اپنے ساتھ آنے والے واقعے کے بارے میں بالکل نہ بتایا۔ پھر میں نے سینے سے قرآن مجید کھول کر اسے چوم کر امی کو دیا تو امی نے بھی چوم کر دوسرے قرآن مجید کے ساتھ رکھ دیا۔

رات باتیں کرتے کرتے گزار دی صبح ہوئی تو دو دن کے بعد جی بھر کر کھانا کھایا اور پھر ہمارا قافلہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا، بہت کچھ کھو دینے کے باوجود قافلے کے ہر مسافر کے چہرے پر اپنے ملک پاکستان آنے پر عجیب سی خوشی تھی، فضا پاکستان زندہ باد، اسلام زندہ باد، کے نعروں سے گونج رہی تھی۔

☠

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 117

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

رولوکا کے منہ سے نکلا زالوشا...... چاہے تو کتنے ہی روپ بدل لے، میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا، رولوکا اس کے بعد اپنی گردن جھکا کر بیٹھ گیا، ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت دور کی سوچ رہا ہے اور پھر چند منٹ بعد ہی رولوکا نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا اب رولوکا کے سامنے زالوشا کی ساری حقیقت کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ زالوشا...... اس گاؤں میں سادھو کا روپ دھار کر کیوں بیٹھا ہے، دراصل زالوشا نے یہ سوچ لیا تھا کہ گاؤں والوں کو چند چمتکار دکھلا کر ان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالوں گا اور اس طرح میں آرام سکون سے پڑا رہوں گا اور پھر در پردہ اپنے دشمن رولوکا دینو بابا اور مانی کے خاتمے کے لئے کوئی مضبوط منصوبہ بندی مرتب کروں گا اور موقع ملتے ہی سب سے پہلے رولوکا جو کہ میرے اور اتمش کے درمیان کود پڑا ہے اسے ختم کردوں گا اور جب رولوکا ختم ہو جائے گا اس کے بعد اتمش اور مانی کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔ ان دونوں کو تو چٹکی بجا کر زندہ درگور کردوں گا۔ زالوشا...... جب درخت کے نیچے بیٹھ جاتا تو نہ جانے کدھر سے ایک بہت لمبا سانپ آکر زالوشا کی گردن میں لپٹ جاتا، ایک صبح رولوکا نے زالوشا...... کو مہاراج کے روپ میں درخت کے نیچے بیٹھتے ہی مہاراج کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کردیا اور ساتھ ہی مہاراج کی زبان بھی بند کردی اور پھر مہاراج کی گردن میں لپٹا سانپ اوپر کو اٹھنے لگا، وہ مزید لمبا ہوتا ہوا اپنا سر درخت کی ایک شاخ کے گرد لپیٹ لیا اور پھر اس نے اپنی دم مہاراج کی گردن میں سخت لپیٹ کر مہاراج کو اوپر کو اٹھانے لگا اور مہاراج اوپر کو اٹھنے لگے اب مہاراج بے سدھ ہو چکے تھے پھر اچانک زالوشا...... عرف مہاراج کے پورے دھڑ میں شعلے بھڑک اٹھے، مہاراج اچانک نیچے گر پڑے مہاراج کا پورا وجود بھڑکتے شعلوں میں غائب ہو چکا تھا، اس جگہ جمع سارے لوگ حیران و ششدر تھے کہ یہ ہوا تو کیا ہوا، اور پھر چند منٹ میں شعلے ختم ہو گئے تو لوگوں نے دیکھا کہ اس جگہ تھوڑی سی راکھ پڑی تھی کہ اچانک تیز ہوا چلی جس نے اس راکھ کو اڑا کر ختم کردیا اور درخت پر جو مہیب خوفناک اور دہشت ناک سانپ شاخ سے لپٹا پڑا تھا وہ بھی غائب ہو چکا تھا اور پھر سارے لوگ خوفزدہ اور اچنبھے کی حالت میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور اس طرح رولوکا نے زالوشا کے وجود کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔

(اب آگے پڑھیں)

واقعی یہ حقیقت ہے کہ جب وہ پیدا ہوئی تو سونے کے چمچ سے دودھ پیتی تھی، اس کے والد شرف الدین کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، ایسا لگتا تھا کہ جیسے دولت کی بارش ہوتی تھی، کہنے والے کہتے تھے کہ اگر وہ اپنی مٹھی میں مٹی لے لیتے تھے تو وہ مٹی سونا بن جاتی تھی۔

شروع شروع میں وہ شہر میں بہت تھوڑے سے دکانداروں کو پان سپلائی کیا کرتے تھے۔ شادی کے بعد جب اس کی پیدائش کے آثار پیدا ہوئے تو دولت گھر کی باندی بن گئی۔ ہر دکاندار کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ پان شرف الدین سے ہی خریدے۔

اور پھر ہوتے ہوتے کاروبار پھیلتے پھیلتے دوسرے ملکوں میں بھی ان کا پان جانے لگا۔ ایمانداری میں وہ اول نمبر تھے، اپنے کارندوں کو انہوں نے کہا تھا کہ کسی بھی طور پر پان کی ٹوکری میں ناقص پان جانے نہ پائے اور اگر ایسا ہوا تو جس نے بھی وہ پان پیک کیا ہوگا اس کی خیر نہیں۔ اور اگر غلطی سے بھی کوئی شکایت آ گئی تھی تو اس شخص کی نوکری سے چھٹی ہو جاتی تھی۔ جس نے وہ پان پیک کیا ہوتا تھا۔

بلا ناغہ کوئی پچاس کے قریب غریب غرباء میں

رات کے وقت کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ کوئی بھی سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔

جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا تو روزانہ ڈھائی تین سو لوگ افطاری اور کھانا کھاتے تھے اور پھر جب عید قریب آتی تھی تو اتنے ہی گھرانوں کو عید کے نئے جوڑے دیئے جاتے تھے۔

اور جب ایسا ہوتا تھا تو کون ایسا ہوگا جو دلی طور پر دعائیں نہ دیتا ہوگا، لوگ دامن پھیلا پھیلا کر شرف الدین، ان کے کاروبار میں ترقی اور گھرانے کے لئے دعائیں کرتے نہ تھکتے تھے۔

جب وہ پیدا ہوئی تو چندا آفتاب چندا ماہتاب، اس کی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے خاندان کی عورتیں عش عش کر اٹھتی تھیں۔ صبح دوپہر اور شام تینوں وقت اس کی نظر اتاری جاتی تھی۔

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اس کے نام پر غریبوں میں لاکھوں روپے تقسیم کئے جاتے تھے اور جس دن اس کا عقیقہ تھا اس دن جانے کتنے ہزار لوگ کھانے پر مدعو تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ بڑی ہوتی گئی۔ اس کے بعد شرف الدین کے گھر میں اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں لیکن خوبصورتی میں اس سے ذرا کم تھیں۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ بدصورت کہا جائے بلکہ وہ بھی اپنی مثال آپ تھیں۔

دادا دادی نے اس کا نام چندا رکھا تھا۔ دوسری کا نام خوشبو اور تیسری کا نام کرن تھا۔

ابھی وہ پانچ سال کی ہوئی کہ دیکھنے والے اس کی من موہنی صورت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے اور خاص طور پر لڑکیوں کی مائیں یہ سوچ بنا نہ رہتی تھیں کہ کاش! ہماری بچی بھی ایسی ہوتی۔

جب وہ پانچ سال کی ہوئی تو گھر میں ہی دینی دنیاوی تعلیم کا اہتمام کر دیا گیا۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ لڑکیوں کے اسکول بس اسے دنیاوی تعلیم کے لئے داخل کر دیا گیا۔

والد نے اس کے لئے ایک بہت ہی شاندار بگھی تیار کرائی۔ جس میں دو گھوڑے لگتے تھے، بگھی اتنی شاندار تھی کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے، بگھی کو کھینچنے والے دونوں گھوڑے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ سفید براق گھوڑے اپنی خوب صورتی میں بے مثال تھے۔

جب اپنی بگھی سے اسکول کے گیٹ پر وہ اترتی تو دیکھنے والی بچیاں یک ٹک اسے دیکھتی رہ جاتی تھیں۔ دیکھنے والی لڑکیوں میں یقیناً بہت ساری یہ ضرور سوچتی ہوں گی کہ ''کاش! ہماری قسمت بھی ایسی ہوتی۔'' اور پھر اسی طرح ہوتے ہوتے پہلی دوسری تیسری اور وہ ساتویں کلاس میں پہنچ گئی۔ اس کے جسم ہاتھ ایسے ہوگئے کہ دیکھنے والوں کی نظریں اس پر سے ہٹ کر نہ دیتی تھیں۔ جواں سال لڑکوں کی تو نیندیں حرام ہو کر رہ گئی تھیں۔

اکثر اسکول کی ٹیچرز اس کی اٹھتی جوانی کے لئے ضرور سوچتی رہتی تھیں۔ حالانکہ ابھی وہ جوان نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ابھی سے جواں سال لڑکیوں سے بہت آگے تھی۔ اکثر ٹیچرز کے دماغ میں یہ بات آتی کہ ''اللہ نہ کرے، ابھی یہ حال ہے اور جب یہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے گی تو کیا ہوگا۔''

تمام کی تمام عورتیں اپنے تئیں یہ دعا کرتیں کہ ''اللہ اس کی جوانی کی حفاظت کرنا۔''

اور بے شمار لڑکے ایسے تھے کہ جو کہ رات دن آہیں بھرتے نہ تھکتے تھے۔

اسکول کے سامنے سڑک کی دوسری جانب بہت ساری دکانیں تھیں۔ ان دکانوں میں ایک دکان ایسی بھی تھی جس میں بیڑی بنتی تھی۔ کئی نوجوان لڑکے دکان میں بیٹھے بیڑی بناتے تھے اور ان کی نظریں اسکول کے گیٹ پر ہی لگی رہتی تھیں۔ دونوں ہاتھ تو ان کے بیڑی بنانے میں چلتے رہتے تھے اور نظریں اسکول گیٹ کا طواف کرتی رہتی تھیں۔

جہاں چندا کی بگھی کے آنے کا وقت ہوتا تو حقیقت میں ان کی نظریں جیسے پتھرا کر رہ جاتی تھیں، بیڑی بنانے والے لڑکوں میں ایک لڑکا کمال نامی تھا وہ تو کچھ زیادہ ہی آہیں بھرا کرتا تھا، آہیں تو دیگر بھی بھرا

رہتے تھے مگر ایک حد تک۔

وہ سب کمال کو سمجھاتے۔ ''ارے، تو اپنے آپ کو دیکھ اور اس پری وش کو تو ایک معمولی بیڑی بنانے والا، بے تجھ سے اچھے تو اس کے ملازم ہیں۔ تو خواہ مخواہ کیوں خود کو ہلکان کرتا رہتا ہے۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھا کر، خدانخواستہ اگر تیری حرکت کے بارے میں کسی کو پتہ چل گیا یعنی کہ تو بسا اوقات آوازیں کستا ہے تو......کہیں تیری تکا بوٹی نہ ہو جائے۔''

یہ سن کر کمال اکثر بولتا۔ ''کاش! میں اس پر قربان ہو جاؤں......کاش! میں اندھا ہو جاؤں کہ اس کی قیامت ڈھاتی جوانی مجھے نظر نہ آئے، کاش! کہ میں دیوانہ ہو جاؤں......اگر یہ کہے تو میں واقعی اپنا دل نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دوں۔''

کمال کی باتیں سن کر اس کے ساتھی سوائے سہنے کے اور کیا کر سکتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''یہ تو پاگل ہو گیا ہے، یہ دماغی طور پر کھسک گیا ہے، ہمیشہ آدمی کو اپنی اوقات میں رہنا چاہئے۔'' بہر حال وہ سب کی سنتا اور کرتا اپنی......یعنی جب دیکھو وہ چندا کے نام پر آہیں بھرتا رہتا۔

ویسے چندا بھی اپنی خوبصورتی اور اٹھتی جوانی سے بے خبر نہیں تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ خود کو ''مس ورلڈ'' کے لئے منتخب کرا لیتی۔

اپنے کمرے میں ایستادہ وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور گھنٹوں اپنے سراپے پر نگاہیں جمائے رہتی، کبھی کبھی تو وہ خود اپنی ہی نظروں میں شرما جاتی۔ یہ بات حقیقت تھی کہ

سو بار بنا کر مالک نے سو بار مٹایا ہوگا
تب جا کر یہ حسن مجسم اس رنگ پہ آیا ہوگا

وہ اپنی خوبصورتی کے آگے اپنی دونوں بہنیں خوشبو اور کرن پر واجبی سی نظر ڈالتی اور من ہی من میں ساتویں آسمان پر پرواز کرنے لگتی۔

ذوق و شوق میں بھی وہ بہت آگے تھی۔ ایک ہفتہ میں اپنے گھر سے تھوڑی دور پارک میں ضرور جاتی تھی۔

اس پارک کی خوبصورتی بھی اپنی مثال آپ تھی، اس پارک کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جھاڑی دار پودوں کو اس طرح لگایا گیا تھا کہ انہیں تراش خراش کر مختلف جانوروں کا شیپ دیا گیا تھا۔ وہ اسے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا کہ ہاتھی، گھوڑے، گائے، بھینس، ہرن، زیبرا، شیر، مور اور دیگر جانور بھی بنائے گئے تھے، ہر ماہ ان کی پتیاں کاٹی اور چھانٹی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنی اصلی شیپ میں رہیں۔

اور یہی نہیں بلکہ قسم قسم کے پھولوں کی کیاریاں بھی تھیں۔ لہلہاتے اور خوشبو بکھیرتے پھول دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ جدھر چلے جاؤ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو معطر کرتی تھی۔

جھاڑیوں کو سیٹنگ کر کے بارہ دری بھی بنائی گئی تھی۔ اس کے اردگرد گلاب اور چنبیلی کے پھول زیادہ مقدار میں لگائے گئے تھے کہ اس بارہ دری میں بیٹھنے والا معطر خوشبو سے جیسے اپنے آپ میں نہیں رہتا تھا۔

اسکول سے چھٹی والے دن چندا خاص طور پر اس پارک میں جاتی اور ساتھ ہی اس کی دونوں بہنیں خوشبو اور کرن بھی ہوتی تھیں۔

چندا ادھر ادھر گھومتی اور پھر بارہ دری میں جا کر گھنٹوں بیٹھ جاتی اور بہنیں ادھر ادھر گھومتی رہتی تھیں، وہ دونوں بارہ دری میں زیادہ وقت نہیں بیٹھتی تھیں۔ وہ دونوں زیادہ تر دھوپ میں ہری ہری گھاس پر بیٹھ کر خوش ہوتی تھیں۔

ساتھ میں دو عمر رسیدہ ملازمہ بھی ہوتی تھیں۔ اور اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے دونوں ملازمائیں چندا، خوشبو اور کرن کو لے کر واپس آ جاتی تھیں۔

اکثر ان کے بابا اشرف الدین خاص طور پر چندا سے کہتے۔ ''بیٹا یہ ضروری تو نہیں کہ تم ہر ہفتہ پارک میں جاؤ اور گھنٹوں وہاں موجود رہو، دیکھو ناں تمہاری دونوں بہنیں خوشبو اور کران ہر ہفتہ تو نہیں جاتیں اور ایک تم ہو کہ خاص طور پر جانے کے لئے ضد کرتی ہو۔''

یہ سن کر چندا بولتی۔ ''بابا میں کیا بتاؤں......بس

آپ لوگ۔ یہ سمجھ لیں کہ جیسے میری روح پارک کے لئے بے چین رہتی ہے اور جب میں پارک میں پہنچ کر بارہ دری میں بیٹھ جاتی ہوں تو مجھے بہت زیادہ سکون ملتا ہے۔"

اس کے بابا بولتے۔ "چندا بیٹا! پارک کے علاوہ اور بھی مصروفیات ہوتی ہیں۔ مثلاً چھٹی والے دن گھر کے کسی کام میں خود کو مصروف رکھا کرو، چھٹی والے دن دیگر رشتہ دار آتے ہیں اور تمہارے متعلق پوچھتے ہیں اور جب انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ تم پارک میں گئی ہو تو دبے الفاظ میں باتیں کرتے ہیں...... بیٹی خود کو دیکھو اور گھومنا پھرنا وہ بھی پارک میں...... وغیرہ وغیرہ۔"

یہ سن کر چندا بپھر جاتی اور بولتی۔ "بابا مجھے رشتہ داروں سے کچھ لینا دینا نہیں...... بس میں اپنے شوق کی خاطر خود پر پابندی عائد نہیں کرسکتی...... میں تو پارک میں ضرور جاؤں گی۔"

یہ سن کر بابا کے ساتھ امی بھی بولتیں۔ "چندا بیٹا کوئی کسی کی زبان نہیں بند کرسکتا...... اور ویسے بھی بولنے والے ٹھیک ہی بولتے ہیں۔ ایک آدھ ہفتہ تم گھر میں رہا کرو...... تمہاری دونوں بہنیں بھی تو گھر میں رہتی ہیں...... وہ تو ضد نہیں کرتیں...... اور ایک تم ہو کہ......"

پھر چندا بولتی۔ "امی آپ فکر نہ کیا کریں...... اگر کوئی بولے تو بول دینا کہ وہ مجھ سے بات کرے اور میں اسے خود ہی جواب دے دوں گی۔"

ایک دن تو اس کی والدہ نے یہ تک کہہ دیا کہ "چندا بیٹا کبھی کبھی کسی کی نظر بھی لگ جاتی ہے...... تم ذرا احتیاط کیا کرو...... انسان ہی نہیں بلکہ نادیدہ مخلوقات بھی اسی دنیا میں رہتی ہیں۔"

یہ سن کر چندا جیسے چیخ پڑی۔ "امی آپ کس طرح کی دقیانوسی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ کچھ نہیں ہوتا...... دوسروں کے لئے میں اپنا شوق اور اپنی پسند کا گلا نہیں گھونٹ سکتی۔" اور یہ بول کر وہ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

خیر وقت دھیرے دھیرے آگے کو بڑھتا رہا اور چندا کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہوتا رہا......

اور پھر وہ وقت آ گیا جب اس نے جوانی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھ دیا۔

چندا جوان کیا ہوئی کہ دیکھنے والوں کی نظریں اس کے سراپے میں جیسے گڑ کر رہ گئیں۔

اور دیکھنے والوں کی نظریں اس کے سراپے میں گڑ نہیں کیوں ناں، اس پر جوانی کی برسات ایسی ہوئی تھی کہ آپے سے باہر، کالی زلفیں، رنگ سنہرا، گھٹنے تک آتی بل کھاتی ہوئی ناگن زلفیں، گدرایا ہوا جسم، کھلتا اور ایک انوکھا رنگ لئے چمکتا چہرہ، بڑی بڑی جھیل سے زیادہ گہری غزالی آنکھیں اور اس پر قیامت ڈھاتا جسمانی نشیب و فراز کہ بعض اوقات آئینہ کے سامنے اپنے سراپے پر نظر ڈال کر وہ خود بھی شرما جاتی تھی۔

پورے خاندان، پورا محلہ، بلکہ پورے شہر میں اس جیسی خوب صورت کوئی اور نوجوان لڑکی نہ تھی۔

اور پھر جس طرح ہر جوان لڑکی کے من میں دور دیس کا ایک گبرو جوان، بہادر، نڈر اور اپنی مثال آپ شہزادہ چپکے سے داخل ہوجاتا ہے اسی طرح چندا کے من مندر میں بھی ایک شہزادہ آن بسا تھا۔

اب تو اس کا من ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔

قرب و جوار کے کسی بھی نوجوان کی طرف وہ نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہ تھی۔ جوان لڑکے اس کے قریب آنے کے لئے، شہد کی مکھی کی طرح منڈلاتے نظر آنے لگے تھے اور خاندان کی بڑی بوڑھی دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کرنے لگی تھیں کہ "میں اپنے فلاں کے لئے کیوں نہ رشتہ لے لوں......"

مگر چندا کے والدین اور خاص کر اس کے بابا شرف الدین اپنی دولت و امارت کے پیش نظر یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ میرے جوڑ توڑ کا کوئی خاندان میں ہے نہیں۔

ایک دن شرف الدین کے بڑے بھائی آئے اور اپنے بیٹے کے لئے رشتہ کی بات کی تو شرف الدین نے جواب دیا۔ "بھائی صاحب ابھی چندا کی عمر ہی کیا ہے، ابھی تو اس کی پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی...... وہ

چاہتی ہے کہ کم از کم بی اے کرلے اور جب اپنی پڑھائی سے فارغ ہوگی تو پھر ہم کچھ سوچیں گے اور ویسے بھی اس کے دماغ میں شادی بیاہ کی کوئی بات نہیں ہے۔"

یہ سن کر بھائی بولے۔"شرف الدین میرا تو ارادہ ہے کہ صرف بات پکی ہوجائے...... شادی جب ہوگی تب ہوگی، اور مجھے بھی تو اتنی جلدی نہیں...... میں نے سوچا گھر کی بچی ہے گھر میں رہے تو زیادہ اچھا ہوگا۔"

شرف الدین بولے۔"بھائی صاحب! ایک روز چندا خود بول رہی تھی کہ ابو امی آپ لوگ یہ بات دماغ میں نہ لائیں کہ میں خاندان میں شادی کروں گی۔"

اور اس کی بات سن کر ہم میاں بیوی تو سوچ میں پڑگئے اور میں نے چندا کی ماں سے کہہ دیا کہ"بھئی جہاں یہ حامی بھرے گی وہیں اس کی شادی کردیں گے...... ویسے بھی اب دنیا کافی ترقی کرچکی ہے...... اور شادی بیاہ میں بچوں کی رضامندی بھی ضروری ہے۔

بھائی صاحب میری طرف سے تو انکار سمجھیں...... کیونکہ میں بچیوں کی خوشی میں مداخلت نہیں کروں گا۔ ویسے اگر خوشبو یا کرن کی بات کریں تو میں اس کے لئے ان کی رضامندی معلوم کروں گا۔ لیکن چندا کے لئے صاف صاف انکار ہے۔

بھائی صاحب میں مجبور ہوں...... چندا کی مرضی کے آگے......" اور یہ بول کر شرف الدین کہیں جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ادھر بھائی صاحب ٹکا سا جواب سن کر یاس و محرومی کے نڈھال قدموں کے ساتھ گھر چلے گئے۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو اترا ہوا چہرہ دیکھ کر گھر والے بخوبی سمجھ گئے کہ شرف الدین نے کیا جواب دیا ہوگا۔

اور جب سلمان کو خبر ملی کہ چاچا نے بابا کو مایوس کرکے واپس بھیج دیا ہے تو اس کے چھاتی پر جیسے سانپ لوٹنے لگا۔ اور پھر وہ زیر لب بڑبڑایا۔"چندا بیگم تم بھی کیا یاد کروگی کہ کسی دل والے سے پالا پڑا ہے۔ میں اپنے باپ کی بے عزتی کا ایسا بدلہ لوں گا کہ تمہاری سات پشتیں بھی تھرا اٹھیں گی۔ میں تمہیں زندہ درگور کرکے رکھ دوں گا، تمہیں اپنی خوبصورتی اور جوانی پر جو گھمنڈ ہے، میں تمہاری خوبصورتی اور جوانی کو ملیا میٹ کرکے رکھ دوں گا۔"

ویسے شرف الدین کے بھائی بھی کوئی گئے گزرے نہیں تھے وہ بھی کھاتے پیتے تھے۔

سلمان آزاد خیال اور اوباش دوستوں میں گھرا رہتا تھا۔ اپنے باپ کی بے عزتی پر ماہئی بے آب کی طرح تڑپنے لگا تھا، اور پھر ایک روز اس نے اپنے تمام دوستوں کی ہوٹل میں دعوت کی۔ سارے دوست خوش وخرم تھے لیکن سلمان مرجھایا مرجھایا تھا۔

کھانے پینے کے بعد دوستوں نے پوچھا۔"یار سلمان آج تیرا چہرہ مرجھایا ہوا ہے، تو ہر وقت خوش رہنے والا، آج بجھا بجھا سا کیوں ہے؟"

"یار کوئی خاص بات نہیں، بس ویسے ہی طبیعت میں تھوڑی سی سستی ہے۔"

لیکن سلمان کی باتوں پر کسی نے بھی یقین نہیں کیا اور سارے دوست اصرار کرنے لگے تو سلمان نے اصل مسئلہ بتادیا کہ" آج اس کے چاچا نے کس طرح اپنی بیٹی چندا کے رشتہ کے لئے اس کے والد کی بے عزتی کی ہے۔"

یہ سن کر اس کے دوست طیش میں آگئے اور بولے۔"سلمان تیرے چاچا اور چندا کی تو ایسی کی تیسی، تو بس حکم کر، ہم چندا کو زندہ درگور کردیتے ہیں۔ اگر چندا تیری نہیں ہوگی تو کسی اور کی بھی نہیں ہوسکتی، ہم اسے ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ پوری زندگی پل پل مرے گی اور جئے گی۔ اس کی خوب صورتی اور اس کی جوانی کو ہم سب ستیاناس کرکے رکھ دیں گے۔"

دراصل اندرونی طور پر سلمان تو یہی چاہتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں چاچا کے گھر پر حملہ کرکے چندا کو اٹھا لائیں اور بے عزت کرنے کے بعد اس کے چہرے پر خراشیں ڈال کر بدنما کردیں تاکہ چندا کو اپنی خوب صورتی ضائع ہونے کا غم زندگی کو اجیرن کردے۔

خیر تمام دوستوں نے اٹل فیصلہ کرلیا اور باہمی صلاح ومشورہ سے پروگرام طے ہوگیا کہ فلاں دن آدھی رات کے بعد گھر میں گھس کر پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے۔

ایک دوست بولا۔ "یار ایک مسئلہ ہے؟"

دوسرا فوراً بولا۔ "کیسا مسئلہ؟"

تو پہلا دوست نے جواب دیا۔ "بھئی مسئلہ یہ ہے کہ اس کے مین گیٹ پر مسلح چوکیدار ہوتا ہے، اور چوکیدار کے ہوتے ہوئے گھر میں گھسنا ممکن نہیں۔"

یہ سن کر ان میں سے ایک بولا۔ "یار کوئی مسئلہ نہیں اس چوکیدار کی ایسی کی تیسی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ چوکیدار پینے پلانے والا ہے۔ میں اپنے تئیں وقت سے پہلے اس جگہ پہنچ کر کسی نہ کسی طرح چوکیدار کو اتنا پلادوں گا کہ وہ اپنا ہوش کھو بیٹھے گا، چوکیدار کے متعلق مجھے یوں معلوم ہے کہ چوکیدار میرے محلے میں رہتا ہے اور جب چوکیدار ہوش سے بیگانہ ہوجائے گا تو میں اسے اوپر بھیج دوں گا۔ ویسے بھی وہ مجھ پر اچھا خاصا بھروسہ کرتا ہے، کئی مرتبہ ہم اکٹھے بیٹھ کر پیتے پلاتے رہے ہیں۔"

اس پروگرام کو سن کر سب کے سب خوش ہوگئے اور طے پایا کہ پرسوں کی رات صحیح رہے گی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے پایا کہ رات دس بجے فلاں پارک میں سب جمع ہوں گے اور پھر اسی جگہ مطلوبہ وقت تک رہیں گے لیکن عارف اپنے پروگرام کے مطابق بوتل کے ساتھ چوکیدار کے پاس چلا جائے گا۔

ویسے بھی چوکیدار گیٹ پر بنی اپنی کوٹھری میں رہتا ہے۔

مطلوبہ وقت پر سارے دوست پارک میں جمع ہوگئے، اس وقت عارف بھی موجود تھا کیونکہ سب کے سب پونے دس بجے تک جمع ہوگئے تھے۔

رات کے دس بجتے ہی عارف بولا۔ "اچھا دوستو میں تو چلا اپنے مشن پر۔"

ایک دوست بولا۔ "یار سلمان گھر والے تو دروازہ بند کرکے سوتے ہوں گے! اور ایسی صورت میں دروازہ کھولنے کے لئے کون سا طریقہ آزمانا ہوگا۔"

سلمان بولا۔ "یار یہی تو مزے کی بات ہے، آزادانہ ان کے کمرے کھلے ہوتے ہیں، اندر سے کوئی بھی کنڈی نہیں لگاتا، سب کے سب آزاد مائنڈ ہیں اور پھر چندا کا کمرہ بالکل شروع میں ہے، اس لئے کہ کبھی کبھی اس کی سہیلیاں رات گئے تک کمرے میں اودھم مچاتی ہیں اور پھر کافی رات گئے واپس چلی جاتی ہیں اس لئے چندا نے اپنا کمرہ سب سے پہلے رکھا ہے۔"

عارف اٹھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر بولا۔ "اچھا دوستو! میں تو چلا۔"

اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ عارف خود بخود بڑی تیزی سے آٹھ دس فٹ اوپر کو اچھلا اور پھر دھڑام سے نیچے زمین پر گر پڑا۔

پھر تو یکے بعد دیگرے لائن لگ گئی۔ عارف اور سلمان سمیت اس جگہ چھ دوست موجود تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت ان سب کو اٹھا اٹھا کر نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کو پٹخ رہی تھی۔ ان سب کی فلک شگاف چیخیں قرب وجوار کو دہلانے لگیں۔

ان سب کی دل دہلا دینے والی چیخیں سن کر پارک میں بیٹھے سارے لوگ اس جگہ جمع ہوگئے، ہر کوئی خوفزدہ اور دل برداشتہ تھا، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟

سارے لوگ انگشت بدنداں تھے، ہر کسی کی عقل حیران تھی، یکے بعد دیگرے چھ کے چھ نوجوان نیچے سے اوپر کو اٹھتے اور پھر زور سے نیچے زمین پر گر جاتے۔

پورے پارک میں کہرام مچا ہوا تھا، خوفزدہ ہو کر اب تو سارے لوگ اس جگہ سے دور ہٹتے بلکہ وہاں سے بھاگتے نظر آرہے تھے۔

بدحواس لوگوں کو دیکھ کر پارک کے پاس سے گزرتی ہوئی گشت پر معمور پولیس پارٹی فوراً وہاں پہنچ گئی مگر جب پولیس والوں نے وہ منظر دیکھا تو سارے پولیس والے بھی سہم کررہ گئے۔

جب پولیس اس جگہ پہنچی تو ان نوجوانوں کی چیخیں معدوم پڑنے لگی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چھ کے چھ نوجوان بے حس و حرکت ہو گئے۔ ان سب کی ہڈی پسلی ایک ہو کر رہ گئی تھی۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں سے کہ خون بھل بھل نہ بہہ رہا ہو۔ اور خاص طور پر ناک، منہ سے تو کہیں زیادہ ہی خون بہہ کر زمین کو تر کر رہا تھا۔

سارے نوجوان بے سدھ ہو چکے تھے، جب ان میں کوئی حرکت نہ رہی تھی، پولیس انسپکٹر آگے کو بڑھا اور ایک کی کلائی پکڑی اور پھر اپنی اُنگلی نبض پر رکھی تو پھر اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ "Expire"

پولیس کو دیکھ کر جو لوگ خوفزدہ ہو کر کافی دور ہٹ گئے تھے وہ قریب قریب آ گئے پولیس سمیت سارے لوگ اچنبھے میں تھے، سب کے سب خاموش تھے اور ہر کسی کے دماغ میں یہی بات تھی کہ "یہ ہوا تو کیسے ہوا؟"

لوگوں کی طرف پولیس انسپکٹر نے اپنا چہرہ گھمایا اور بولا۔ ''آپ لوگوں میں سے کوئی بھی یہ بتا سکتا ہے کہ ان کے ساتھ یہ سب کیسے ہوا؟''

انسپکٹر کی بات سن کر ایک صاحب نے لب کشائی کی۔ ''جناب میں قریب کی بنچ پر اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ یہ بلو شرٹ والا اچانک اوپر کو اچھلا، ایسا لگا کہ کسی نادیدہ طاقت نے اسے نیچے سے اوپر کو بڑے زور سے اچھال دیا ہو، پھر یہ اوپر سے کافی تیزی سے نیچے زمین پر گر پڑا، اور اس کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی تھی، پھر تو یکے بعد دیگرے یہ چھ کے چھ نوجوان نیچے سے اوپر کو اچھلتے اور تیزی سے زمین پر گرتے رہے، اور پھر آخر میں جو کچھ بھی ہوا، وہ آپ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہے۔''

اس جگہ موجود سارے پولیس والے بھی کافی سہمے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ خیر چند منٹ بعد انسپکٹر نے گاڑی میں نصب وائرلیس سے پولیس اسٹیشن اور پھر ایمبولینس کے لئے وائرلیس پر ہی بتایا۔

کوئی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دو پولیس گاڑیاں اور تین ایمبولینس سائرن بجاتی آ دھمکیں۔ اور پھر پولیس والوں نے کارروائی شروع کر دی گئی۔ وہاں پر موجود کچھ لوگوں کے بیانات لئے گئے پھر ان لوگوں کے پتے نوٹ کرنے کے بعد ان لوگوں کو جانے کے لئے کہہ دیا گیا۔

اور مردہ نوجوانوں کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تو سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ ہر اخبار نے بڑھ چڑھ کر سنسنی خیز انکشافات کئے تھے اور یہ حقیقت بھی تھی کہ اس سے پہلے کسی نے یہ سنا تک نہ تھا کہ چھ نوجوانوں کو یکے بعد دیگرے کسی ان دیکھی طاقت نے ملیا میٹ کر دیا ہو۔ یہ حیران کن اور اچنبھے میں ڈالنے والی خبر تھی، آج ہر گھر بلکہ ہر جگہ یہی خبر گردش کر رہی تھی اور ان گھروں میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی جن گھروں کے یہ نوجوان تھے، لوگ جتنا سوچتے اس سے کہیں زیادہ حیرت میں پڑ جاتے، کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ حقیقت تھی کیونکہ چشم دید لوگ تھے اور سب سے بڑھ کر پولیس اہلکار بھی تھے۔

ایسا کیوں ہوا یہ جاننے سے سب لوگ قاصر تھے کہ ایسا ہوا تو کیوں ہوا؟

خیر جتنے منہ اتنی باتیں، ہر شخص اپنے تئیں قیاس کر رہا تھا لیکن عقل تھی کہ حیران......

ایک ساتھ جب چھ جنازے اٹھے تو جیسے پورے شہر میں کہرام مچ گیا۔ محلے بھر کے لوگ جمع تھے اور ہر ایک آنکھ اشکبار تھی۔ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس جگہ اس محلے اور اس شہر میں صدیوں سے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

کچھ لوگ یہ سوچنے لگے کہ بغیر کسی معاملے کے ایسا بھی نہیں ہو سکتا ہے، یہ نوجوان کسی تباہ کن منصوبے پر عمل پیرا ہونے والے تھے۔ یا پھر انہوں نے کسی ان دیکھی نادیدہ ہوائی مخلوق کو چھیڑ دیا ہو اور یہی وجہ ہے کہ ہوائی مخلوق نے ان لڑکوں سے خونی انتقام لیا اور یہی حقیقت

ہے کہ جس طرح ان لوگوں کے ساتھ سلوک ہوا، اور ایسا کرنے والا کسی کو بھی نظر نہ آیا۔ اگر کوئی عام شخص ہوتا تو کسی نہ کسی کو تو نظر آتا۔ لیکن سب سے بڑھ کر پولیس چشم دید گواہ تھی۔

اور سب سے بڑھ کر پوسٹ مارٹم رپورٹ نے لوگوں ہی کو نہیں بلکہ ڈاکٹروں کو بھی حیران کر کے رکھ دیا، ڈاکٹر حیران ہی نہیں بلکہ اچنبھے میں تھے اور ہر ایک ڈاکٹر اور لیبارٹری والا شش و پنج میں تھا اس کے دماغ میں یہ بات بالکل بھی نہیں آ رہی تھی کہ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے، بلکہ یہ ناممکن ہے کہ ایسا سب کے ساتھ ہو جائے۔

کیوں کہ آج سے پہلے اس شہر بلکہ دنیا کے کسی بھی شہر میں ایسا واقعہ سامنے نہیں آیا تھا کہ یہ تو چھ نوجوان تھے اور دیگر خونی حادثے میں سیکڑوں لوگ موت کا شکار ہوتے رہے تھے۔

یہ بات تو واضح تھی کہ تمام نوجوانوں کی ہڈی پسلی چور چور ہو چکی تھی۔ کسی کی ٹانگ کی ہڈی اور کسی کے ہاتھ کی ہڈی اور کسی کی پسلی کی ہڈی کئی حصوں میں بٹ گئی تھی اور یہ کوئی اچنبھے والی بات نہ تھی کیونکہ زور زور سے جب کسی کو پٹخا جائے تو یقیناً جسم کی ہڈی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔

لیکن ایسا تو کسی دور کے تاریخ میں نہیں ہوا تھا۔ چھ کے چھ نوجوانوں کے اندرونی جسم میں ایک طرح کا عمل ہوا ہو۔ یعنی ان سب کا دل ایک ہی طرح سے چار حصوں میں کسی تیز دھار آلے سے چیر دیا گیا تھا اور یہی ہے حیران کن اور اچنبھے والی بات کہ چھ نوجوانوں کا دل ایک ہی طریقے۔ سے ایک ہی جیسے آلے سے چار حصوں میں کیسے چیر دیا گیا تھا۔

یہ ایسا واقعہ تھا کہ کسی کے دماغ میں آ کے نہیں دے رہا تھا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ سوچ سوچ کے لوگوں کے دماغ شل ہو گئے تھے۔ عام لوگ تو خیر اتنے حیران نہ تھے لیکن ڈاکٹری شعبہ میں تہلکہ مچ گیا تھا کوئی یہ مان کے دے نہیں رہا تھا کہ ایسا ہونا یک بیک ایک ساتھ ناممکن ہے بلکہ ایسا تو ہو گیا تھا۔

تاریخ گواہ تھی کہ بڑے بڑے خونی حادثے ہوئے تھے اور اس سے بھی زیادہ خطرناک واقعات رونما ہوئے تھے مگر یہ تاریخ کا اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ تھا کہ سینے میں دل کو چار حصوں میں چیر دیا گیا تھا۔ جبکہ اوپر سے سینہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ سینے میں کوئی سوراخ یا چیر پھاڑ نظر نہیں آ رہا تھا۔

خیر کوئی مانے یا نہ مانے جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔

سب کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ پورا شہر خوف و ہراس کے شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔ ہر باشعور شخص اپنی اپنی جگہ سہما ہوا تھا۔

اور ان نوجوانوں کے گھر والے خوف و ہراس کی چکی میں پس رہے تھے، گھر کا ہر فرد یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں ان کے ساتھ بھی کوئی ایسا حادثہ نہ ہو جائے۔

چندا کے گھر والے بھی افسردہ اور غمزدہ تھے کیونکہ وہ تو خاص رشتہ دار تھے، سلمان تایازاد تھا۔ اور یہ حادثہ اس وقت ہوا تھا جب سلمان کے والد تین دن پہلے سلمان کے لئے چندا کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ گھر میں سب سے، زیادہ چندا کے والد شرف الدین افسردہ تھے کیونکہ سلمان ان کا سگا بھتیجا تھا۔

خیر وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ لوگوں کے دماغ سے محو ہوتے ہوتے یکسر غائب ہو گیا۔ لیکن ان نوجوانوں کے گھر والے تو اس واقعہ سے اذیت ناک کرب میں مبتلا ہو گئے تھے۔

ادھر چندا اپنی جگہ دلی طور پر اپنے اندر بہت فرحت محسوس کر رہی تھی کہ چلو سلمان سے جان تو چھٹی، کیونکہ سلمان عادتاً بہت ہی لچا لفنگا اور بری عادتوں والا تھا۔ اگر خدانخواستہ اس سے اس کا رشتہ ہو جاتا تو چندا حقیقت میں زندہ درگور ہو جاتی بلکہ اس نے یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اگر اس کے والد اپنے بڑے بھائی اور بھتیجے کی محبت کے تحت چندا کا رشتہ دینے پر حامی بھر لیتے ہیں تو چندا اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر اس دنیا سے ہی اپنا ناطہ توڑ لے گی۔

لیکن خیر قسمت نے یاوری کی اور کوئی بات آگے بڑھنے سے پہلے ہی اس کے والد نے چندا کا رشتہ دینے سے انکار کردیا تھا اور اس طرح چندا اپنی ذات پر ہونے والی بہت بڑی اذیت ناک مصیبت سے بچ گئی تھی۔

لیکن جو واقعہ رونما ہوا تھا اسے محسوس کرکے چندا خود بھی اپنی جگہ بہت زیادہ سنسنی میں مبتلا تھی کہ ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے اور ایسا ہوا تو ہوا کیسے؟ بہر حال وہ خود بھی بہت زیادہ اچنبھے میں تھی۔

☆......☆......☆

چندا گھر والوں کے ساتھ ایک شادی کی تقریب میں گئی تھی اور رات گئے تک واپسی ہوئی، وقت زیادہ ہوگیا تھا لہٰذا گھر میں آتے ہی وہ اپنے کمرے میں گئی اور بستر پر گرتے ہی نیند کی دیوی نے اسے آدبوچا اور پھر وہ بے سدھ ہوکر گہری نیند میں کھوگئی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اس نے دیکھا کہ وہ پھولوں کے باغیچے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی ہے، تاحد نگاہ رنگ برنگی بھینی خوشبو بکھیرتے پھول ہوا کے دوش پر لہلہارہے ہیں اور وہ تمام پھولوں کو بڑی محویت سے دیکھ رہی ہے، وہ اتنی خوش ہے جو کہ بیان سے باہر ہے۔ پنک لباس زیب تن کئے ہوئے ہے۔ خوشنما رنگ برنگے پرندے ادھر سے ادھر اڑتے ہوئے اپنی اپنی بولیوں میں اپنی خوشی کا اظہار کررہے ہیں۔ اتنے میں اس کی نگاہ ایک سمت کو اٹھتی ہے اور پھر نگاہ اس سمت ٹک جاتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس سمت سے کسی کی آمد متوقع ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

وہ سوچ میں پڑجاتی ہے کہ اس وقت اور یہاں پر گھوڑے کہاں سے آگئے اور پھر یہ گھوڑے ہنہنا کیوں رہے ہیں۔ خیر اس سمت سے اس کی نگاہ ہٹتی نہیں ہے۔

اتنے میں اسے نظر آتا ہے کہ وہ گھوڑے اسی کی جانب آرہے ہیں۔ اب منظر ذرا واضح ہوتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ ایک بگھی ہے جس میں گھوڑے جتے ہوئے ہیں۔

خیر بڑی تیزی سے گھوڑے اس کی جانب بڑھتے آرہے ہیں۔ پھر منظر اور زیادہ واضح ہوتا ہے تو وہ دیکھتی ہے کہ گھوڑے برائے صورت بالکل سفید ہیں اور یہی نہیں بلکہ گھوڑے جس بگھی میں جتے ہوئے ہیں وہ پوری کی پوری بگھی بھی سفید ہے۔

اب اس کی محویت مزید بڑھ جاتی ہے اور گھوڑے سمیت بگھی اور قریب سے قریب تر آتی جارہی ہے۔ چندا کی سوچ جیسے کسی سوئی کی نوک پر ٹک جاتی ہے اور اس کے ہونٹوں پر خود بخود مسکان بکھر جاتی ہے، وہ خود بھی کسی اپسرا سے کم نہیں نظر آرہی تھی۔

بگھی بڑی تیزی سے آتے آتے اس سے چند گز کے فاصلے پر رک جاتی ہے تو وہ بالکل اچنبھے میں پڑ جاتی ہے، بگھی میں کل آٹھ گھوڑے جتے ہوتے ہیں۔ ایک طرف چار اور دوسری طرف چار۔

بگھی اس کے قریب آجاتی ہے اور وہ بگھی زمین پر نہیں بلکہ معلق فضا میں چلتی ہوئی آرہی تھی۔ اور یہ دیکھ کر چندا تو بہت ہی زیادہ حیرت میں پڑجاتی ہے کہ ”بگھی ہمیشہ زمینی سڑک پر چلتی ہے اور یہ بگھی کیسی ہے جو کہ زمین سے اوپر فضا میں چل رہی ہے۔

اتنے میں وہ بگھی بالکل اس کے قریب آکر رک جاتی ہے۔ اور اس وقت وہ بگھی زمین سے کوئی دو یا تین فٹ اوپر فضا میں معلق رہتی ہے۔

اور جب چندا بھرپور اپنی نظر بگھی پر ڈالتی ہے تو بغیر حیران ہوئے نہیں رہتی کیونکہ بگھی پر ایک کوچوان کی جگہ ایک شخص موجود ہے جو کہ ہیولہ کی صورت میں ہے۔

بگھی کے اندر سیٹ پر ایک بہت ہی وجیہہ خوبرو لاکھوں میں یکتا خوب صورت ایک شہزادہ براجمان ہے اور وہ شہزادہ خود بھی بالکل سفید لباس میں ملبوس ہے، اور اس کے ہونٹوں پر تبسم آویزاں ہے، وہ یک ٹک چندا کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

شہزادہ اور چندا دونوں کی نگاہیں جیسے ایک دوسرے کے چہرے پر گڑ کر رہ گئی ہیں۔ اتنے میں شہزادہ

مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ چندا کی طرف بڑھاتا ہے۔
اور پھر گویا ہوا۔ ”شہزادی۔“

انداز ایسا ہوتا ہے کہ ”چندا، بگھی میں سوار ہونے کے لئے اپنے قدم آگے بڑھائے۔“

واضح طور پر چندا سمجھ جاتی ہے کہ شہزادہ بگھی میں سوار ہونے کے لئے میری جانب ہاتھ بڑھا رہا ہے کہ اتنے میں شہزادہ کی مترنم دلکش اور من موہنی آواز چندا کی سماعت میں رس گھولنے لگتی ہے۔ ”شہزادی بگھی میں سوار ہونے کے لئے قدم آگے بڑھائیں۔“

اور یہ سننا تھا کہ چندا کے قدم خود بخود بگھی کے پائیدان کی طرف بڑھے اور پھر چندا پلک جھپکتے ہی شہزادہ کے ہاتھ کا سہارا لے کر بگھی میں سوار ہوگئی۔

چندا کا بگھی میں سوار ہوتے ہی شہزادہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ ”شہزادی سیٹ پر بیٹھ جائیں“ اور پھر چندا بگھی کی نرم و نازک آرام دہ سیٹ پر براجمان ہوجاتی ہے اور پھر مسکراتی ہوئی چندا اپنی نظریں شہزادے پر مرکوز کرتی ہے تو شہزادہ ایک انجان زبان میں کوچوان کی طرف منہ کر کے بولتا ہے تو بگھی ہواؤں میں اڑنے لگتی ہے اور یہی نہیں بلکہ بگھی میں جتے آٹھوں گھوڑے کسی انجان منزل کی طرف سرپٹ دوڑنے لگتے ہیں۔

شہزادہ بھی چندا کے برابر میں بیٹھ کر مسکراتے ہوئے چندا کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔ ایسا کرنے سے شہزادہ کے نرم و نازک ہاتھ کا لمس چندا اپنے ہاتھ پر محسوس کرتی ہے اور ذہنی طور پر بہت ہی فرحت محسوس کرتے ہوئے خوشی سے سرشار ہوجاتی ہے۔

پھر چندا ذہنی طور پر ایک عجیب خلفشار میں مبتلا ہوتی ہے کہ ”یہ شہزادہ کون ہے! اور یہ مجھے کہاں لے جارہا ہے؟“

”شہزادہ چندا کی دلی سوچ کو بھانپ کر بولتا ہے۔ ”شہزادی آپ گھبرائیں نہیں، اور نہ ہی اپنے دل میں کسی قسم کی سوچ کو جگہ دیں...... میں کوئی غیر نہیں بلکہ آپ کی محبت کا دم بھرنے والا آپ کا پرستار ہوں۔“

یہ سنتے ہی چندا ذہنی طور پر ہواؤں میں خود کو اڑتا ہوا محسوس کرتی ہے۔“

پھر شہزادے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ”شہزادی میں آپ کو اپنی دنیا کی سیر کرانے لے جارہا ہوں...... آپ گھبرائیں نہیں، بخیر و عافیت آپ کو آپ کے گھر چھوڑ جاؤں گا۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہ کیسا لگا، کیا آپ کا دل میری چاہت خلوص اور محبت کو قبول کررہا ہے۔“

یہ سننا تھا کہ چندا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کچھ زیادہ ہی گہری ہوگئی، جس کا واضح ثبوت تھا کہ ”شہزادے، تم فکر مند نہ ہو، میں خود بھی تمہاری چاہت و محبت کی قائل ہوگئی ہوں۔“

شہزادہ اپنے دل اور اپنی چاہت کے بابت طرح طرح سے چندا کو اپنی چاہت کا اقرار کراتا رہا... اور چندا شرم و حیا کے پیش نظر اپنی آنکھوں کے اشارے، اور اپنی مسکراہٹ سے اقرار کرتی رہی۔

تقریباً ایک گھنٹہ ہونے والا تھا مگر ابھی تک بگھی پوری رفتار سے، ہوا میں معلق آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھی اور پھر ایک گھنٹہ کا پورا ہوتے ہی ایسا لگا کہ بگھی اوپر سے نیچے کی جانب پرواز کررہی ہے۔ اور پھر چند منٹ بعد ہی بگھی ایک خوشنما پھولوں بھرے باغ میں کھڑی ہوگئی۔

یہ دیکھ کر شہزادہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنی آنکھوں سے اشارہ کیا کہ ”شہزادی آپ بگھی سے نیچے اترنے کے لئے آگے کو قدم بڑھائیں۔

اور یہ اشارہ پاتے ہی چندا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مسکراتے ہوئے شہزادے کا اپنی جانب بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اور پھر دونوں بگھی سے نیچے اتر گئے۔

بگھی سے، نیچے دونوں نے اترنا تھا کہ بگھی آگے کو بڑھتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

تاحد نگاہ...... رنگ برنگ پھول ہی پھول تھے، اور ہر سمت سے، دل و دماغ کو فرحت بخشتی اور مست کرتی

خوشبو دماغ کو معطر کر رہی تھی...... اچانک چندا کے دماغ میں آیا ایسی خوشنما اور دل کو مست کرتا منظر، کاش! کہ میں ہمیشہ ایسی ہی جگہ پر اپنی زندگی گزاروں۔

پھولوں کے درمیان ایک بہت ہی خوب صورت سائبان بنا نظر آیا۔ سائبان کے نیچے آرام دہ دلکش کرسیاں موجود تھیں۔ شہزادہ چندا کا ہاتھ پکڑے ہوئے سائبان کی طرف بڑھا۔

سائبان میں پہنچا تھا کہ ایک طرف سے چار خوبرو لڑکیاں سائبان کی طرف آتی ہوئی نظر آئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں درمیانہ سائز کے تھال پکڑے تھے اور ان تھالوں میں گلاب کی پتیاں تھیں۔ قریب آتے ہی ان لڑکیوں نے شہزادہ اور چندا کے قدموں میں گلاب کی پتیاں ڈالنا شروع کر دیں۔

گلاب کی پتیاں قدموں میں ڈال کر وہ چاروں لڑکیاں چندا اور شہزادے کا استقبال کر رہی تھیں، قدموں میں گلاب کی پتیاں ڈالنے کے بعد وہ چاروں لڑکیاں سر جھکا کر باادب کھڑی ہو گئیں۔

اس کے بعد شہزادہ نے کسی انجان زبان میں انہیں مخاطب کیا تو وہ سر جھکائے واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد اس جگہ دل موہ لینے والا ساز بجنا شروع ہو گیا۔

اس کے بعد شہزادہ اور چندا سائبان کے نیچے موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس جگہ ایک بہت بڑی میز آ گئی، میز کو چار لڑکیوں نے اٹھا رکھا تھا۔ میز رکھنے کے بعد چاروں لڑکیاں ایک طرف کو چلی گئیں، اس کے بعد آٹھ دس کے قریب لڑکیاں اس جگہ آ گئیں، ان کے ہاتھ میں خوب صورت ڈشز تھیں اور ان ڈشز میں انواع واقسام کے کھانے موجود تھے۔

کھانے سے گرما گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میز پر تمام کھانے کی ڈشز رکھتے ہی ساری لڑکیاں واپس چلی گئیں۔ تو شہزادہ گویا ہوا۔ ''شہزادی یہ تمام کھانے آپ کے لئے ہیں، شوق فرمائیں، شہزادہ کی بات سن کر چندا نے چند کھانے چکھنے کے طور پر کھائے، کھانے اتنے لذیذ تھے کہ چکھتے ہی چکھتے چندا کی طبیعت سیر ہو گئی۔

کھانے سے، چندا فارغ ہوئی تو شہزادہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر گویا ہوا۔ ''شہزادی کیا میں آپ سے محبت کرنے کے قابل ہوں...... میں امید رکھوں کہ آپ میرا دل نہیں توڑیں گی...... اور اگر آپ نے میرا دل توڑ دیا تو میں اپنی ذات کا مکمل خاتمہ کر لوں گا۔

میں ایک طویل عرصہ سے آپ کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہوں...... آپ کو تو اندازہ نہیں مگر مجھے اندازہ ہے کہ میں رات رات بھر جاگ کر آپ کے لئے آہیں بھرتا رہا ہوں...... میں نے غائبانہ طور سے ایک ایک پل آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائی ہیں......

میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دنیا کا کوئی بھی شخص اگر آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے سوچے گا بھی تو میں اس شخص کو جان سے مار دوں گا، اگر کسی کی ذات نے آپ کو ذرہ برابر بھی دکھ پہنچایا تو میں اس کا خاتمہ کر دوں گا۔ چاہے وہ ہستی آپ کا قریبی ہی کیوں نہ ہو۔

آپ کی خوشی میری خوشی ہے، میں آپ کی آنکھوں میں غم کی پرچھائی نہیں دیکھ سکتا، بس آپ یہ جان لیں کہ آپ کی خوشی میری زندگی ہے، اگر ایک پل کے لئے بھی آپ اداس ہو گئیں تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا، اگر کسی نے آپ کو میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دوں گا، چاہے کوئی میرا قریبی ہو یا آپ کا کوئی رشتہ دار، جس نے آپ کی خوشی میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی تو میں اس شخص کا دنیا سے ناطہ توڑ کے رکھ دوں گا، میں ہر اس شخص کو نشان عبرت بنا دوں گا جو آپ کی راہ میں آنے کی کوشش کرے گا، میں اس شخص کو بھی کرب واذیت میں مبتلا کر کے نیست و نابود کر دوں گا جس نے اپنے دل میں آپ کی چاہت کو جگہ دی، غیر تو غیر اگر میرے دل میں بھی کسی پل آپ کے لئے کسی کھوٹ نے سر ابھارا تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود کو بھی ہلاک کر لوں گا۔

شہزادی بس آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کی مسکراہٹ اور خوشی میری زندگی کی ضمانت ہے اگر وقت

آیا تو میں دنیا سے ٹکرا جاؤں گا، آپ کی خوشی کے لئے اور آپ کے حصول کے لئے، بس جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے آپ کے گوش گزار کردیا۔

اب آپ کی مرضی کہ میری محبت کا اقرار کریں یا میری محبت کو ٹھکرا دیں۔

سرخم تسلیم ہے جو مزاج آپ میں آئے۔''

اور یہ بول کر شہزادہ خاموش ہوگیا۔

اس کے بعد چندا نے شہزادے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے سر کی جنبش سے شہزادہ کا ساتھ دینے کا اقرار کرلیا۔ چندا برابر مسکراتی رہی تھی۔

اس کے بعد شہزادہ بولا۔ ''شہزادی اب آپ چلیں، آپ کے جانے کا وقت ہورہا ہے، میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔''

پھر شہزادے نے اپنی انجان زبان میں ایک آواز لگائی تو جھٹ سے ہی بگھی آن موجود ہوئی جس بگھی میں وہ دونوں یہاں تک آئے تھے۔

جب بگھی آگئی تو شہزادہ بولا۔ ''شہزادی چلیں بگھی آگئی۔'' اور ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور چندا نے بگھی کی طرف اپنے قدم بڑھا دیئے۔

بگھی کے قریب پہنچ کر شہزادے نے اپنے ہاتھ کا سہارا دیا تو چندا شہزادے کے ہاتھ کا سہارا لے کر بگھی میں سوار ہوگئی۔ اس کے بعد شہزادہ بھی بگھی میں سوار ہوگیا۔

شہزادے کا بگھی میں سوار ہوکر سیٹ پر بیٹھنا تھا کہ بگھی میں جتے ہوئے گھوڑے ہلکی چال سے آگے کو بڑھنے لگے، پوری بگھی اور آٹھوں کے آٹھوں گھوڑے ہوا میں معلق آگے ہی آگے بڑھنے لگے اور پھر چند لمحے بعد ہی گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بگھی میں موجود گھوڑے چندا کے مکان کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ تو شہزادے نے چندا کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور چندا بگھی سے اتر کر خراماں خراماں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئی اور اپنے بستر پر لیٹ گئی کہ اچانک چندا کی آنکھ کھل گئی، وہ خواب سے اب بیدار ہوچکی تھی۔

خواب سے بیدار ہوتے ہی چندا کے دماغ میں سوچوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، اسے خواب میں نظر آنے والے سارے مناظر کسی فلم کی طرح اس کے دماغ میں چلنے لگے۔

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ جو کچھ بھی اس نے خواب میں دیکھا، حقیقت سے اس کا کوسوں دور پتہ نہ تھا۔

مگر جو کچھ بھی تھا وہ کوئی غلط نہ تھا، اسے ایک ایک پل خواب میں آنے والے مناظر یاد تھے، وہ کس طرح اس حقیقت کو جھٹلا سکتی تھی۔ شہزادے سے جتنی باتیں کی تھیں وہ حرف بہ حرف اسے یاد تھیں۔

چندا اچنبھے میں تھی کہ اس نے ایسا خواب کیوں دیکھا؟ اس خواب کی تعبیر کیا ہوسکتی ہے؟ ابھی تک اس کا پورا جسم بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہورہا تھا۔

رات میں نہ وہ کمرے میں کوئی خوشبو چھڑکتی تھی اور نہ ہی کوئی خوشبو وہ خود سوتے وقت استعمال کرتی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے اب کوسوں دور جاچکی تھی، ایک نئی امنگ اپنے اندر محسوس کررہی تھی، شہزادے کی خوب صورتی، وجیہہ قد کاٹھ اور پھر دلکش مترنم گفتگو ابھی تک اس کان میں رس گھول رہی تھی، وہ لاکھ اپنے ذہن کو جھٹکتی مگر ہر منظر اس کی آنکھوں میں گھومنے لگتا۔

اب تک اس کی جو عمر تھی...... جوانی کی دہلیز تو وہ پار کرچکی تھی مگر آج سے پہلے اس نے کوئی ایسا خواب نہ دیکھا تھا، اور نہ ہی اب تک کوئی نوجوان اس کے خواب میں آیا تھا، کیونکہ اس نے کبھی کسی نوجوان کے ادنیٰ خیال کو بھی اپنے دماغ میں جگہ نہیں دیتی تھی۔

خواب میں آنے والی ساری باتوں کو جب سوچتے سوچتے تھک گئی تو جھٹ سے بستر سے اٹھی اور فریج کے پاس آکر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور اپنے

ہونٹوں سے بوتل لگالی۔

ٹھنڈے پانی نے قدرے اسے سکون کا احساس دلایا۔ پانی پینے کے بعد وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ پھر وہ واش روم میں گئی اور نلکے سے اپنے ہاتھوں میں پانی لے کر اپنے منہ پر چھپاکے مارے۔ ایسا کرنے سے اسے مزید کچھ سکون ملا، اس کے بعد وہ واش روم سے نکلی اور بستر پر آ کر بیٹھ گئی، پھر دوبارہ اپنے خوابوں میں کھوگئی کہ اتنے میں اذان فجر کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

پھر اس نے سوچا اب صبح ہونے والی ہے اور یہ سوچ کر نماز فجر کی ادائیگی کے لئے تیاری کرنے لگی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے سوچا۔ ''آج عجیب خواب مجھے نظر آیا...... خیر میری سمجھ میں تو نہیں آیا...... کل میں اسکول میں عائشہ سے معلوم کروں گی کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟''

صبح کا اجالا ہر سو پھیل گیا تو وہ اپنے کمرے سے نکلی، نہا دھو کر فریش ہوئی اس کے بعد تیار ہو کر ناشتہ کی میز پر آئی۔ میز پر پہلے ہی سے دونوں بہنیں موجود تھیں۔ دونوں چھوٹی بہنیں دوسرے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ میز پر والدہ بھی موجود تھیں، ان کے والد شرف الدین کسی کام سے جلدی چلے گئے تھے۔

سب نے مل کر ناشتہ کیا، ناشتہ کے بعد دونوں بہنیں اپنے اسکول اور چندا نے اپنے اسکول جانے کے لئے اپنا بیگ اٹھایا اور ڈائننگ ہال سے نکلتی چلی گئی۔

وہ اپنی بگھی میں بیٹھی اور بگھی آگے کو بڑھتی چلی گئی، آدھے گھنٹے بعد بگھی اسکول کے گیٹ پر پہنچ گئی تو وہ بگھی سے نیچے اتری اور کلاس میں داخل ہوگئی۔

ابھی تک عائشہ کلاس میں آئی نہیں تھی، وہ اپنی جگہ پر بیٹھ کر عائشہ کا انتظار کرنے لگی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد عائشہ کلاس میں داخل ہوتی نظر آئی تو چندا خوشی سے سرشار ہوگئی، کیونکہ اب عائشہ سے اس نے رات والے خواب کی تعبیر معلوم کرنی تھی۔ عائشہ چلتی ہوئی آئی اور چندا کے پاس بیٹھ گئی، تو چندا نے پوچھا ''ارے آج تو لیٹ کیسے ہوگئی، ورنہ تو تو ہر روز مجھ سے پہلے آجاتی تھی۔''

عائشہ نے جواب دیا۔ ''آج میں ذرا دیر سے اٹھی اور پھر تیاری کرتے کرتے دیر ہوگئی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ تو آج جلدی آگئی ہے...... کیا میں وجہ جان سکتی ہوں جلدی آنے کی؟''

یہ سن کر چندا بولی۔ ''دراصل میرے دماغ میں سوچوں کا گھمبیر طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے اور اسی لئے میں جلدی آگئی کہ اس مسئلہ کے متعلق تجھ سے بات کروں گی۔'' یہ باتیں ہورہی تھیں کہ اسکول کی گھنٹی بجی اور کلاس ٹیچر مسز رخسانہ کلاس میں آگئیں اور اس طرح چندا اور عائشہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ لیکن چندا نے اشارے اشارے میں عائشہ کو بتایا کہ آف بریڈ میں بات کروں گی اور پھر اس کے بعد دونوں کلاس ٹیچر کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ اتفاق سے ان کا دوسرا پیڈ آف تھا۔

عائشہ بولی۔ ''چل باہر چلتے ہیں۔''

یہ سن کر چندا بولی۔ ''باہر جانے کے لئے میرا دل راضی نہیں، میں چاہتی ہوں کہ جو بات میں نے کرنی ہے اسی جگہ بیٹھ کر تجھے بتاتی ہوں۔''

عائشہ بولی۔ ''اچھا خیر چل...... کیا اہم بات ہوگئی...... کہیں کسی میں دل تو نہیں الجھ گیا۔''

عائشہ کی بات سن کر چندا نے ایک بہت لمبا سانس لیا۔ اور پھر حرف بہ حرف ساری بات عائشہ کے گوش گزار کردی۔ چندا کی ساری روداد سن کر عائشہ نے چند لمحے اپنی آنکھیں بند کرلیں پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور گویا ہوئی۔ ''بنو! تمہاری باتوں سے میں نے تو اندازہ کیا ہے کہ تم کسی کی نظروں میں آگئی ہو۔''

عائشہ کی بات سن کر چندا نے چٹکی بھری اور بولی۔ ''چل ہٹ ایسی کوئی بات نہیں۔''

پھر عائشہ بولی۔ ''چندا ہو نہ ہو...... تیرے خواب سے تو پتہ چل رہا ہے کہ یقیناً کوئی تجھے اپنے دل میں بیٹھا چکا ہے...... اور تیرے خیالوں میں کافی دور تک آگے نکل گیا ہے۔''

چندا جو کہ خاموشی سے عائشہ کی باتیں سن رہی تھی۔ جھٹ بولی۔ ''اگر کوئی ایسا میرے سامنے آیا اور اپنی زبان کھولی تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لوں گی...... بھئی میں ان چکروں میں پڑنا نہیں چاہتی...... اور اگر کوئی میری سوچ کے مطابق ہوگا تو سوچا جائے گا۔''

''بہرحال چندا! تیرے خواب سے میں نے تو یہی اندازہ لگایا ہے...... کہ ضرور کوئی دل جلا تیری ذات کو اپنے دماغ میں بیٹھا کر تیرے متعلق سوچ رہا ہے...... اور یہ ضروری نہیں کہ تو بھی اس کے متعلق سوچے۔ عشق و محبت کا فلسفہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ایک فرد کسی کی ذات کے متعلق سوچنا شروع کردیتا ہے...... اور اپنی سوچ کو وقت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ مضبوط کردیتا ہے، یہاں تک کہ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے اپنے محبوب کو دماغ میں بیٹھا لیتا ہے۔ تو ٹیلی پیتھی کا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے۔ یعنی سوچنے والے کے دماغ سے سوچ کی برقی لہریں نکل کر محبوب کے دماغ میں گھسنے لگتی ہیں اور پھر محبوب کے دماغ میں ایک عجیب وغریب کشمکش شروع ہوجاتی ہے۔

اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ محب اپنے محبوب کے سامنے کسی بھی طرح اپنی چاہت کا اظہار کر بیٹھتا ہے تو محبوب بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوکر اس کی محبت کا دم بھرنے لگتا ہے۔ اور مجھے تو لگ رہا ہے کہ چندا بیگم تمہاری چاہت کوئی کر بیٹھا ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ تمہارا حقیقت سے کب واسطہ پڑتا ہے۔''

یہ سن کر چندا بغور عائشہ کو گھورنے لگی اور پھر بولی۔ ''حقیقت کی بچی جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے اور نہ ایسا کچھ ہوسکتا ہے...... میرے دماغ میں کوئی ایسی بات نہیں اور نہ ہی میں ایسا کچھ سوچ سکتی ہوں۔ اور اگر کسی نے میرے سامنے ایسی بات کی تو میں اس کی زبان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تالا ڈال دوں گی تاکہ کسی اور کے سامنے بھی اپنی چاہت ومحبت اور دل کی بے قراری کا اظہار نہ کرسکے گا۔''

یہ سن کر عائشہ بولی۔ ''بنو! یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا ہوگا اور تم کیا قدم اٹھاؤ گی، میں نے تو اکثر پڑھا ہے اور سنا ہے کہ بڑے سے بڑے دل گردے والے مستحکم

ارادے والے بھی اپنے دل ودماغ پر قابو نہیں رکھ پاتے اور محبت جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر تنہائی نہیں بلکہ دوسروں کے سامنے بھی آہیں بھرنے لگتے ہیں، اور تم کس کھیت کی مولی ہو چندا بیگم۔"

عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے چندا مسکرانے لگی اور بولی۔"عائشہ میں تمہاری ساری باتوں کو رد کر دکھاؤں گی......اور میں کسی صورت بھی محبت جیسے موذی مرض کا شکار نہیں ہوں گی۔"

خیر ان دونوں کی باتیں یہیں تک ہوئی تھیں کہ تھرڈ پریڈ کی گھنٹی بج گئی اور ٹیچر کلاس میں داخل ہوئی تو دونوں اٹینشن ہو گئیں۔

اس کے بعد پریڈ پر پریڈ چلتا رہا اور دونوں کو اس موضوع پر بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔

پھر آخری پریڈ کے بعد چھٹی کی گھنٹی بجی تو دونوں نے اپنے اپنے بیگ اٹھائے اور کلاس روم سے باہر نکل گئیں۔

چندا کی بگھی کا کوچوان بگھی پر بیٹھا چندا کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا کہ بگھی کا کوچوان کوئی پندرہ بیس منٹ چھٹی ہونے سے پہلے بگھی لے کر آتا اور چھٹی کا انتظار کرنے لگتا۔

چندا خراماں خراماں اپنی بگھی کی طرف بڑھنے لگی پھر اسے اچانک خیال آیا کہ"ارے خیالوں میں گم اس نے آج تو عائشہ سے ہاتھ نہیں ملایا" تو جھٹ وہ عائشہ کی طرف بڑھی اور اس سے ہاتھ ملا کر بولی۔"میں تو خیالوں میں گم تھی، تو تو ہاتھ ملا لیتی۔"

عائشہ بولی۔"دراصل میں دیکھ رہی تھی کہ تجھے ہاتھ ملانا یاد بھی آتا ہے کہ نہیں لیکن شکر ہے کہ تیرا دماغ ابھی تک خواب میں اتنا نہیں الجھا......یعنی ابھی دماغ زیادہ الجھنے میں وقت باقی ہے۔"

خیر دونوں نے ایک دوسرے کو بائی بائی کہا اور پھر چندا اپنی بگھی میں بیٹھ کر اپنے گھر روانہ ہو گئی۔

گھر پہنچ کر چندا نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں جا کر وہ بستر پر لیٹ گئی تاکہ چند منٹ تک کمر سیدھی کر لے۔

اتنے میں ملازمہ کی آواز سنائی دی۔"چندا بی بی آپ جلدی سے فریش ہو جائیں۔ مالکن نے میز پر کھانا لگانے کا کہہ دیا ہے، خوشبو اور کرن بی بی اسکول سے آ چکی ہیں۔"

"اچھا میں چند منٹ میں آتی ہوں۔" چندا نے آواز نکالی اور پھر بستر سے اٹھ کر اسکول یونیفارم چینج کیا اور منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی۔ کھانا کھایا اور پھر کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھویا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی۔

ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کی خالہ زاد رضیہ کی آواز سنائی دی جو کہ چندا کے کمرے کی جانب ہی آ رہی تھی۔ رضیہ کی آواز سن کر چندا زیر لب بڑبڑائی۔"چلو اچھا ہوا کہ رضیہ آ گئی اب تھوڑا وقت گپ شپ میں کٹ جائے گا۔" اتنے میں رضیہ کمرے میں آ دھمکی، ابھی تک چندا بستر پر لیٹی پڑی تھی۔ کمرے میں آتے ہی رضیہ بولی۔

چندا رانی خیریت تو ہے ناں......آج تم خلاف توقع اس وقت تنہا کمرے میں پڑی پڑی کیا سوچ بچار کر رہی ہو؟"

چندا بولی۔"ارے کچھ نہیں......بس ذرا تھک گئی تھی سوچا کہ چلو تھوڑا وقت ذرا کمر سیدھی کر لیتی ہوں۔"

"بھئی جوانی میں زیادہ تھکن اور ٹیڑھی کمر کا مسئلہ زیادہ خراب ہوتا ہے اگر ایسی بات ہے تو میں خالو جان سے بات کروں کہ خالو جان ذرا چندا کی کمر پر توجہ دیں کیونکہ چندا کی کمر میں تھکن گھس گئی ہے یا پھر گھس رہی ہے۔"

یہ سن کر چندا بولی۔"رضیہ میں تیرا منہ نوچ لوں گی، تو یہ بتا کہ اتنی دوپہری میں تیرا پاؤں کا چین کہاں چلا گیا، ورنہ تو تو روزانہ دوپہر میں آرام کرتی ہے مگر آج......"

اور پھر چندا کی بات درمیان میں ہی رہ گئی کیونکہ رضیہ درمیان میں بول پڑی۔"ارے میں یوں

جلتی دوپہر میں آ گئی کہ کل جب میں اسکول سے واپس آئی تو پڑوس میں رہائش پذیر شاہنواز نے بڑے زور کی سیٹی بجائی اور دوڑتا ہوا میرے آگے سے نکلتا چلا گیا...... تھا...... میں اسے دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئی کہ آج اس پاگل پر کون سا دورہ پڑا حالانکہ کل سے پہلے تو وہ ہمیشہ دم دبا کر رہتا تھا۔"

"تو پھر تو نے کیا سوچا اس کے متعلق۔" چندا بولی۔

"میں نے سوچا کہ پہلے تجھ سے مشورہ کر لوں کہ اگر اس نے آئندہ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں نے کیا قدم اٹھانا ہے...... اور اب میں وہی کروں گی جو تو مشورہ دے گی۔" رضیہ بولی۔

یہ سن کر چندا مسکرانے لگی اور رضیہ کو گھورتے ہوئے بولی۔ "رضو بیگم جب آئندہ وہ تمہیں متوجہ کرنے کے لئے کوئی حرکت کرے تو مسکراتے ہوئے اسے اپنے پاس بلانا اور بولنا I Love You"

یہ سن کر رضیہ تو جیسے چیخ کر بولی۔ "تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا کہ مجھے ایسا مشورہ دے رہی ہے۔"

اس کے بعد چندا مسکراتے ہوئے بولی۔ "دماغ تو تیرا خراب ہو رہا ہے رے وہ سیٹی بجاتا ہے تو بجانے دے، اگر چھچھورے لڑکوں کے عمل پر کوئی ردعمل ظاہر کیا جائے تو وہ کم بخت اور آگے بڑھتے ہیں اور پھر بدنامی کا سیلاب زور مارنے لگتا ہے، سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ خاموش رہا جائے، پاس پڑوس کی بات ہے اگر وہ حد سے بڑھ گیا تو تو میرے پاس آ جانا، میں تیرے ساتھ چل کر اس کے گھر میں ہی اس کے کان کھینچ کر اس قابل کر دوں گی کہ آئندہ وہ تجھے ضرور رضیہ باجی بولے گا۔ تو کوئی فکر نہ کر بعد کی بات بعد پر چھوڑ دے۔ مجھے اس طرح کے لچے لفنگے کو لگام دینا اچھی طرح آتا ہے...... اگر وہ پھر بھی نہ مانا تو میں حقیقت میں اسے گولی مار دوں گی اور اپنی رضو کو ٹینشن سے بچا لوں گی۔"

"ارے چندا اسی لئے تو میں تیرے پاس دوڑی دوڑی آ گئی کہ تو ہی مجھے کوئی معقول مشورہ دے سکتی ہے...... اب دیکھ ناں تو نے کتنا زبردست مشورہ دیا اور پھر یہ بھی کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو تو اسے گولی مار دے گی، اور یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تو جو بولتی ہے وہ کر بھی گزرتی ہے۔

خیر میں تیرے مشورے پر آنکھ بند کر کے عمل کروں گی اور اگر اب اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تیرے پاس چلی آؤں گی اور پھر ہو گا دمادم۔"

پھر چندا بولی۔ "رضیہ اب اپنا للو بند کر، اور اب میرا بھی ایک مسئلہ ہے غور سے سن اور سوچ سمجھ کر مشورہ دے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے ارے بھئی میں تو مشورہ لینے آئی تھی مشورہ دینے نہیں...... خیر جب تو میرے کام آ سکتی ہے تو میرا بھی تو حق بنتا ہے کہ میں بھی تیرا مسئلہ سنوں اور پھر میں خود کو دیکھوں کہ کیا میں بھی کوئی سود مند مشورہ دے سکتی ہوں...... چل تو اپنا مسئلہ بیان کر۔"

رضیہ میرا مسئلہ ہے کہ میں نے ایک زبردست خواب دیکھا ہے...... ایک شہزادہ مجھ پر مرمٹا ہے، اور ہر صورت وہ مجھے اپنانا چاہتا ہے...... وہ میری چاہت میں اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ میری خاطر وہ اپنی جان دے سکتا ہے، اور اگر کسی نے مجھے روکا ٹوکا یا دکھ پہنچایا تو میری خاطر اس کی جان بھی لے سکتا ہے۔"

اور چندا بیگم اس شہزادہ کے متعلق تمہارا دماغ کیا کہتا ہے؟ کیا تم نے اسے دیکھا ہے یا پھر وہ تمہارے سامنے آیا ہے؟" رضیہ بولی۔

"ارے یہی تو گھمبیر مسئلہ درپیش ہے نہ وہ میرے سامنے آیا ہے اور نہ ہی میرے دل دماغ میں کسی کے لئے کوئی بات ہے...... بلکہ میں نے تو آج تک کسی کے متعلق سوچا تک نہیں، پھر میرا خواب کیا معنی رکھتا ہے۔" چندا بولی۔

یہ سن کر جھوٹ رضیہ بولی۔ "ارے ہو گا کوئی فلچر شہزادہ، تو کہاں اور وہ شہزادہ کہاں...... یہ تو کسی ایرو غیرو کی کہانی لگتی ہے کہ کسی نے تیرا سپنا دیکھنا شروع کر دیا

ہے...... اگر وہ میرے سامنے، آجائے تو میں اپنی جوتی سے اس کا سر گنجا کردوں۔"

کہ اتنے میں رضیہ کے منہ سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی اور رضیہ کی آنکھیں بند ہوگئیں، رضیہ دھڑام سے کمرے کے فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

یہ دیکھ کر چندا تو بدحواس ہو کر چیخنے لگی۔

"ارے دوڑو...... ارے جلدی کرو...... کوئی ہے؟"

یہ سنتے ہی گھر کے سارے افراد بھاگم بھاگ چندا کے کمرے میں گھستے چلے آئے، جب وہ کمرے میں آئے تو فرش پر ڈھیر رضیہ کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

خیر چندا کی والدہ آگے بڑھیں...... وہ کافی دلیر تھیں...... اور اتار چڑھاؤ کو سمجھنے والی بھی۔

وہ رضیہ کے قریب بیٹھیں اور جلدی سے گلاس میں پانی منگوا کر اس کے منہ پر چھڑکا...... چند بار ایسا کرنے سے رضیہ نے یکدم بدحواسی کے عالم میں آنکھیں کھول دیں......

وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی...... واضح طور پر اس کی شکل سے خوف و ہراس جھلک رہا تھا۔

چندا کی والدہ بولیں۔ "بیٹا اب طبیعت کیسی ہے...... کیا طبیعت خراب تھی...... لگتا ہے کہ تمہیں گرمی لگی اور تم گر پڑی یا پھر کوئی اور بات ہے تو جلدی سے بتادو۔" پھر وہ بولیں...... ملازمہ سے۔

زرینہ جلدی سے بھاگ کر ٹھنڈا پانی لے آ...... پانی پیے گی تو طبیعت بحال ہوجائے گی۔"

اور یہ سنتے ہی زرینہ ٹھنڈا پانی لینے کے لئے آگے بڑھی کیونکہ فریج تو چندا کے کمرے میں ہی موجود تھا۔ زرینہ جلدی سے ٹھنڈا پانی لے کر آئی اور گلاس چندا کی والدہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا تو انہوں نے رضیہ کو ٹھنڈا پانی پلایا...... اب رضیہ اٹھ کر چندا کے بستر پر بیٹھ چکی تھی۔ ٹھنڈا پانی پینے کے بعد اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی اور پھر چندا کی والدہ کے پوچھنے پر کہ رضیہ بیٹا کیا ہوا تھا۔

خالہ کی بات سن کر رضیہ مزید خوف و ہراس کی تصویر نظر آنے لگی...... خیر کافی دلاسہ اور تسلی دینے پر وہ گویا ہوئی۔ "خالہ اچانک میری نظروں کے سامنے ایک بہت ہی پرہیبت، ڈراؤنا شخص میرے سامنے آیا، اس کی تین آنکھیں تھیں، دو آنکھیں اپنی جگہ اور ایک آنکھ اس کے ماتھے کے درمیان میں تھی اور پھر تینوں آنکھیں مانند انگارہ ہورہی تھیں، اور ساتھ ہی اس کے دو دانت ہاتھی جیسے باہر کو نکلے پڑے تھے، وہ میری طرف تیزی سے بڑھا تاکہ میری گردن دبادے اور پھر خوف و دہشت سے میری چیخ نکل گئی، اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔"

رضیہ کی بات سن کر خالہ بولیں۔ "ارے بیٹا ہوسکتا ہے کہ تو ویسے ہی ڈر گئی ہوگی، یہ تیرا وہم بھی ہوسکتا ہے، خیر ایسی کوئی بات نہیں چل تو میرے پاس تھوڑی دیر بیٹھنا تو تیری طبیعت مزید ٹھیک ہوجائے گی......

خیر دن بڑی تیزی سے گزر گیا...... اور شام ہونے سے پہلے رضیہ اپنے گھر چلی گئی...... ویسے رضیہ کا گھر پڑوس میں تھا۔ خالہ کے کافی سمجھانے پر رضیہ کے دماغ سے خوف و ہراس نکل گیا اور رضیہ یہ سمجھ گئی کہ ہوسکتا ہے جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کا وہم ہو۔

شام کے بعد رات کا اندھیرا ہر سو مسلط ہوگیا تھا، ڈوبتے چاند کی تاریک راتیں تھیں اور پھر اوپر سے بوندا باندی ہورہی تھی...... گھر کے سارے مکین اپنے اپنے کمروں میں محو خواب تھے، چندا اپنے کمرے میں نیند کے مزے لے رہی تھی کہ اچانک وہ خواب کی وادی میں پہنچ گئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ پہلے دن کی طرح پھولوں کے باغ میں کھڑی ہے۔ رنگ برنگے پھول کھلے ہیں، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا کو معطر کررہی ہے۔

اتنے میں اس نے محسوس کیا کہ بگھی میں جتنے گھوڑے بگھی کو کھینچتے ہوئے لارہے ہیں دور سے آتی ہوئی بگھی واضح ہوئی اور پھر اس طرح آگے کو بڑھتے ہوئے اس کے قریب آکر رک گئی۔ بگھی کا کوچوان واضح نہیں تھا ایک ہیولہ کی صورت میں موجود تھا۔

بگھی زمین سے دو فٹ اوپر فضا میں معلق تھی اور بگھی میں وہی شہزادہ مسکراتے ہوئے نظر آیا...... پھر

شہزادے کی آواز سنائی دی۔ ”شہزادی تشریف لے آئیں۔“
یہ سنتا تھا کہ مسکراتے ہوئے چندا بگھی کے پائیدان پر پاؤں رکھنے کے لئے آگے بڑھی تو شہزادہ نے اپنا ہاتھ آگے کو کر دیا اور پھر چندا شہزادے کے ہاتھ کا سہارا لے کر بگھی پر چڑھ گئی۔
اس کے بعد بگھی میں چندا کے بیٹھتے ہی بگھی کو اشارہ ملتے ہی بگھی ایک نامعلوم منزل کی طرف ہوا میں معلق آگے ہی آگے بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔
چندا کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ عیاں تھی اور شہزادہ نے بغور اپنی نگاہیں چندا پر مرکوز کر رکھی تھیں۔
چندا اپنے اندر بہت ہی فرحت محسوس کر رہی تھی...... ایسا منظر جو کہ ناقابل بیان تھا...... براق سفید گھوڑے اور سفید ہی بگھی اور سفید بادلوں میں بگھی سرپٹ دوڑتی چلی جارہی تھی کہ پھر اچانک آٹھوں کے آٹھوں گھوڑے ہنہنائے اور بگھی زوردار ہچکولے کھا کے رک گئی، بگھی اتنے زور سے رکی تھی کہ چندا اور شہزادہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور بگھی کے سامنے حصہ سے ٹکرا گئے۔
اتنے میں کوچوان کی آواز سنائی دی۔ ”حضور آگے خون کا دریا ہے۔“
اس وقت کوچوان کی آواز چندا نے سن لی تھی کیونکہ کوچوان نے انجان زبان میں نہیں بلکہ چندا کی زبان استعمال کی تھی۔
اور پھر اچانک چندا کی آنکھ کھل گئی...... چندا اپنے بستر پر براجمان تھی اور نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔
چندا خواب سے بیدار ہو کر تھر تھر کانپنے لگی......
چندا کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی...... کمرے میں لائٹ بدستور جل رہی تھی۔
چندا کو عادت تھی کہ وہ اپنے کمرے میں لائٹ جلا کر سوتی تھی......
جسم پر کپکپی طاری تھی...... دماغ جھنجھنا رہا تھا...... اور آنکھیں چھت پر ٹکی پڑی تھیں۔
چندا بہت زیادہ سہمی ہوئی اور اچنبھے میں تھی۔
اس کا ذہن بڑی تیزی سے خواب کے متعلق سوچ رہا تھا۔
وہ خواب کے متعلق سوچ سوچ کر خوف و ہراس میں مبتلا ہوگئی تھی۔
وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی اور دل اس کا بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
دل تھا کہ قابو سے باہر ہونے پر زور دے رہا تھا۔
وہ اس قدر سہم گئی تھی کہ اس سے کسی قسم کی بھی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔
آنکھوں کی حالت ایسی کہ جیسے پتھرا گئی ہوں۔
ایسا لگتا تھا کہ پورے جسم میں لہو منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔
دونوں آنکھیں کھلی پڑی تھیں اور آنکھوں میں خواب بیدار تھا۔
وہ اس قابل بھی نہ تھی کہ کسی کو آواز بھی دے سکے۔
لاکھ کوشش کے باوجود بھی زبان بولنے پر قادر نہیں ہو رہی تھی۔
وہ چاروں شانے چت لیٹی تھی۔
وہ چاہتی تھی کہ کسی طرف بھی کروٹ لے مگر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو پا رہی تھی۔
وہ ہر طرح سے بے سدھ تھی۔
آنکھوں کی پتلیاں بھی بے حس و حرکت ایک ہی جگہ ٹکی پڑی تھیں۔
اس کے دماغ میں بار بار آواز گونج رہی تھی۔
”حضور آگے خون کا دریا ہے۔“
اس کے دماغ میں پوری فلم چل رہی تھی کہ کوچوان کی آواز سنتے ہی شہزادہ بدحواس ہو گیا تھا۔
شہزادہ کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں واضح نظر آرہی تھیں۔
لاکھ کوشش کے باوجود بھی چندا اپنے حواس کو قابو کرنے سے قاصر تھی۔
پھر اس کے دماغ میں آیا کہ ”میں کروں تو کیا کروں۔“
وہ کون تھا شہزادہ؟
میرا اور اس شہزادے کا تعلق کیا ہے؟

وہ شہزادہ بار بار میرے خواب میں کیوں آرہا ہے۔
اس خواب کی تعبیر آخر کیا ہے؟
کہیں ایسا تو نہیں کہ اس خواب کے تحت میرا سکھ چین چھن جائے۔
کہیں ایسا تو نہیں کہ اس خواب کی تعبیر بہت بھیانک ہو۔
خواب میں خون کا دریا دیکھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔
''مجھے اپنے آپ پر قابو پانا ہوگا۔'' اور یہ سوچ دماغ میں آتے ہی یکدم اس کے منہ سے نکلا۔ ''یااللہ''
منہ سے الفاظ ''اللہ'' نکلتے ہی پورا جسم لرز گیا اور پھر ساتھ ہی وہ جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ چند منٹ وہ اسی حالت میں بستر پر بیٹھی رہی اس کے بعد اٹھی اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگا کر غٹاغٹ پانی پینے لگی۔
ٹھنڈا پانی پی کر جب اس کی طبیعت بھر گئی تو بوتل کو فریج میں رکھا اور پھر نڈھال قدموں سے چلتی ہوئی بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ کوئی پون گھنٹہ تک وہ بے سدھ سی بیٹھی رہی لیکن اس کا دماغ متواتر خواب کے متعلق سوچتا رہا اور جب وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائی تو بستر پر لیٹ گئی اور کروٹیں بدلنے لگی، پھر نہ جانے کب وہ نیند کی وادی میں پہنچ گئی۔
صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی جس کی وجہ سے وہ آج اسکول نہ گئی اس کی بوجھل آنکھیں اور جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس کی امی نے سوال کیا اسکول نہ جانے کا تو اس نے طبیعت کی ناسازی کا بتا کر انہیں مطمئن کردیا۔
منہ ہاتھ دھویا اور چند بسکٹ کھا کر چائے پی لی، اس کے بعد اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی، آج رات میں نظر آنے والا خواب اسے مسلسل پریشان کررہا تھا۔ شہزادہ کے ساتھ بگھی میں اڑتے ہوئے جانا اور پھر اچانک بگھی کا رک جانا اور ہمر کوچوان کی آواز کہ ''حضور آگے خون کا دریا ہے۔''
اور سب سے زیادہ وہ پریشان اسی لئے تھی کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ ''خون کا دریا۔''
''خون کا دریا..... خون کا دریا..... اور پھر بگھی کا اچانک رک جانا۔'' وہ اسی ادھیڑ بن میں الجھتی رہی۔
یہ تو اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ''خون کا دریا کا نظر آنا۔ یقیناً باعث پریشانی ہے مگر کس کی پریشانی اور کہاں کی پریشانی۔
اور پھر دور دراز سے پھولوں کے باغ سے شہزادہ کے ساتھ بگھی میں بیٹھنا.....
''آخر وہ شہزادہ ہے کون؟''
''اور اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟''
یہی وہ سوالات تھے جو اس کے دماغ میں ہتھوڑے برساتے رہے۔
وقت دھیرے دھیرے آگے کو سرکتا رہا اور پھر دن کے دو بج گئے۔ وہ اپنے کمرے میں تھی کہ اچانک باہر عائشہ کی آواز سنائی دی۔
''ارے چندا کی بچی آج تو اسکول کیوں نہیں آئی۔'' اور پھر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ چندا اپنے بستر پر براجمان تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔
''چندا یہ کیا معاملہ ہے..... میں اسکول میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور پھر تنگ آ کر آخری پریڈ چھوڑ کر آگئی۔'' عائشہ کی باتیں سن کر چندا اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور ایک بہت لمبا سانس کھینچتے ہوئے بولی۔ ''یار آج میری طبیعت ٹھیک نہیں اس بنا پر اسکول نہیں آئی۔''
لیکن عائشہ کی نظریں بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں وہ بولی۔ ''بیگم چندا..... میرا دل یہ ماننے کو نہیں دے رہا ہے کہ تمہاری طبیعت ناساز ہے بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ تم ذہنی طور پر الجھی ہوئی ہو۔''
''عائشہ تیری بات درست ہے..... میں واقعی ذہنی طور پر کچھ زیادہ ہی الجھی ہوئی ہوں.....'' اور پھر چندا نے رات میں نظر آنے والے خواب کو من وعن پورے کا پورا عائشہ کے گوش گزار کردیا۔
خواب کا سن کر عائشہ چند منٹ خاموش رہی پھر بولی۔ ''چندا تو مان یا نہ مان کوئی ایسا ہے جو اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے اپنے دل و دماغ میں تیرا تصور لئے

بیٹھا ہے...... اور ہو سکتا ہے کہ کچھ وقت بعد تو بھی اس کی طرف راغب ہو جائے۔

اور پھر آج کا خواب کہ ''خون کا دریا'' تو اس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ پریشانی اور رکاوٹ یا پھر جان جوکھوں کا مسئلہ بھی سامنے آ جائے۔''

''عائشہ میں رات سے ہی خواب کے چکر میں الجھی ہوئی ہوں۔'' چندا بولی۔

''چندا بیگم خواب واب کے چکر کو چھوڑو اور حقیقت کی دنیا میں رہو۔ اور ویسے بھی میرا قیمتی مشورہ ہے کہ تو قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپے پر بھرپور نظر ڈال...... تیرا جسمانی نشیب و فراز نوجوانوں کو پاگل کر دینے کے لئے کافی ہے...... میں یقین سے کہتی ہوں کہ تجھ پر نظر پڑتے ہی نوجوانوں کے دل کی دھڑکنیں بے قرار ہو جاتی ہوں گی۔

تو بلوراتی اس کے لئے میرا مشورہ مان لو...... اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننا شروع کر دو...... اس میں تمہاری بھلائی ہے...... اور اب اس موضوع پر لیکچر ختم۔

مجھے سخت بھوک لگی ہے اور اب تم فوراً سے پیشتر کھانے کا بندوبست کرو...... کیونکہ میرے پیٹ میں اب بھوک کے چوہے بے قابو ہونے والے ہیں۔''

''اچھا بھئی تھوڑا صبر کر...... میں کھانے کا انتظام کرتی ہوں......'' اور پھر چندا نے اپنی ملازمہ زرینہ کو آواز دے کر بولی کہ فوراً کھانا لگا دے۔

خیر فوراً زرینہ نے کھانا لگا دیا اور بولی۔ ''چندا بی بی کھانا لگ گیا ہے۔'' اس کے بعد دونوں نے کھانا کھایا۔ اس سے پہلے چندا کے گھر والوں نے دوپہر کا کھانا ایک بجے کھا لیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد چندا اپنے کمرے میں آ گئی...... ساتھ ہی عائشہ بھی کمرے میں آئی تو چندا بولی۔ ''یار کل اسکول کی چھٹی ہے...... میرا تو دل کر رہا ہے کہ میں پارک میں جاؤں اور تیرے لئے حکم ہے کہ میرے ساتھ پارک میں چلنا ہے۔''

یہ سن کر عائشہ بولی۔ ''اچھا بابا...... حکم سر آنکھوں پر......'' اور یہ بول کر عائشہ اپنے گھر جانے کے لئے چندا کے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

دوسرے دن چار بجے بگھی میں سوار ہو کر چندا، عائشہ، خوشبو اور کرن پارک میں پہنچ گئیں۔ پارک میں پہنچ کر عائشہ، خوشبو اور کرن تو اپنے معمولات میں لگ گئیں اور چندا حسب منشاء پھولوں کی کیاریوں کے پاس بیٹھ کر پھولوں کو دیکھنے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے اٹھی اور بارہ دری میں آ کر بیٹھ گئی...... ویسے بھی چندا جب بھی پارک میں آتی تو بارہ دری میں گھنٹوں بیٹھی رہتی...... بارہ دری میں اسے واقعی قلبی سکون ملتا تھا۔

بارہ دری میں بیٹھے بیٹھے اسے اچانک ایسا لگا کہ کوئی اس کے ارد گرد منڈلا رہا ہے...... یہ محسوس کرتے ہی اس نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ بہت حیران ہوئی اور پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر سر کو جھٹک دیا اور پھر اطمینان سے بیٹھ گئی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے پھر محسوس ہوا کہ کوئی نادیدہ ہستی اس کے بہت قریب ہے، یہ محسوس کرتے ہی اس نے جھٹ اپنی آنکھیں کھول دیں اور اس کے منہ سے تیزی سے نکلا۔ ''کون؟''

اس کے فوراً بعد بہت دھیمی آواز میں بہت واضح سرگوشی سنائی دی۔ ''آپ کا محافظ۔''

یہ سنتے ہی چندا اندرونی طور پر اتھل پتھل ہو گئی...... لمبے لمبے سانس لینے لگی...... اب تو وہ اچنبھے میں پڑ چکی تھی...... وہ حیرانی سے ادھر ادھر اپنی نظریں دوڑا رہی تھی کہ ایسا تو نہیں کہ کوئی یہ بول کر چھپ گیا ہو۔ مگر وہاں کوئی ہوتا تو اسے نظر آتا۔ پھر اس نے سوچا ہو سکتا ہے۔ ''کوئی بارہ دری کے باہر موجود ہو۔'' اور پھر اس کے پیش نظر وہ بارہ دری سے باہر نکل آئی اور چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی مگر بے سود، کوئی بھی نظر نہیں آیا، پھر اسے سرگوشی سنائی دی۔ ''گھبرائیں نہیں...... میں آپ کا محافظ ہوں۔''

(جاری ہے)

نشانِ عبرت

ضرغام محمود۔ کراچی

اچانك جب نوجوان کی نظر اپنے ھتھ پر پڑی تو اس کی فلك شگاف چیخ نکل گئی اور ساتھ ھی اس کی نظریں بھی دھندلانے لگیں اور پھر دیکھتے ھی دیکھتے اس کی آواز بھی حلق میں پھنس کر رہ گئی اور پھر......

حرص وطمع کے دلدادہ لوگوں کیلئے جسم وجاں کو تھراتی اور جسم کے رونگٹے کھڑے کرتی کہانی

پروفیسر اینڈرسن اس وقت کمرہ عدالت میں بیٹھے تھے، پروفیسر اینڈرسن تقریباً ساٹھ سال کے منحنی سے آدمی تھے انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ جینٹکس سائنس کے بہترین دماغ ہے جنہوں نے جینٹکس سائنس میں انقلابی نظریات پیش کیے ہیں، خاص طور پر ان کی تحقیق کے نتیجے میں بننے والی اس دوائی نے دنیا میں تہلکہ مچادیا جس کی وجہ سے دودھ دینے والے جانوروں کی زندگی میں تین گنا اضافہ ہوگیا اور ان جانوروں کی زندگی نہایت طویل ہوگئی تھی۔ مگر اس وقت پروفیسر اینڈرسن کمرہ عدالت میں بیٹھے تھے جہاں ان کے اکلوتے بھانجے پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا پروفیسر اینڈرسن کے بھانجے جوزف پر اپنی ماں کے قتل کا الزام ہے پروفیسر اینڈرسن کو یقین تھا کہ جوزف نے اپنی ماں کا قتل کیا ہے مگر اس نے قتل اتنی خوب صورتی سے کیا تھا کہ وہ ایک حادثہ لگ رہا تھا مگر پروفیسر اینڈرسن جانتے تھے کہ جوزف کس مزاج کا شخص ہے وہ دولت کے لئے کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے کسی کو بھی قتل کرسکتا ہے حتیٰ کہ اپنی ماں کا خون بھی کرسکتا ہے۔

جوزف وائنڈ ایک عیاش شخص ہے اسے لڑکیوں اور

جوئے کا چسکہ ہے اس کی وجہ سے وہ قرضے میں ڈوبا ہوا تھا اور قرض خواہ اس کو مسلسل تنگ کررہے تھے مگر اس کی ماں اسے ہر ماہ مخصوص رقم دیتی تھی اور اس رقم میں جوزف کا گزارا نہیں ہوتا تھا اس لئے آئے دن اس کا اپنی ماں سے رقم کے معاملے پر جھگڑا ہوتا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر پروفیسر اینڈرسن کو یقین تھا کہ جوزف نے اپنی ماں کو قتل کیا ہے۔

پروفیسر اینڈرسن کی بہن یعنی جوزف وائلڈ کی ماں ایک کار حادثے میں ہلاک ہوئی اور اس کار کو حادثے کے وقت جوزف ڈرائیو کررہا تھا، کار سڑک کنارے کھڑے ٹرالر سے اس طرح ٹکرائی کہ جس سائیڈ پروفیسر اینڈرسن کی بہن بیٹھی تھی کار کی وہ سائیڈ بری طرح پچک گئی اور دوسری سائیڈ پر بیٹھے جوزف کو سوائے چند معمولی چوٹوں کے کوئی نقصان نہیں پہنچا جب پروفیسر اینڈرسن نے اپنی بہن کی مسخ لاش دیکھی تو انہیں بہت دکھ ہوا لاش کا چہرہ اس بری طرح مسخ ہوگیا تھا کہ پہچانا نہیں جارہا تھا، بڑی مشکل سے لاش کو تابوت میں رکھ کر دفنایا گیا۔

پروفیسر اینڈرسن کی درخواست پر ہی جوزف کے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہوا اور آج...... اس مقدمے کا فیصلہ تھا۔ جیوری کے اراکین نے فیصلہ سنانے سے پہلے وقفہ لیا اور جیوری کے تمام ارکان اٹھ کر چیمبر میں چلے گئے۔ انہیں گئے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ حاضرین بھی اکتانے لگے اور ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔

جج صاحب، اور جیوری کے اراکین جب کمرہ عدالت میں واپس آئے تو عدالت کے چند اہلکار، پولیس اور میڈیا کے چند نمائندے کے ساتھ پروفیسر اینڈرسن ہی باقی رہ گئے۔ جیوری کے ارکان اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے پھر انہوں نے لکھا ہوا فیصلہ جج صاحب کے حوالے کیا جو جج صاحب نے بلند آواز میں پڑھا۔

فیصلے میں کئی نکات اٹھائے گئے تھے۔ پروفیسر اینڈرسن کو ان نکات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر فیصلے کے اختتام پر جج صاحب نے جوزف کو اپنی ماں کے قتل کے الزام سے باعزت بری کردیا اور اس کی ماں یعنی پروفیسر کی بہن کی موت کو ایک اتفاقی حادثہ قرار دے دیا۔ ملزم جوزف کو فوری طور پر رہا کرنے کا حکم صادر ہوا اور جوزف کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ اس فیصلے سے پروفیسر اینڈرسن کو سخت مایوسی ہوئی وہ جوزف کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے مگر ایسا نہیں ہوا۔ جوزف کی ہتھکڑی کھول دی گئی اور وہ لوگوں سے مبارکباد وصول کرنے لگا پھر جوزف کی نظر پروفیسر اینڈرسن کی جانب اٹھی اور آہستہ سے چلتا ہوا پروفیسر اینڈرسن کے پاس پہنچا اور بولا۔ ”ہیلو انکل......“

پروفیسر اینڈرسن نے اسے کوئی جواب نہیں دیا بس چپ چاپ اسے گھورتے رہے۔

”انکل آپ کو تو اس فیصلے سے بہت مایوسی ہوئی ہوگی آپ کی خواہش تھی کہ میں پھانسی چڑھ جاؤں تاکہ آپ ساری جائیداد کے مالک بن جائیں......“

”میری مایوسی کی وجہ جائیداد نہیں ہے خدا کا دیا بہت کچھ ہے میرے پاس، میرے کون سے بیوی بچے میری جان کو رورہے ہیں جو میں پیسے کی ہوس کروں...... میرے پاس کافی جائیداد ہیں۔“ پروفیسر اینڈرسن بولے۔

”ہاں...... آپ نے اپنی آدھی جائیداد کو فالتو تجربوں میں اڑا دیا ہے اور باقی آدھی جائیداد بھی اڑا دیں گے......“ جوزف چہک کر بولا۔ ”میں تو تجربات کرتا ہوں مگر تم...... اپنی ساری جائیداد لڑکیوں اور جوئے میں اڑا دو گے......“ پروفیسر اینڈرسن نے جواب دیا اور کمرۂ عدالت سے باہر کی جانب چل دیئے۔

☆......☆......☆

پروفیسر اینڈرسن جینیٹکس سائنس کے پروفیسر تھے پہلے وہ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے مگر پھر انہوں نے ریٹائرمنٹ لے کر یہ بڑا سا مکان بنالیا اس مکان میں ایک انتہائی جدید لیبارٹری بھی قائم کرلی اب پروفیسر اینڈرسن کا زیادہ تر وقت اسی لیبارٹری میں گزرتا تھا جہاں وہ اپنے تجربے کرتے رہتے تھے۔ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی اتنی جائیداد تھی کہ پروفیسر اینڈرسن کا گزارا آرام سے ہوجاتا تھا دراصل پروفیسر اینڈرسن کافی عرصے سے یہ تحقیق کررہے تھے کہ کسی طرح انسانی زندگی طویل کرسکیں وہ موت پر فتح پانا چاہتے تھے۔ عدالت کے فیصلے سے پروفیسر اینڈرسن کو افسوس تو

بہت ہوا مگر انہوں نے اس فیصلے کو چپ چاپ مان لیا۔ وہ اپنے بھانجے کو سخت ناپسند کرتے تھے انہیں اپنی چھوٹی بہن کی موت کا بہت صدمہ تھا مگر وہ بے بس تھے۔

عدالت کے فیصلے کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا وہ خاموش ہوگئے اور اپنے آپ کو تحقیقی کاموں میں اتنا مصروف کرلیا کہ وہ سب کچھ بھول گئے۔ مگر اس واقعے کے پانچ سال بعد جب موسم انتہائی شدید تھا اور مسلسل برف باری ہورہی تھی، پروفیسر اینڈرسن کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ پروفیسر اینڈرسن نے دروازہ کھولا تو جوزف نے انہیں مسکراتے ہوئے سلام کیا اور گھر میں داخل ہوگیا۔ پروفیسر اینڈرسن چند لمحے خاموشی سے اس کا جائزہ لیتے رہے، جوزف کچھ زیادہ اچھی حالت میں نہیں تھا اس نے موسم کی شدت کے لحاظ سے گرم کپڑے بھی نہیں پہنے ہوئے تھے۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو......؟'' پروفیسر اینڈرسن نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''انکل...... اس بھری دنیا میں آپ میرے واحد رشتے دار ہیں، لہٰذا میں اور کہاں جاؤں گا......'' جوزف نے اپنا سفری بیگ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتا پھر بھی تم میرے گھر آئے ہو۔'' پروفیسر اینڈرسن کا لہجہ بدستور درشت تھا۔

''انکل پلیز...... صرف چند دن! موسم ٹھیک ہوتے ہی میں چلا جاؤں گا۔''

''تو...... تم نے وراثت میں ملنے والی دولت کا کیا کیا؟'' پروفیسر اینڈرسن کے لہجے میں حیرت تھی۔

''مجھے کچھ غلط قسم کے لوگ مل گئے تھے۔''

''غلط قسم کے لوگ یا...... غلط قسم کی لڑکیاں...... جو تمہارا سارا پیسہ ہڑپ کرکے تمہیں چھوڑ کر چلی گئیں......''

''انکل...... اب مجھے عقل آگئی ہے...... میں سدھر گیا ہوں۔'' جوزف بولا۔

''سنو اگر تم میرے پاس اس لئے آئے ہو کہ میں تمہیں کچھ رقم دوں گا تو اس غلط فہمی میں نہ رہنا میں تمہیں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دینے والا۔ یہ بات تم اپنی گرہ میں باندھ لو......'' پروفیسر اینڈرسن بولے۔

''میں آپ سے پیسے مانگنے نہیں آیا ہوں۔ بس آپ کچھ دنوں کے لئے مجھے یہاں رہنے دیں......''

''کہیں تم کوئی جرم کرکے تو نہیں بھاگے ہو...... اور پولیس سے چھپنے کے لئے میرے مکان میں پناہ لے رہے ہو۔'' پروفیسر اینڈرسن نے مشکوک لہجے میں کہا۔

''نہیں...... نہیں انکل...... میں اپنی مرحومہ ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا...... بس یہ سردیوں کا موسم آپ یہاں گزارنے دیں......'' جوزف نے جلدی جلدی کہا۔

پروفیسر اینڈرسن نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھا موسم بہت خراب تھا، ہر سو بہت سرد اور تیز ہوا چل رہی تھی یقیناً یہ ہوا رگوں میں خون جما رہی ہوگی۔

''ٹھیک ہے، تم چند دن یہاں رک سکتے ہو مگر یہاں شرافت سے رہنا میرا ایک دوست بھی پولینڈ سے آیا ہے مجھ سے ملنے...... مجھے امید ہے تم سے مجھے یا میرے دوست کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اور آپ کے دوست کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' جوزف نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا ایک کپ چائے مل سکتی ہے۔'' تھوڑی دیر بعد جوزف پھر گویا ہوا۔

''یہاں ایک ملازمہ کام کرتی ہے جو صبح آتی ہے اور شام کو واپس چلی جاتی ہے اگر تمہیں چائے کی طلب ہورہی ہے تو کچن اس طرف ہے خود چائے بنالو۔'' پروفیسر اینڈرسن نے کچن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں خود چائے بنالیتا ہوں۔'' جوزف کچن کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔ ''انکل آپ بھی چائے پئیں گے۔''

''نہیں مجھے طلب نہیں ہے۔'' پروفیسر اینڈرسن نے جواب دیا اور اپنی زیر مطالعہ کتاب اٹھا کر پڑھنے لگے۔ جوزف کندھے اچکاتا ہوا کچن کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

پروفیسر اینڈرسن کی لیبارٹری پوری طرح روشن تھی یہ

ایک اعلیٰ درجے کی لیبارٹری تھی، پروفیسر اینڈرسن بہت غور سے شیشے کے جار میں ابلتے ہوئے سنہری محلول کو دیکھ رہے تھے جو رفتہ رفتہ اپنا رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ پروفیسر اینڈرسن کے علاوہ اس وقت، لیبارٹری میں پروفیسر اینڈرسن کے دوست جیمس موٹیل اور پروفیسر اینڈرسن کا بھانجا جوزف وائلڈ بھی موجود تھے وہ دونوں انہماک سے پروفیسر اینڈرسن کے تجربے کو دیکھ رہے تھے۔

پروفیسر اینڈرسن برسوں سے اس تجربے پر محنت کر رہے تھے...... وہ آب حیات بنانے کے جنون میں مبتلا تھے اور اس جنون میں، وہ اپنی آدھی جائیداد پھونک چکے تھے مگر انہیں اب تک کامیابی نہیں ہوئی تھی لیکن...... آج کامیابی ان کے نزدیک تھی۔

''کیا پروفیسر اینڈرسن آب حیات بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے......؟'' یہ سوال جیمس موٹیل کے ذہن میں گونج رہا تھا اس نے صرف آب حیات کے چکر میں پروفیسر اینڈرسن سے دوستی کی تھی۔

پروفیسر اینڈرسن کی نظریں جار پر جمی ہوئی تھیں، جار کا سنہری محلول پہلے سفید رنگ میں تبدیل ہوا پھر زرد رنگ میں بدل گیا۔ اچانک پروفیسر اینڈرسن کا قہقہہ لیبارٹری میں گونجا۔

''ہاہاہا...... آج میں کامیاب ہو گیا۔ دیکھو میں نے آب حیات تیار کر لیا۔'' پروفیسر اینڈرسن خوشی سے چیختے ہوئے بولے پھر انہوں نے جار چولہے پر سے اتارا اور اس میں موجود زرد رنگ کے محلول کو ایک شیشے کی صراحی میں انڈیلا اور صراحی کو گردن سے پکڑ کر جوزف اور جیمس کے پاس آئے اور صراحی کو ان کے سامنے لہراتے ہوئے کہنے لگے۔

''دنیا مجھے دیوانہ، پاگل، خبطی اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہی مگر میں بھی دھن کا پکا تھا اور آخر کار کامیابی مجھے مل ہی گئی...... میں نے ابدی زندگی کا راز پالیا۔ اس صراحی میں موجود محلول آب حیات ہے جو کسی بھی ایک انسان کو ابدی زندگی دے سکتا ہے پھر اسے کبھی موت نہیں آئے گی، اس پر بڑھاپا نہیں چھائے گا اس کے حواس ہمیشہ قوی رہیں گے۔ ہا ہاہا......''

''پروفیسر اینڈرسن میں تمہیں اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اگر تم یہ آب حیات میرے ہاتھوں فروخت کر دو تو میں تمہیں دو کروڑ ڈالر دے سکتا ہوں۔'' جیمس موٹیل نے پروفیسر اینڈرسن کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا مگر پروفیسر اینڈرسن نے کوئی جواب نہیں دیا وہ عجیب نظروں سے جیمس موٹیل کو گھورنے لگے۔

''ٹھیک ہے دو کروڑ ڈالر کم ہے تو میں تمہیں پانچ کروڑ ڈالر کی پیشکش کرتا ہوں۔'' جیمس موٹیل پروفیسر اینڈرسن کو خاموش دیکھ کر پھر بولا۔

''صرف پانچ کروڑ ڈالر......'' پروفیسر اینڈرسن طنزیہ لہجے میں بولے اور صراحی کو احتیاط سے شوکیس میں رکھنے لگے۔

''میں اس آب حیات کے دس کروڑ ڈالر دیتا ہوں۔'' جیمس موٹیل نے پھر کہا۔

''نہیں میرے معزز دوست...... اس آب حیات کی کوئی قیمت نہیں ہے یہ انمول ہے اگر دنیا کی تمام دولت بھی میرے قدموں میں رکھ دی جائے تو بھی میں یہ آب حیات نہیں بیچوں گا...... اس آب حیات پر صرف اور صرف میرا نام لکھا ہے...... ہاہاہا......'' پروفیسر اینڈرسن پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگے تھوڑی دیر ہنسنے کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

''یہ آب حیات کل تک استعمال کے قابل ہو جائے گا اور کل تیرہ تاریخ ہے...... ہاہاہا...... تیرہ تاریخ کو لوگ منحوس کہتے ہیں مگر اسی تیرہ تاریخ کو میری ابدی زندگی کی شروعات ہوگی...... میں کل تم دونوں کے سامنے یہ آب حیات نوش کروں گا......''

☆......☆......☆

نجانے رات کا کون سا پہر تھا ایک سایہ پروفیسر اینڈرسن کی لیبارٹری کی جانب بڑھا لیبارٹری کے دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے جیب سے ایک تار نکالا اور لیبارٹری کے تالے کو اس تار کی مدد سے کھولنے کی کوشش کرنے لگا تھوڑی دیر بعد ہلکی سی کھٹاک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا وہ سایہ دروازہ کھول کر لیبارٹری میں داخل ہو گیا۔ لیبارٹری میں زیرو واٹ کا بلب جل رہا تھا جس کی ملگجی روشنی میں ہر منظر

واضح تھا وہ سایہ آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ چلتا ہوا اس شوکیس کے سامنے پہنچا جہاں صراحی میں آب حیات رکھا تھا۔ یہ پروفیسر اینڈرسن کا بھانجا جوزف وائلڈ تھا۔ جوزف کے ہاتھ میں دو بوتلیں تھیں ایک بوتل خالی تھی جبکہ دوسری بوتل میں زرد رنگ کا محلول بھرا ہوا تھا۔ جوزف شوکیس کے پاس پہنچ کر رکا پھر اس نے شوکیس کا شیشہ ہٹایا اور احتیاط کے ساتھ آب حیات کی صراحی شوکیس سے باہر نکالی اور صراحی میں موجود آب حیات کا محلول اپنے پاس موجود خالی بوتل میں انڈیل لیا اور اپنے پاس موجود دوسری بوتل کا محلول جو دیکھنے میں بالکل آب حیات جیسا لگ رہا تھا وہ محلول آب حیات والی صراحی میں ڈال کر اور صراحی کو شوکیس میں رکھ کر شوکیس کا شیشہ بند کر دیا پھر دونوں بوتلوں کو اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور احتیاط کے ساتھ لیبارٹری کے دروازے کی جانب بڑھا۔

"انکل...... اب صبح جب تم آب حیات پیو گے تو وہ آب حیات تمہیں زندگی دینے کے بجائے موت سے ہمکنار کر دے گا...... کیونکہ آب حیات والی صراحی میں زہر ہے زہر......" جوزف ہنستا ہوا لیبارٹری سے باہر چلا گیا۔

ابھی جوزف کو لیبارٹری سے گئے ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ ایک بار پھر لیبارٹری کا دروازہ کھلا اور پھر ایک سایہ لیبارٹری میں داخل ہوا یہ پروفیسر اینڈرسن کا دوست جیمس موٹیل تھا جیمس موٹیل کے ہاتھ میں دو بوتلیں تھیں ایک بوتل خالی اور دوسری بوتل میں زرد رنگ کا محلول بھرا ہوا تھا وہ بھی احتیاط سے چلتا ہوا شوکیس کے پاس پہنچا اور شوکیس کا شیشہ ہٹا کر آب حیات والی صراحی نکالی اور صراحی میں موجود محلول کو آب حیات سمجھ کر اپنے پاس موجود خالی بوتل میں انڈیلا اور دوسری بوتل کا محلول اس نے صراحی میں ڈالا اور صراحی کو احتیاط کے ساتھ شوکیس میں رکھ کر شوکیس کا شیشہ بند کر دیا۔

"ہاہاہا...... پروفیسر بھی کتنا بڑا احمق ہے جس نے دس کروڑ ڈالر کی رقم ٹھکرا دی اب تو میں مفت میں آب حیات لے کر جا رہا ہوں کل...... کل صبح جب وہ احمق پروفیسر صراحی میں رکھا محلول آب حیات سمجھ کر پیئے گا تو اسے پتا چل جائے گا کہ صراحی میں آب حیات نہیں زہر ہے زہر......"

جیمس موٹیل بھی ہنستا ہوا لیبارٹری سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح سویرے پروفیسر اینڈرسن اور جیمس موٹیل لیبارٹری میں موجود تھے۔

"کیا بات ہے، جوزف ابھی تک کیوں نہیں آیا......؟" پروفیسر اینڈرسن نے جیمس موٹیل سے پوچھا۔

"میں نے اس کے کمرے میں جھانکا تھا وہ اوندھا لیٹا سو رہا تھا۔" جیمس موٹیل نے جواب دیا۔

"اوہ...... یہاں آب حیات پینے کا وقت ہوا جا رہا ہے ذرا سی دیر خطرناک ہو سکتی ہے۔" پروفیسر اینڈرسن نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ...... آب حیات نوش فرمائیں...... نہ جانے جوزف کب آئے۔" جیمس موٹیل نے کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" پروفیسر اینڈرسن نے شوکیس کا شیشہ ہٹا کر آب حیات کی صراحی نکالی اور صراحی میں موجود محلول کو ایک گلاس میں انڈیلا پھر دوسری طرف رکھی الماری کو کھولا اور اس میں سے ایک شیشی نکالی اور اس شیشی کا کارک کھولنے لگے۔

"یہ بوتل بہت اہم ہے اس بوتل میں پوٹاشیم کلورائیڈ کو آکسیجن کی خاص مقدار کے ساتھ ملا کر کیمیائی عمل سے گزارا گیا ہے اگر اس شیشی میں موجود مائع کے دو قطرے اس آب حیات میں نہ ملائے جائیں تو یہ آب حیات زندگی دینے کے بجائے زندگی لے لے گا۔" اتنا کہہ کر پروفیسر اینڈرسن نے اس شیشی میں سے دو قطرے گلاس کے محلول میں ملائے اور بوتل بند کر کے دوبارہ الماری میں رکھ دی اور گلاس کو اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔

"ہاہاہا...... آج...... آج میں نے موت پر فتح حاصل کر لی آج یہ آب حیات پی کر میں ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو جاؤں گا...... میں نے قدرت کو شکست دے دی۔ آسمانی کتابیں کہتی ہیں کہ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے ہر زندگی کا اختتام موت کے دروازے پر ہوتا ہے مگر میں نے قدرت کے اس اٹل قانون کو توڑ دیا، میں نے موت کو شکست دے دی...... ہاہاہا......"

اتنا کہہ کر پروفیسر اینڈرسن نے گلاس کو منہ سے لگالیا اور ایک ہی سانس میں گلاس میں موجود محلول اپنے معدے میں اتارلیا۔

”ہاہا...... میں نے موت کو شکست دے دی...... ہا ہاہا...... اونہہ...... اونہہ......“ پروفیسر اینڈرسن کا قہقہہ ایک کراہ میں تبدیل ہوگیا ان کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر لیبارٹری کے پکے فرش پر گر کے چکنا چور ہوگیا۔ ان کے ناک اور منہ سے خون نکلنے لگا، پروفیسر اینڈرسن نے اپنے ہاتھ سے اپنا منہ صاف کیا اپنا لہو دیکھ کر ان کے چہرے پر شدید حیرانی کے آثار نمایاں ہوئے، مگر وہ زیادہ دیر حیران نہ رہ سکے، حیرانگی کی جگہ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوگئے انہیں ایسا لگا جیسے ان کے جسم کو کوئی اندر ہی اندر آری سے کاٹ رہا ہو، وہ تکلیف کی شدت کی وجہ سے زمین پر بیٹھ گئے، ان کے جسم پر آبلے نکلنے لگے ان کی جلد تڑخنے لگی انہیں ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی ان کا دل مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو انہوں نے اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھنا چاہا مگر کمزوری کی وجہ سے ان کا ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکا اور وہ زمین پر گرنے لگے مگر موت کا فرشتہ ان سے بہت تیز نکلا اور پروفیسر اینڈرسن کے زمین پر گرنے سے پہلے ہی ان کی روح موت کے فرشتے نے قبض کرلی اور پروفیسر اینڈرسن کا بے جان لاشہ لیبارٹری کے فرش پر گر پڑا۔

”ہاہاہا......“ جیمس موٹیل نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک شیشی نکالتے ہوئے قہقہہ لگایا اس شیشی میں وہ محلول بھرا ہوا تھا جو جیمس موٹیل نے رات کو لیبارٹری سے چرایا تھا۔

”احمق پروفیسر میں نے تمہیں دس کروڑ ڈالر کی پیشکش کی مگر تم نے ٹھکرادی لہٰذا رات کو میں نے تمہاری غیر موجودگی میں آب حیات چرالیا اور اس کی جگہ صراحی میں زہر رکھ دیا...... ہاہاہاہا......“ جیمس اینڈرسن نے پھر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”گڈ بائے پروفیسر...... ابدی زندگی میرا انتظار کررہی ہے اب اس آب حیات کو پی کر میں زندہ جاوید ہوجاؤں گا۔“ جیمس موٹیل پھر بولا۔ مگر پروفیسر اینڈرسن اس کی بات سننے کے لئے زندہ نہ تھے۔

”اوہ کہیں آب حیات پینے میں دیر نہ ہوجائے مجھے جلدی کرنی چاہئے......“ جیمس موٹیل بڑبڑایا اور اس نے ریک سے ایک اور گلاس نکالا اور اپنے ہاتھ میں موجود شیشی کا محلول اس گلاس میں انڈیلا پھر الماری کھول کر وہ شیشی نکالی جو پروفیسر اینڈرسن نے وہاں رکھی تھی پھر اس نے شیشی میں سے دو قطرے گلاس میں ملائے اور گلاس کو اپنے ہاتھ میں پکڑلیا۔

”ہاہاہا...... اب میں زندہ جاوید ہوجاؤں گا اب مجھے موت نہیں آئے گی، اب دنیا کی ساری دولت میرے قدموں میں ہوگی...... تھینک یو پروفیسر تمہارا تجربہ میرے کام آرہا ہے......“ اتنا کہہ کر جیمس موٹیل نے گلاس منہ سے لگالیا اور گلاس میں موجود سارا محلول ایک ہی سانس میں پی لیا۔

”اوں...... ہوں......“ ایک کراہ کے ساتھ جیمس موٹیل کے ہاتھ سے گلاس گر گیا اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑلیا اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس نے گرم گرم انگارے اپنے معدے میں اتار لئے ہوں اس کے سارے بدن میں شدید جلن ہورہی تھی اس کا دل اس کے قابو سے باہر ہوتا جارہا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے دل کو کوئی چھری سے بوٹی بوٹی کررہا ہو، اس کے جسم کا ہر عضو بغاوت پر آمادہ ہوگیا تھا جیمس موٹیل لیبارٹری سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس کے پیروں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کردیا وہ دھڑام سے لیبارٹری کے فرش پر گر پڑا اس کے ناک، کان اور منہ سے خون کا فوارہ بلند ہوا۔ مرتے وقت جیمس موٹیل کے دماغ میں یہی سوال گونج رہا تھا کیا پروفیسر اینڈرسن کا تجربہ ناکام ہوگیا؟

جوزف وائلڈ ٹھیک اسی وقت لیبارٹری میں داخل ہوا جب جیمس موٹیل نے دم توڑا، لیبارٹری میں داخل ہوتے ہی جوزف ٹھٹھک گیا اسے لیبارٹری میں صرف پروفیسر اینڈرسن کی لاش کی امید تھی مگر جیمس موٹیل کیسے مرگیا یہ بات جوزف کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی، شاید دونوں نے آب حیات سمجھ کر زہر کو آدھا آدھا بانٹ لیا ہو، یقیناً یہی ہوا ہوگا۔“ جوزف

نے خود سوال کرتے ہوئے خود ہی جواب دیا۔

کل سب سے پہلے جوزف ہی نے آب حیات چرا کر صراحی میں زہر بھر دیا تھا اس نے آب حیات چرایا تو اس لئے تھا کہ وہ دس کروڑ کی خطیر رقم کے بدلے آب حیات جیمس موئیل کو بیچ دے گا مگر جب اس نے آب حیات چرالیا تو اسے خیال آیا کہ "کیوں نہ وہ خود اس آب حیات کو پی کر امر ہو جائے، دولت تو اسے اپنے انکل یعنی پروفیسر اینڈرسن کی موت سے بھی حاصل ہو جائے گی۔"

یہی سوچ کر اس نے آب حیات بیچنے کے بجائے خود استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ آب حیات کامیابی سے چرانے کی خوشی میں اس نے رات کو کافی شراب پی لی تھی لہٰذا صبح اس کی آنکھ نہ کھل سکی اور وہ دیر سے سو کر اٹھا اس لئے وہ یہ راز نہ جان سکا کہ پروفیسر اینڈرسن کے ساتھ جیمس موئیل کس طرح مر گیا۔ جوزف نے سر جھٹک کر پریشان کن خیالات سے پیچھا چھڑایا اور اپنے کوٹ کی جیب سے وہ بوتل نکالی جس میں اصل آب حیات بھرا ہوا تھا اس نے بوتل نکال کر اس کا ڈھکن کھولا۔

"ہاہاہا...... اب یہ آب حیات پی کر میں ہمیشہ کے لئے امر ہو جاؤں گا اب مجھے موت نہیں آئے گی اب مجھ پر کبھی بڑھاپا نہیں چھائے گا میں ہمیشہ جوان رہوں گا۔ اب دنیا کی ہر خوب صورت لڑکی میری بانہوں میں ہوگی...... ہاہاہا ہا......" جوزف نے خیالوں میں اپنی آئندہ زندگی کا مزہ لیا پھر اس نے بوتل کو منہ لگایا اور آب حیات پینے لگا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جب تک آب حیات میں پوٹاشیم کلورائیڈ کو آکسیجن کے ساتھ ملا کر بنائے ایک خاص محلول کے دو قطرے نہ ملائے جائیں تو یہ آب حیات آب حیات نہیں زہر حیات بن جائے گا۔ جوزف نے بوتل کو منہ لگایا اور سارا آب حیات ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔

"ہاہاہا...... اب میں امر ہو گیا ہوں۔" جوزف نے اپنے بازوؤں کو کسی باڈی بلڈر کی طرح موڑتے ہوئے کہا...... ہاہاہا..." جوزف مسلسل قہقہے لگا رہا تھا۔

اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ بے چین ہو گیا اس کے جسم میں سوزش بڑھتی جارہی تھی اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی تو اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اس کے ہاتھوں کا گوشت پگھل پگھل کر لیبارٹری کے فرش پر گر رہا تھا۔ وہ بوکھلا گیا اس نے لیبارٹری سے بھاگ جانا چاہا مگر اس کے قدم آگے کی جانب نہ اٹھے اس کے پیروں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اس نے اپنی پوری طاقت لگا کر اپنا پیر اٹھایا تو وہ چیختے ہوئے لیبارٹری کے فرش پر گر پڑا اس کے دونوں پیروں کا گوشت اس کے جسم سے علیحدہ ہو گیا تھا، اب اس کی پیروں کی جگہ صرف اس کے پیروں کی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔

اسی وقت اس کی نظر شوکیس کے شیشے پر پڑی جہاں اس کا چہرہ واضح نظر آرہا تھا اس کے چہرے کا گوشت بھی پگھلنا شروع ہو گیا تھا ایسا لگتا تھا جیسے اس کا گوشت پانی بن رہا ہو وہ چیخنا چاہتا تھا مگر وہ چیخ بھی نہیں پا رہا تھا اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ تکلیف سے اس کا برا حال تھا۔

اچانک اس کی دونوں آنکھوں کی پتلیوں نے باہر نکلنا شروع کر دیا اور پھر اس کی دونوں آنکھوں کی پتلیاں اس کے جسم سے الگ ہو کر لیبارٹری کے فرش پر گر پڑیں اور فرش پر گرتے ہی اس طرح ٹوٹ گئیں جس طرح کسی کے ہاتھ سے انڈہ گر کر ٹوٹ جاتا ہے، پتلیوں سے نکلا مواد اس کے پگھلے گوشت کے ساتھ مل کر لیبارٹری کے فرش پر بہنے لگا۔

جوزف کا سارے جسم کا گوشت پانی بن رہا تھا، تھوڑی دیر میں جوزف کے سارے جسم کا گوشت پانی بن کر بہہ گیا، جہاں تھوڑی دیر پہلے جوزف پڑا تھا وہاں اب صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔

وہ تینوں جو موت کو شکست دینے چلے تھے، قدرت کے اٹل نظام کو بدلنے چلے تھے، جو آسمانی کتابوں کو غلط ثابت کرنا چاہتے تھے، موت، جو قدرت کی اٹل حقیقت ہے اسے شکست دینا چاہتے تھے، قدرت نے ان کی موت کا بندوبست عجیب انداز میں کیا۔ ان تینوں کی لاشیں نشان عبرت کے طور پر لیبارٹری کے فرش پر پڑی تھیں......

پراسرار جزیرہ

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

صدیوں سے دنیا میں عجیب عجیب ناقابل یقین اور ناقابل فراموش انکشافات ہوتے رہتے ہیں، انہی انکشافات میں سے جب اس سوچ کا انکشاف ہوا تو لوگوں کی عقل حیران رہ گئی مگر پھر قدرت کا اصل قانون جب سامنے آیا تو......

ذہن سے برسوں محو نہ ہونے والی اپنی نوعیت کی دل گرفتہ سوچ کے افق پر سکتہ بیٹھاتی کہانی

میں اس بدقسمت جہاز کا واحد خوش قسمت مسافر ہوں جو اٹھارہ ماہ قبل سمندر کی ہولنا کی کا شکار ہوا تھا۔ جہاز پر مسافروں کی تعداد کا علم میرے علاوہ کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جہاز کا کپتان میرا عزیز دوست تھا اور میرا بیشتر وقت اس کے ساتھ ہی گزرتا تھا جب اچانک جہاز ایک تنکے کی طرح اچھل کر زیر سمندر کسی گلیشیئر سے ٹکرایا تو میں نے ایسا ہولناک منظر دیکھا جس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ہے۔ حادثہ اس قدر اچانک اور آناً فاناً ہوا تھا کہ احتیاطی تدابیر سے پہلے ہی جہاز کا پچھلا حصہ نصف سے زیادہ سمندر میں ڈوب گیا اور چشم زدن میں عرشے کی ہر چیز لڑھک کر سمندر میں جا گری۔

بھاری چیزوں کے لڑھکنے سے بہت سے بدنصیب مسافر زخمی ہوگئے اور ان کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم ہوگئے۔

میرا دوست کپتان بھی اس ناگہانی حادثے سے حیران اور سراسیمہ ہوگیا لیکن اس کے گزشتہ تجربات اسی وقت کام آئے۔ اس نے فوراً ایک جہازی ملازم کی مدد سے حفاظتی کشتی کو سمندر میں اتار دیا۔ میں اپنی زندگی کے لئے ان دونوں کا آج تک احسان مند ہوں۔ اگر وہ دونوں بروقت اقدام میں ذرا بھی تساہل کرتے تو شاید جہاز کے اور مسافروں کی طرح میں بھی گہرے سمندر میں آبی جانوروں کی غذا بن چکا ہوتا۔

حفاظتی کشتی میں سب سے پہلے کودنے والا شخص جہاز کا ملاح تھا۔ اس کے بعد کپتان نے مجھے تقریباً دھکا دیا تو میں افراتفری کے عالم میں کشتی کے اندر گرا۔ میرے بعد کپتان کشتی میں کودا۔ ایک چوتھے آدمی کو بھی ہم نے کودتے دیکھا مگر وہ کودتے وقت گھبرا گیا تھا کیونکہ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا پہلے تو وہ جہاز کی دیواروں سے ٹکرایا پھر ایک رسے سے الجھ کر اس نے پلٹا کھایا اور تیر کی طرح سمندر میں گیا۔ ہم نے چند ثانیے اس کے ابھرنے کا انتظار کیا مگر وہ نہ ابھرا۔ ہم وہاں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہمارے اختیار میں بھی نہ تھا۔

تیز موجیں اور ہوا کے جھکڑ ہمیں ادھر سے ادھر لئے پھر رہے تھے۔ جائے حادثہ سے دو گز کے فاصلے پر ہمیں ایک اور مقامی کشتی نظر آئی جس میں بہت سے لوگ تقریباً ٹھسے ہوئے تھے، جان بچانے کے لئے گنجائش سے زیادہ لوگوں نے کشتی میں پناہ لی تھی وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ وہ حفاظتی کشتی جو ہماری کشتی سے بڑی تھی، ایک جگہ جا کر چکرائی۔ مسافروں نے پریشانی میں ادھر ادھر پاؤں مارے مگر ان میں سے شاید کوئی بھی کشتی

چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہر شخص کو اسی کشتی میں اپنی زندگی نظر آرہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کشتی غرق ہوگئی۔

ہماری اپنی کشتی بہت چھوٹی تھی۔ ہمارے پاس خورد ونوش کا بھی ذخیرہ نہ تھا۔ دوسرے دن سمندر کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور کشتی جو پہلے ہچکولے کھا رہی تھی، پرسکون انداز میں چلنے لگی۔ ہم تینوں بالکل خاموش تھے۔ کھانے پینے کا سامان ہمارے پاس نہ تھا۔ امداد پہنچنے کا کوئی آسرا نہیں تھا اور نقاہت کے مارے ہمیں ہاتھ پاؤں مارنے کی بھی سکت نہ تھی۔ سورج کی تیز تیز کرنیں ہمارے جسموں میں تیر کی طرح چبھ رہی تھیں۔

تیسرے دن ہمارے جسم تڑخ گئے اور حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔

اسی دن کپتان نے بے حد مردہ اور تھکی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ ”ہم تینوں میں سے ایک کو دو کے لئے قربانی دینا ہوگی۔“

میں اور جہاز کا ملاح دونوں اسے دیکھنے لگے۔ ایسے موقعے پر کسی کو کیا قربانی دینی ہوگی! یہ بات ہماری دونوں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”ہم قرعہ اندازی کرتے ہیں جس کا نام نکلے گا، باقی دو اسے ذبح کرکے.....“

کپتان نے بات پوری بھی نہ کی تھی کہ میرا منہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ”نہیں!“ میں نے مخالفت کی۔ ”بہتر ہے کہ ہم شارک مچھلیوں کا لقمہ بن جائیں۔“ میں اس وقت تک، انسانی قدر اور انسانی خون کی عظمت کا قائل تھا۔

میں نے تو اپنے دوست کپتان کا کہا ماننے سے انکار کردیا تھا مگر جہاز کا ملاح اس کی تجویز پر فوراً راضی ہوگیا۔ اس کے بعد تقریباً بارہ گھنٹے بے حد اضطراب میں گزرے۔ میں نے چاقو ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ملاح کا خیال تھا کہ مجھے ذبح کردیا جائے اور کپتان بہرصورت قرعہ اندازی پر اڑا ہوا تھا۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرتے کرتے میرے اعصاب جواب دے گئے اور میں جو کچھ دیر پہلے انسانی خون کے تقدس کا قائل تھا۔ ان کے اکساؤ نے کھیل میں شامل ہونے پر تیار ہوگیا۔

قرعہ ڈالا گیا۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ اسی کا نام نکلا جو کچھ دیر پہلے کپتان کو اس بات پر تیار کررہا تھا کہ مجھے ذبح کردیا جائے یعنی ملاح۔

ملاح ہم دونوں سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ اس قرعہ کو ماننے سے منکر ہوگیا۔ کپتان نے دفعتاً اس کے منہ پر مکا مارا۔ وہ بھی کپتان سے گتھ گیا۔ چھوٹی سی کشتی ایک طرف جھکی۔ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح الجھے ہوئے تھے کہ انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ دونوں لڑھک کر سمندر میں گر گئے۔ اب میں کشتی میں اکیلا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی سطح آب پر نہ ابھرا۔

اس دن کے بعد کے دنوں کی گنتی مجھے یاد نہیں ہے۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں کشتی پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسی عالم میں محسوس کیا کہ کوئی مجھ پر جھکا ہوا ہے۔ ایک عام انسانی چہرہ اور اس کے عقب میں ذرا بھیانک قسم کا غیر انسانی قسم کا چہرہ تھا۔ پھر کوئی گیلی چیز میرے حلق میں انڈیل دی گئی۔

میں کب تک دنیا و مافیہا سے بے خبر رہا۔ مجھے اس کا صحیح طور سے علم نہیں ہے مگر مجھے ذرا سا ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں کسی جہاز کے کیبن میں ہوں۔ بحری جہاز پر سفر کرنے کا تجربہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ سمندر میں جہاز ایک خاص قسم کے ہچکولے لیتا ہے جس کا اثر جہاز کی تمام اشیا پر پڑتا ہے۔

میری آنکھ کھلی تو ایک غیر جذباتی اور سبز رنگ کی آنکھوں والا چہرہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ جو شخص میرے اوپر جھکا ہوا تھا اس نے بڑے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ مجھے اپنی آواز سن کر احساس ہوا کہ اس میں نقاہت کا دور دور تک پتا نہیں۔ دوسرا احساس مجھے یہ ہوا کہ میں جسمانی طور پر بھی توانا ہوں۔

”تم غالباً کسی بدقسمت جہاز کے مسافر تھے۔ ہم نے تمہیں ایک کشتی میں ساکت وصامت تیرتے دیکھا

ہا۔" سبز آنکھوں والے نے حسب دستور بے حد سپاٹ لہجے میں کہا۔ اسی لمحے مجھے چھت کے اوپر کسی کے بھاگنے اور عجیب سی چیخ کی آواز سنائی دی۔ عجب بھیانک سی آواز تھی مگر آواز میں ایسی لرزش ضرور تھی جس نے میرا دل دہلا دیا تھا۔

میرے ہمدرد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی توجہ ادھر گئی مگر دوسرے لمحے اس نے خود کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"لیونارڈ!" میں نے جواب دیا۔ اسی لمحے دوبارہ مکروہ آواز سنائی دی۔ اس بار اس کے ساتھ ساتھ بہت سے ملاحوں کی چیخ وپکار بھی شامل تھی۔ میرے ہمدرد نے بے چینی سے کان لگا کر آواز سنی۔ یہ سب شور وغل تین چار منٹ میں ختم ہوگیا۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اور پھر اچانک کتوں کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پچاس ساٹھ کتے ایک ساتھ غرا رہے ہوں۔

"کم بخت" میرا معالج یہ کہتا ہوا اچانک اٹھا اور نہایت تیزی کے ساتھ کیبن سے نکل گیا۔ باہر وہ کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔ ڈانٹ کے جواب میں کسی نے اپنی صفائی پیش کی، صفائی پیش کرنے والے کا مفہوم تو میں نے خوب سمجھا مگر اس کی آواز کانوں کے لئے غیر مانوس تھی اور لفظوں کی ادائیگی ایسی تھی جیسے کوئی یاد کر کے ایک ایک لفظ ادا کر رہا ہو۔

باہر میرے معالج اور غیر مانوس آواز کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر ایسی آواز آئی جیسے فضا میں چمڑے کا چابک لہرایا ہو۔ اسی کے ساتھ ایک چیخ ابھری جو خوف اور اذیت سے بھرپور تھی۔

"پتا نہیں کیا پراسراریت ہے۔" میں نے دل میں سوچا۔ جانوروں کی آوازیں کتوں کی غراہٹ، چابک کی آواز اور میرا ہمدرد، سب چیزیں اپنے اندر ایک خوفناک اسرار لئے ہوئے تھیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان تمام چیزوں کو کس خانے میں رکھ کر فیصلہ کروں۔ آخری آواز چمڑے کے چابک کی آواز اور ساتھ ہی ایک چیخ نے میرے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

معلوم نہیں کس ظالم نے کس بے چارے کو چمڑے کے چابک سے سزا دی ہے۔ مگر میرے اس سوال کا جواب جلد مل گیا۔ جب میرا معالج سرخ چہرہ لئے اور بائیں ہاتھ پر چمڑے کا چابک لپیٹے کیبن میں دوبارہ داخل ہوا۔ چابک بالکل اسی قسم کا تھا جیسا ہمارے تانگے والے گھوڑوں پر استعمال کرتے ہیں۔

میرے معالج کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی سبز رنگ کی آنکھوں میں وحشت سی چھائی ہوئی تھی وہ دھم سے کرسی پر گر پڑا۔ اور تیز تیز سانس لینے لگا۔ کوئی پانچ منٹ بعد کیبن کا دروازہ دوبارہ کھلا اور بے ڈھنگے جسم والی ایک آدمی نما کوئی شے اندر داخل ہوئی۔ آدمی نما اس لئے کہ اس کے ہاتھ پاؤں، ناک منہ اور آنکھیں سب انسانی تھیں مگر جسم کا ہر حصہ غیر متناسب تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور اذیت کے آثار تھے۔ وہ چپ چاپ اندر آیا اور ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ بار بار وہ میرے معالج کے اس ہاتھ کو گھور رہا تھا۔ جس میں چابک موجود تھا۔ اس کی خوفزدہ صورت سے میں نے اندازہ لگالیا کہ جو مظلوم چابک سے پیٹا گیا تھا۔ وہ یہی تھا بے ڈھنگے جسم اور بدقطع لباس میں وہ مجھے زمین کی مخلوق نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ جب وہ بولا تو مجھ پر دوسرا راز منکشف ہوا۔ غیر مانوس کی آواز! یہ وہی تھا جس سے میرا معالج تھوڑی دیر پہلے سوال جواب کر رہا تھا۔

"سب مجھے تنگ کر رہے تھے۔" اس نے ایک ایک لفظ توڑ کر کہا۔

"خبیث!"

میرا ہمدرد شاید مجھ کو بھول گیا اور اس آنے والے بدوضع شخص نے تو جیسے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی تو دونوں کی نگاہ مجھ پر رکی۔ میرا ہمدرد تو خاموش رہا مگر آنے والے آدمی نما شخص نے مجھے خوف اور ندامت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی مائل رنگ جھلکا اور ایک گھبراہٹ تھی۔

"جاؤ، وہاں رہو! یہاں کیا کر رہے ہو۔"

"وہ مجھے قریب ہی نہیں آنے دیتے۔"

''قریب نہیں آنے دیتے! مگر میں کہتا ہوں کہ جاؤ۔''

وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے چہرے سے مجھے ایسا لگا جیسے کوئی طالب علم کچھ یاد کرنا چاہتا ہو اور اسے یاد نہ آرہا ہو۔ اچانک اس کے چہرے پر غصے کے آثار ابھرے اور وہ مڑ کر جھلاہٹ کے انداز میں کیبن سے نکل گیا۔

میرا معالج پوری توجہ سے میرے معالجے میں مصروف تھا۔ چھٹے دن میں خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا، ساتویں دن میں صبح ہی صبح اٹھ کر کیبن سے باہر نکلا۔ کیبن میں پڑے پڑے اوپر سے آنے والی آوازیں سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ سب آوازیں عرشے کی طرف سے آتی ہیں۔ عرشے پر جانے کے لئے رسی کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ میں سیڑھی کے ذریعے عرشے پر پہنچ گیا۔ عرشے پر جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں وہاں سے پورے جہاز کا جائزہ لے سکتا تھا مگر عرشے پر جاتے ہی میں پاگل سا ہو گیا۔ اتنا گندا عرشہ میں نے کسی ماہی گیری کی کشتی کا بھی نہ دیکھا تھا۔ وہاں عجیب سڑاندسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں بڑے بڑے پنجرے موجود تھے۔ بعض میں کتے بند تھے بعض میں خرگوش۔ ایک پنجرے میں ایک قوی الجثہ تیندوا اٹھ سا ہوا تھا۔

میں حیرانی سے اس چڑیا گھر کو دیکھ رہا تھا۔ مجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جہاز اتنے جانوروں کو لے کر کہاں جا رہا ہے۔ ویسے جہاز بہت بڑا نہ تھا۔ وہ ایک بے حد چھوٹا اور معمولی سا جہاز تھا۔ ان جہازوں کی طرح جو بڑے سمندروں میں ساز و سامان کو ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک لے جانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ تاہم جہاز مضبوط اور شاندار معلوم ہو رہا تھا۔ جہاز کی دوسری چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بناوٹ میں صفائی اور نفاست کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا۔ مگر اس نفیس قسم کے جہاز پر جانوروں کے پنجرے اور بو عجیب سی لگ رہی تھی۔ میری نظر پنجروں سے گزرتی ہوئی عرشے کی انتہائی سرے پر جنگلے سے ٹکرائی جہاں وہ آدمی نما شخص بڑے مزے سے لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کتوں نے غرانا شروع کر دیا۔ میرے قدموں کی چاپ پر تو اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی مگر کتوں کے غرانے کی آواز پر وہ مشینی انداز میں مڑا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوف کے شدید ترین آثار پیدا ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا اور ساتھ ہی ایک عجیب سی آواز نکالی جیسے کوئی جنگلی جانور اس وقت نکالتا ہے جب اسے اچانک کسی نئی صورت حال سے واسطہ پڑ جائے۔

کئی روز کی بیماری اور کیبن میں پڑے پڑے میرے اعصاب کمزور ہو گئے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں عرشے پر کچھ مزید وقت گزار کر ہر چیز کا بغور جائزہ لیتا مگر اس کی اچانک ڈپٹ سے نروس ہو گیا اور فوراً نیچے اترنے کے لئے پلٹ پڑا۔ جب میں ہاں پہنچا جہاں تھوڑی دیر پہلے رسی کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی تو حیران رہ گیا۔ کسی نے وہ سیڑھی وہاں سے ہٹالی تھی۔

میں نے گھبرا کر نیچے جھانکا۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر دو تین ملاح نیچے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ جو ادھر ادھر کام کر رہے تھے اور مجھے آتے وقت نظر نہیں آئے تھے۔ ملاح مجھے حیرت سے تکنے لگے۔

''ارے یہ تو وہ مسافر ہے جسے ہم نے بچایا تھا۔'' ایک ملاح نے مجھے پہچانتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی دوسرے ملاحوں کے چہروں پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی جیسے میں نے نمودار ہو کر انہیں کسی دلچسپ کھیل سے محروم کر دیا ہو۔

جس ملاح نے مجھے پہچانا تھا، اس نے رسی کی سیڑھی اوپر اس طرح پھینکی کہ وہ فوراً سیڑھی کے لئے بھی عرشے کے غیر انسانی و بدبودار ماحول میں رہنا پسند نہ کرتا۔ میں بغیر سیڑھی بھی نیچے کود پڑنے سے دریغ نہ کرتا۔

میں جلدی جلدی سیڑھی سے اترا۔ میرے پیچھے بدوضع آدمی نے بھی اترنا چاہا مگر کسی ملاح نے زور سے

یک لکڑی اس کی ٹانگوں پر ماری اور وہ۔ بے چارا بلبلاتا ہوا واپس چلا گیا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے پیچھے دیکھنے لگا۔ اوپر کتوں نے ایک بار پھر زور زور سے بھونکنا اور غرانا شروع کر دیا تھا۔ بدوضع آدمی کے لکڑی مار کر اور اس کے بلبلانے کی آواز سن کر سب ملاح یکبارگی خوشی سے چیخے۔ ان کی آوازوں میں ایسی مسرت تھی جیسے آوارہ بچے کسی کتے کے پلے کو پتھر مار کر اور اس کی چیاؤں چیاؤں سن کر چیختے چلاتے ہیں۔

میں نیچے اتر کر ملاحوں کی خوش طبعی پر غور کر رہا تھا اور وہ سب زور زور سے "کالا شیطان، کالا شیطان" چلا رہے تھے اور کالا شیطان کتوں کی غراہٹ سے پریشان جھانک کر رحم طلب نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

اسی شور وغل میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔

"چپ رہو۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک سفید بالوں والا شخص جو اپنے لباس سے جہاز کا کپتان معلوم ہو رہا تھا۔ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

سب ملاحوں نے چپ ہو کر اسے دیکھا۔ کپتان کی نگاہ مجھ پر ٹھہر گئی۔

"یہ بھی کالے شیطان کا بھائی ہے۔" اس کے لہجے میں تمسخر اور حقارت تھی۔

"مجھے کپتان کے رویے پر سخت حیرت تھی۔ میں احتجاج کرنے والا تھا کہ میرا معالج وہاں نکل آیا۔ میرے معالج کو دیکھ کر اوپر کالے شیطان نے شکایتی لہجے میں معلوم نہیں کیا کہا۔ میں تو کپتان کے رویے پر شش و پنج کا شکار تھا۔

"مسٹر کپتان۔" میرے معالج نے غصے سے کہا۔ "جب ہم کرایہ دے کر سفر کر رہے ہیں تو تمہارے آدمیوں کو ہمارا خیال رکھنا چاہئے۔"

"خیال رکھنا چاہئے۔" کپتان نے تمسخر سے کہا۔

"جانوروں کا خیال رکھوں! کالے شیطان کا خیال رکھوں!" پھر کپتان نے میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اس خبیث کو بھی کالا شیطان بنا دو۔"

"میرے معالج نے غصے سے ہونٹ چبائے۔" مسٹر کپتان!"

"تمہیں شرافت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔"

"شرافت؟ شرافت کیا چیز ہوتی ہے۔ مسٹر فرٹ؟"

مجھے پہلی دفعہ اپنے ہمدرد معالج کا نام معلوم ہوا۔

فرٹ نے اس کے لہجے پر توجہ دیئے بغیر کہا۔

"بس ایک دن کی بات اور ہے۔"

"ہاں ایک دن کی بات! مگر اس کمینے کا کرایہ بھی ادا کر دینا۔"

کپتان نے اس بار مجھے کمینہ کے نام سے پکارا تھا۔

"شٹ اپ!" میں غصے سے بے قابو ہو گیا اور یہ بھی بھول گیا کہ میں جہاز پر بے سہارا مسافر ہوں۔ میرے شٹ اپ کہنے پر کپتان آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے میری سات پشتوں کو لاتعداد قسم کی مغلظات سے نواز ڈالا۔

فرٹ مجھے کھینچ کر کیبن میں لے گیا۔ کیبن میں بھی مجھے کپتان کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ وہ کسی جزیرے میں فرٹ کے اس کے جانوروں، کالے شیطان اور مجھے اتارنے کے بارے میں چلا چلا کر اعلان کر رہا تھا۔ میں نے اس وقت کی صورت حال دیکھ کر اس جزیرے کے بارے میں فرٹ سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ میرے اور جزیرے کے درمیان شاید چوبیس گھنٹوں کا وقفہ باقی رہ گیا تھا۔

ان چوبیس گھنٹوں میں مجھے اچھی طرح علم ہو گیا کہ جہاز کا ایک ایک فرد میرے ہمدرد فرٹ، اس کے جانوروں اور اسی کے بدوضع ملازم کو سخت ناپسند کرتا ہے اور مجھے بھی نفرت سے اس لئے دیکھتا ہے کہ فرٹ ہی کے ایماء پر مجھے جہاز میں اٹھوایا گیا تھا۔ میں نے اپنی سی بہت کوشش کی کہ کسی طرح جہاز والوں سے تعلقات بڑھاؤں۔ میں صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے

معالج اور اس کے ملازم کے لئے بھی فضا اور ماحول خوشگوار کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق بے چارا ملازم تو گفت وشنید کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ رہا فرث تو اسے بھی زمانہ سازی کا فن نہیں آتا تھا۔ کپتان تو میری شکل بھی دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

اس کے تھرڈ اسسٹنٹ نے میری پیہم چاپلوسی پر رحم کھاتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔ "تم بھی اسی کے ساتھی ہو گے ورنہ وہ تمہیں مردہ حالت میں کیوں اٹھوالیتا۔"

میں نے بہت کوشش کی مگر فرث کے کیبن میں اس کے ہی زیر علاج رہنے کی وجہ سے وہ میری طرف سے مشکوک تھے۔ وہ مجھ سے کسی قیمت پر بات کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ میرا وجود انہیں اسی وقت تک جہاز پر منظور تھا جب تک فرث کی منزل نہیں آجاتی۔ فرث کی منزل ایک جزیرہ تھا۔ مگر کیسا جزیرہ! یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ لاعلمی کے باوجود میں اسی کے ساتھ کسی جزیرے پر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ ایسا پراسرار شخص تھا کہ مجھے اس کی رفاقت میں دل ڈوبتا محسوس ہوتا تھا۔

شاید دوسرا پہر ہونے والا تھا جب دور کسی جزیرے کے آثار نظر آئے۔ ملازم جزیرے کو دیکھ کر ایسا خوش ہوا تھا جیسے وہ جنت کے قریب پہنچ گیا ہو مگر فرث کا چہرہ سپاٹ تھا۔ نہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے خوشی ہے اور نہ وہ رنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔ بس سپاٹ اور بے جان چہرے کے ساتھ وہ ساز وسامان بندھوانے میں مصروف تھا۔ اس نے اس بھاگ دوڑ میں یہ بھی نہ پوچھا کہ میں اس کے ساتھ اتروں گا یا جہاز پر رہوں گا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھے بھول ہی گیا ہے۔

جہاز، جزیرے سے ذرا دور رکا جہاز کو دیکھتے ہی چند کشتیاں جہاز سے آلگیں۔ جن کو ہونق سے چند آدمی دیکھ رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے ملاحوں نے بڑی بے دردی سے سارے پنجرے ان کشتیوں میں دھکیل دیئے۔ میں سارا تماشا خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جونک کر دیکھا کہ فرث بھی جہاز سے لٹکی ہوئی رسی کی ایک سیڑھی سے ایک کشتی میں اتر رہا تھا۔

کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں مڑا۔ کپتان میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"ہیلو...... مسٹر شٹ اپ! تم بھی سدھارو! رخصت ہو جاؤ اپنے شیطانوں کے ساتھ!"

"اول تو میرا نام لیونارڈ ہے۔ دوئم یہ کہ......"

میں نے کہنا چاہا مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

"تمہارا نام صرف شٹ اپ ہے۔ مسٹر شٹ اپ۔ اب تو دو گیارہ ہو جاؤ!"

میں ہکا بکا ہو کر کپتان کی صورت دیکھنے لگا۔ ادھر فرث کشتی پر بیٹھ کر روانہ بھی ہو چکا تھا۔ کوئی چھ کشتیاں تھیں۔ پانچ کشتیوں میں سامان لدا ہوا تھا اور ایک کشتی میں میرا دوست کسی اور کے ہمراہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ فرث کو کیا ہوا۔ اس نے جاتے وقت مجھ سے رخصت بھی نہ ہونا چاہا اور ادھر کپتان تھا کہ میرے لئے عذاب کے فرشتے کی صورت موجود تھا۔

"مگر وہ تو چلے گئے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"چلے گئے تو تم بھی جاؤ! کود و فوراً پانی میں! تیر کر جاؤ......!!" اتنی دیر میں جہاز کے ملاح چاروں طرف جمع ہو گئے تھے۔ ان کی حرکات وسکنات سے بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں بھی جہاز پر میرا وجود ناگوار ہے۔

"مگر مسٹر کپتان۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کپتان اور اس کے عملے کی ہمدردیاں کیسے حاصل کروں۔

"نو مسٹر! نو مسٹر کپتان، سب گیا جہنم میں!" کپتان چلایا پھر اس نے ملاحوں کو حکم دیا۔ "مسٹر شٹ اپ کو اٹھا کر پانی میں پھینک دو!"

میں چاہتا بھی تو مزاحمت نہ کر پاتا۔ وہ پندرہ بیس تھے اور میں تنہا۔ انہوں نے اسی بے دردی سے مجھے اٹھایا جس بے دردی سے تھوڑی دیر پہلے وہ جانوروں کے پنجرے اٹھا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارے کیونکہ اگر وہ مجھے پانی میں پھینکتے اور میں کوئی مداخلت نہ

کرتا تو میں سیدھا غوطہ لگا جاتا۔ ایسی صورت میں میرے زندہ ابھر کر آنے کے امکانات بہت کم تھے۔ میں ان کے ارادے میں حائل تو نہیں ہوسکا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان کے دھکا دینے کے ساتھ ساتھ میں خود بھی کودنے کے لئے تیار تھا۔ ایک زوردار چھپاکا ہوا۔ شروع شروع میں تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا!

رفتہ رفتہ میرا دماغ اور ہوش و حواس کام کرنے لگے۔ میں نے جزیرے کی طرف تیرنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مڑ کر دیکھا تو خر دماغ کپتان والا جہاز دور چلا جارہا تھا اور دو کشتیاں میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ فرث کو میں نے پہچان لیا۔۔ اسے شاید میری حالت پر رحم آگیا تھا۔ کشتی میرے قریب آئی اور دو ہاتھوں نے مجھے کشتی پر اٹھالیا۔ کشتی میں فرث کے علاوہ ایک بھورے بالوں والا شخص سفید قمیض اور کالی پتلون پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ دو ملاح مسلسل چپو چلا رہے تھے۔ بھورے بالوں والے نے بے دلی سے مجھے دیکھا۔ ”مسٹر فرث۔ کیا یہ شخص اب جزیرے پر رہے گا؟“ اس نے فرث سے پوچھا۔

”کیا کروں؟“ فرث کے لہجے میں ندامت اور شرمندگی تھی۔ ”مجبوری ہے سر! وہ تو اس کو پھینک ہی گئے۔“

بھورے بالوں والے نے ناگواری سے سر جھکالیا۔ فرث کی بے تعلقی اب میری سمجھ میں آگئی۔ دراصل وہ بھورے بالوں والے کی مرضی کے بغیر مجھے جزیرے پر لانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اتفاق سے صورت حال بدل گئی تھی۔ اب میں بھورے بالوں والے کی مرضی کے خلاف جزیرے کی طرف جارہا تھا۔

میں نے چپو چلانے والوں کو غور سے دیکھا۔ بڑے گھناؤنے چہرے تھے ان کے۔ وہ بھوری بھوری رنگت کے تھے۔ ان کے پورے بدن پر سفید سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کے ہاتھوں اور پیروں پر بھی سفید پٹیاں تھیں۔ انہوں نے سر پر سفید کپڑا اس طرح لپیٹ رکھا تھا جیسے کوئی بے ڈھنگے پن سے پگڑی باندھے ہو۔ ان کے جسم انسانی ہونے کے باوجود غیر متناسب تھے دھڑ عام انسانوں کی نسبت بڑا تھا اور ٹانگیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ گھٹنوں کے نیچے مڑی ہوئی بھی تھیں۔ وہ انسانی شکل میں کوئی اور مخلوق معلوم ہوتے تھے میں ان تینوں بدہیئت جسموں کا جائزہ لیتا رہا۔ کشتی کنارے سے جا لگی۔ جزیرہ ڈھلوانی تھا۔ ڈھلان پر پتھروں کی ایک چوکور فصیل نظر آرہی تھی۔ اس فصیل کے اندر شاید گھر تھے۔ فصیل کے اندر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

ایک آدمی کنارے پر ہمارا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا سر بڑا سا اور بے ڈھنگا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ریت اڑا اڑا کر مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگا پھر اس جوکر اور عجیب الخلقت ملاحوں نے سامان اٹھا اٹھا کر کنارے پر رکھنا شروع کردیا۔ جب وہ سامان اٹھا اٹھا کر کنارے پر رکھ رہے تھے تو مجھ پر ایک اور بات منکشف ہوئی کہ ان کی ٹانگوں کی حرکت انسانوں جیسی نہ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی ٹانگوں کے جوڑ غلط لگادیئے گئے ہیں۔ وہ اکڑی اکڑی ٹانگوں سے چل رہے تھے۔ سفید بالوں والے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میرا جائزہ لیتا رہا تھا اور میرے خیال کے مطابق میری توجہ ان آدمیوں کی طرف سے ہٹانا چاہتا تھا۔

”تم بن بلائے مہمان ہو مگر ہم تمہاری خاطر کرنے میں کوئی کسر نہ رکھیں گے۔“ اس نے یہ جملہ اس روکھائی سے کہا تھا کہ میں پہلے تو اس کا مفہوم غلط سمجھا مگر اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ہمدردی سے کہہ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم کنارے پر ہم لذیذ قسم کے بسکٹوں کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ چائے پینے کے دوران میری چھٹی حس نے مجھے چوکنا کردیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے بہت سی آنکھیں آس پاس کی جھاڑیوں کے پیچھے سے ہمیں دیکھے جارہی ہیں۔ وہ آنکھیں ہماری حرکات و سکنات کا تفصیلی جائزہ لینے میں مصروف ہیں۔ مگر میں لاکھ کوشش کے باوجود ان نادیدہ آنکھوں کو نہ

دیکھ سکا۔ میں تو ان آنکھوں کو محسوس کر رہا تھا مگر میرے دونوں میزبان بڑے مطمئن تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا حالانکہ ایک آدھ بار جھاڑیوں کے پیچھے پتوں کی چرمر اور درختوں کی ٹہنیوں کے ٹوٹنے اور چٹخنے کی آوازیں بھی سنائی دیں جو بھاری جسموں کے ادھر ادھر چلتے پھرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔

ہم چائے پینے میں مصروف تھے اور عجیب الخلقت قسم کے ملازم ساز وسامان لاد لاد کر لے جارہے تھے ان میں کالا شیطان بھی تھا۔ کالا شیطان جزیرے پر آکر بہت مطمئن تھا۔ مگر اس نے کتوں کے پنجروں کی طرف جانے سے گریز کیا۔

وہ خرگوش کا پنجرہ اٹھائے جارہا تھا کہ بھورے بالوں والے نے اسے حکم دیا۔

''خرگوش کو آزاد کردو!''

''کالے شیطان نے پنجرے کھول دیئے اور ننھے منے خرگوش اچھلتے کودتے جھاڑیوں میں غائب ہوگئے۔

''جاؤ نسل بڑھاؤ!'' بھورے بالوں والے نے پرمسرت لہجے میں کہا! اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''کچھ دنوں سے جزیرے پر گوشت کی کمی ہوگئی تھی۔''

ساحل سے اونچائی پر بنا ہوا قلعہ بہت قریب معلوم ہوتا تھا مگر جب ہم نے چلنا شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ کنارے پر ناشتہ کرنا بہت ضروری تھا۔ میں تو کئی جگہ ہانپ ہانپ گیا۔ فرٹ بھی مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ مگر میرا دوسرا میزبان عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بے حد چاق وچوبند اور پھرتیلا نظر آرہا تھا۔ اس کے ملازم اس سے بھی زیادہ پھرتیلے تھے۔ وہ پنجروں کو اٹھائے تیز تیز قدموں سے ہم سے کہیں آگے آگے چل رہے تھے۔ مگر ان کی چال بے حد بے ڈھنگی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں اپنے پیروں پر مجبوراً چلنا پڑ رہا ہو۔ عجیب ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگیں تھیں۔ ہر لمحے ایسا لگتا تھا جیسے وہ چلتے چلتے گر پڑیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کہیں لڑکھڑائے بھی نہیں۔

قلعہ کے قریب جاکر اندازہ ہوا کہ وہ سچ مچ ایک مضبوط قلعہ ہی تھا۔ مگر بہت زیادہ بڑا نہیں۔ ملازمین نے اس کے مضبوط آہنی دروازے کے باہر تمام پنجرے رکھ دیئے اور واپس آگئے۔

جزیرہ کے پراسرار ماحول اور وہاں موجود سناٹے نے مجھے بے چین کرنا شروع کردیا تھا۔ عجیب الخلقت ملازم تیزی سے لوٹ گئے تھے جیسے وہ اگر وہاں تھوڑی دیر مزید رکے تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اب وہاں ہم تین افراد ہی رہ گئے تھے یا پنجرے تھے جن میں موجود جانور بھی سہمے سہمے سے تھے معلوم نہیں یہ جزیرے کی فضا کا اثر تھا یا بھورے بالوں والے کی شخصیت کا تاثر تھا۔ میں خود بھی لرزش سی محسوس کر رہا تھا۔

''یہ بن بلائے مہمان کو کہاں رکھا جائے۔''

بھورے بالوں والے نے فرٹ کو مخاطب کیا۔ فرٹ نے متفکرانہ انداز میں سر ہلایا۔ دونوں کے چہروں پر فکرمندی کے آثار تھے۔ ان کے نزدیک میرے ٹھہرائے جانے کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ تھا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

''بات یہ ہے کہ ہم قلعہ میں کسی تیسرے شخص کو جانے نہیں دیتے۔'' فرٹ نے کہا۔

''یہاں تک کہ ہمارے ملازم بھی قلعہ سے باہر رہتے ہیں۔'' بھورے بالوں والے نے وضاحت کی۔

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ دونوں تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ پھر فرٹ نے مسئلے کا حل تلاش کرلیا۔

''وہ دائیں طرف جو کمرہ ہے جس کا ایک دروازہ باہر کھلتا ہے اسے وہاں ٹھہرا دیا جائے۔''

''مگر وہ تو اس سے ملا ہوا ہے۔'' بھورے بالوں والے نے کہا۔ اس سے بھورے بالوں والے کی کیا مراد تھی! یہ بات اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آئی مگر جب مجھے رہنے کے لئے کمرہ دکھایا گیا تو میں سب کچھ سمجھ گیا۔

اس کمرے کا پچھلا دروازہ قلعہ کے اندر کھلتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بند تھا۔ اس کے بند ہونے کا یقین، بھورے بالوں والے نے دروازے کو دھکا دے کر

دو بھی کیا۔ بند دروازے سے ایسی بو آرہی تھی جیسی
بارٹری سے آتی ہے۔

"یہ ہمارا کھانے کا کمرہ ہے۔" فرٹ نے کہا۔

میں نے ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ دونوں بند
روازے کو بہت احتیاط سے کھول کر اندر غائب ہوگئے۔
ہوں نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا اور بند کیا تھا۔
ب میں اس کمرے میں اکیلا تھا۔ ایک طرف بڑی بڑی
ماریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں سینکڑوں کتابیں رکھی
ھیں۔ میں یوں ہی تجسس کے سبب الماریوں کے قریب
ہنچ گیا۔ تمام کتابیں علم جراحی کے بارے میں تھیں۔
یں کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ دروازے کے پیچھے
سے ایسی آواز آئی جیسے کسی ذی روح کے جسم میں
چھری گھونپ دی گئی ہو۔ میں کانپ گیا۔ اس کے بعد
شکاری کتوں کی غراہٹ سنائی دی۔ شکاری کتوں کی
غراہٹ میں اچھی طرح پہچانتا ہوں کیونکہ میرے ایک
دوست کو، جو پولیس میں تھا، شکاری کتوں کی تربیت
دینے کی ذمہ داری تفویض کی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سناٹا
چھا گیا۔ چند لمحے گزرتے ہی عقبی دروازہ آہستہ سے
کھلا۔ ایک اور بدہیت آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے
ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔

"آپ کا کھانا۔" اس نے کھانے کی میز پر ٹرے
رکھ دی۔ جب وہ ٹرے رکھنے جھکا تو میں نے دیکھا کہ
اس کے کان بلی کے کانوں جیسے تھے۔ ان پر چھوٹے
چھوٹے بال بھی تھے۔

"وہ لوگ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کون ڈاکٹر مورو؟ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔"

مجھے بھورے بالوں والے کا نام معلوم ہوگیا مگر یہ
سنتے ہی مجھ پر جیسے بجلی گر گئی۔ جزیرے کا پراسرار ماحول،
عجیب الخلقت مخلوق، جانوروں کے پنجرے، لیبارٹری،
کمرے میں موجود علم جراحی پر کتابیں اور میرے سامنے
موجود کھانا لانے والا، ڈاکٹر مورو کا نام سنتے ہی ان سب
کے درمیان رشتہ پیدا ہوگیا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے
جانوروں پر عمل جراحی کر کے نئی نئی وضع قطع کے جانور تیار
کرنے میں شہرت حاصل کی تھی۔ مگر اس کا عمل جراحی اس
قدر بھیانک اور ظالمانہ تھا کہ کئی سال پہلے مہذب دنیا
نے اس کا بائیکاٹ کر کے اس پر مقدمہ چلانا چاہا تھا۔ اس
کے بعد ہی ڈاکٹر مورو تہذیب یافتہ دنیا کے اسٹیج سے
اچانک غائب ہوگیا اور اب میں اس کی تجربہ گاہ کے
قریب بیٹھا تھا۔

میرے اور تجربہ گاہ کے درمیان صرف بند
دروازہ حائل تھا۔ یہی نہیں اس کا بنایا ہوا ایک آدمی
میرے سامنے موجود تھا۔ میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے سوچا
کہ اس تجربہ گاہ تک پہنچنے سے بہتر ہوتا کہ میں جہاز کے
حادثے میں ہلاک ہو جاتا لیکن اب کچھ ممکن نہیں تھا۔ اگر
بچاؤ کی کوئی صورت تھی تو صرف جزیرے کے چاروں
طرف پھیلا ہوا سمندر تھا۔ مگر وہاں بھی موت تھی۔ میں
نے چند لمحوں ہی میں یہ سب سوچ لیا۔

میری پوری زندگی مہمات ہی میں بسر ہوئی تھی۔
جب خطرہ بالکل مقابل آجائے تو اعصاب پوری طرح
ساتھ دینے لگتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ خطرے کو
سر پر منڈلاتا دیکھ کر میں خوفزدہ ہونے کے بجائے ہر قسم
اور ہر نوع کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ
ہوگیا۔ میں پورے حوصلے کے ساتھ کھانے کی میز پر جا
ڈٹا اور کھانا کھانے لگا۔ جب تک میں کھاتا رہا۔ بلی نما
آدمی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ اندر سے مختلف
آوازیں آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ظالم ڈاکٹر
مورو کسی بھیانک آپریشن میں مصروف ہے۔ مختلف
جانوروں کی کراہیں اس بات کا ثبوت تھیں۔

میں نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ فرٹ آ گیا۔ اس کا
چہرہ اندرونی اضطراب سے سرخ ہو رہا تھا۔

"معاف کرنا مسٹر لیونارڈ! ہم دونوں ذرا
مصروف تھے۔" وہ میرے سامنے والی کرسی پر جم کر بیٹھ
گیا۔ کیا تم ڈرے ہوئے ہو؟" اسے میری حالت دیکھ کر
شاید دلی کیفیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

"تمہارا جو ملازم میرے لئے کھانا لایا تھا۔ اس
کے کان بلیوں جیسے ہیں۔"

"اچھا! ارے میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔" فرٹ، نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا مگر اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

دفعتاً دروازے کے پیچھے سے کسی جانور کی آواز آئی۔ جو اس تیندوے کی معلوم ہو رہی تھی۔ جسے بحفاظت جہاز پر سے لایا گیا تھا۔ میں نے لمحے بھر کو فرٹ کے چہرے پر بھی خوف کے آثار دیکھے۔ تیندوا پھر چیخا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی اسے سخت اذیت پہنچا رہا ہو۔ میرا ذہن پھر ڈاکٹر مورو کی طرف مڑ گیا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے تجربات اور عمل جراحی زندہ اجسام پر کرتا ہے اور بے ہوش کرنے کا قائل ہی نہیں ہے۔ یقیناً اس وقت بھی وہ تیندوے کو باندھ کر اور بے ہوش کیے بغیر اس پر تجربات کر رہا تھا۔ ظالم، بے حس، غیر متمدن ڈاکٹر میں نے سوچا

مقفل دروازہ آہستہ سے کھلا۔ وہ اندر داخل ہوا جو میرا کھانا لایا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس جزیرے پر میرے، فرٹ اور ڈاکٹر کے علاوہ تمام ذی روح ایسے ہیں جیسے ان کے اعضا کی قطع برید کے انہیں زبردستی آدمی بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ بلی نما آدمی نے فرٹ کے کان میں کچھ کہا اور وہ دونوں دروازے کے اندر غائب ہو گئے۔ اب تیندوے کی چیخ و پکار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی چیخ پکار میرے اعصاب کے لئے عذاب بن گئی تھی۔ میں نے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں مگر آوازیں پھر بھی آتی رہیں۔ اب میرے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ میں اٹھ کر کھلی فضا میں آ گیا۔ ذرا فاصلے پر سمندر کی لہریں کناروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ دائیں طرف جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے درختوں کا طویل جنگل پھیلا ہوا تھا۔ میرے قدم خود بخود جنگل کی طرف اٹھ گئے۔

بہت خوب صورت جنگل تھا۔ میں کافی دور نکل آیا تھا۔ میں آخر تھک کر ایک چشمے کے کنارے اونچی سی چٹان پر لیٹ گیا۔ جس پر ایک اونچے سے درخت کا سایہ پڑ رہا تھا۔ معلوم نہیں کب نیند آ گئی۔ آنکھ کسی آواز سے کھلی تو میں نے دیکھا کہ چشمے کے دوسرے کنارے کوئی آدمی، جانوروں کی طرح ٹانگوں پر جھکا پانی پی رہا ہے۔ وہ نیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ میرے چونکنے سے کوئی پرندہ پھر سے اڑا اور اس آدمی کی نگاہیں مجھ پر پڑیں۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے پانی پینا کوئی گناہ ہو۔ اس کی ٹانگیں ناقابل یقین حد تک چھوٹی تھیں۔ معاً وہ بھاگ کر قریبی جھاڑیوں میں گھس کر غائب ہو گیا۔ اور مجھے یہ سوچتا چھوڑ گیا کہ نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے آدمی کا تعلق کسی قدیم عہد اور کسی قدیم نسل سے تھا۔

اچانک جب مجھے یاد آیا کہ چشمے پر پانی پیتا ہوا وہ مجھے کیسا لگ رہا تھا۔ تو ایک بات منکشف ہوئی۔ وہ ایک بھیڑیا تھا جس کے ہاتھ پیروں کی قطع برید کر کے اور دوبارہ جوڑ کر اسے آدمی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ڈاکٹر مورو کا یہ جزیرہ اس کے تجربات کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں جلد از جلد قلعہ تک پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گھنے جنگل میں ڈاکٹر مورو نے کیسے کیسے جانوروں کا آپریشن کر کے انہیں آدمی نما شکل دی ہے۔

کچھ دور چل کر مجھے احساس ہوا کہ میں راستہ بھول چکا ہوں۔ کیونکہ کافی دیر چلنے کے باوجود میں قلعہ تک نہیں پہنچ سکا بلکہ جنگل اور گھنا ہو گیا تھا۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ جب میں چلتا ہوں تو کوئی اور بھی جھاڑیوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اور وہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اب شام کے سائے بڑھنے لگے تھے۔ چاروں طرف گھنے درخت تھے۔ میں صرف اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ میں پھر اسی طرف لوٹا جہاں چشمہ تھا۔ میرا تعاقب کرنے والا اب بھی میرے ساتھ تھا۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ایک پتھر اٹھا کر اس سمت پھینک دیا۔ کسی کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ میرا اندازہ صحیح تھا کوئی تھا جو میرے تعاقب میں تھا۔

پانی کی چھپا چھپ اور موجوں کے مدھم شور سے

میں نے اندازہ لگایا کہ میں ساحل کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ میں ہر صورت میں جنگل سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود میں بھاگ کھڑا ہوا۔ درختوں کی ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ میرا تعاقب کرنے والا بھی میری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ میں ایک چیخ مارنے والا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی۔ یہ آواز فرث کی تھی اور میں بے ہوش ہوگیا۔

مجھے ہوش آیا تو ڈاکٹر مورو اور فرث میرے بستر کے قریب تھے۔ ڈاکٹر مورو نے کڑوی کسیلی دوا دی۔ اس کے پیتے ہی جیسے میرے جسم میں خون دوڑ گیا۔ میں تمام نقاہت اور کمزوری بھول گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے جو دھندلاہٹ تھی وہ بھی غائب ہوگئی۔ اب مجھے ہر چیز صاف اور واضح نظر آرہی تھی۔

''ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم یوں سیر کو نکل جاؤ گے۔'' ڈاکٹر مورو نے ایک گلاس میں مزید دوا ڈالتے ہوئے کہا۔

انہوں نے مجھ سے مزید گفتگو نہ کی کیونکہ اسی وقت عقبی دروازے کے پیچھے سے تیندوے کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ اور وہ دونوں جھپٹ کر مجھے ہکا بکا چھوڑ کر دروازہ کھول کر چلے گئے۔ اس بار وہ اس قدر جلدی میں رخصت ہوئے تھے کہ دروازہ اندر سے بند کرنے کی کلک مجھے سنائی نہ دی۔ یعنی وہ دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ میں یوں ہی بیٹھا چیخیں سنتا رہا پھر وہ چیخیں ہچکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ جیسے کوئی آدمی شدید عذاب میں مبتلا ہو۔

میں جلدی سے اٹھا اور دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ اندر بڑی سی تجربہ گاہ تھی۔ وہاں لاتعداد بوتلیں اور شکنجے رکھے ہوئے تھے۔ بیچوں بیچ ایک میز پر کوئی پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور تکلیف میں تڑپ رہا تھا۔ میز کے ساتھ ایک بڑے سے ٹب میں خون ہی خون بھرا ہوا تھا۔

اچانک فرث کی آواز سنائی دی اور میز کے پیچھے سے ڈاکٹر مورو کا چہرہ ابھرا۔ وہ مجھے دیکھ کر مجھ پر جھپٹا اور قریب آکر اس نے مجھے بغلوں میں ہاتھ دے کر اوپر اٹھالیا جیسے کوئی بچے کو اٹھالیتا ہے۔ پھر مجھے میرے کمرے میں واپس پھینک کر اس نے دروازے کو زور سے بند کرلیا۔ میں اٹھا، مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ یقیناً میز پر کوئی آدمی زیر تجربہ تھا۔ کیا میرا انجام بھی یہی ہونے والا ہے۔ بس اسی خیال نے مجھے لرزادیا۔ میں کسی صورت میں عجیب الخلقت ہوکر جزیرے کے دیگر آدمی نما جانوروں میں اضافے کا سبب بننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کمرے میں نگاہ ڈالی۔ وہاں صرف ایک مضبوط ڈنڈا نظر آیا وہی لے کر میں کمرے سے باہر نکل گیا اور شمال کی طرف دوڑنے لگا۔ گزشتہ بار میں مغربی جنگل میں گھسا تھا۔

کوئی چار سو گز دوڑنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو فرث اور بلی نما آدمی میرے پیچھا بھاگتے آرہے تھے میں نے رفتار مزید تیز کردی اور ایک میل تک سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ اب دور سے شکاری کتے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی مگر جنگل اور گھنا ہو چلا تھا۔ ڈاکٹر مورو نے میرے لئے شکاری کتا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ڈنڈے کو اور مضبوطی سے تھام لیا مگر میں اچانک رکنے پر مجبور ہوگیا۔ میرے سامنے وہ بندر نما آدمی کھڑا تھا جسے میں نے پہلے دن کنارے پر مضحکہ خیز حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں ٹھٹھکا تو وہ کہنے لگا۔ ''دوست، دوست! اپنا، اپنا آؤ گھر!''

میں اس کے پیچھے اضطراری کیفیت میں چل پڑا۔ ایک موڑ کے بعد بہت ہی جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں۔ مگر گھنے درختوں کی وجہ سے وہاں بہت اندھیرا تھا۔ سب چیزیں دھندلی دھندلی نظر آرہی تھیں۔ اور ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جیسے چڑیا گھروں میں جانوروں کے پنجرے میں ہوتی ہے۔

جھونپڑوں کے درمیان صرف تین فٹ چوڑی گزرگاہ تھی۔ میں اور میرا رہبر اس پر چلنے لگے۔ بہت سی جھونپڑیوں میں سے مختلف چہرے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میرا دل ان کے لئے ہمدردی کے جذبات سے بھر گیا کیونکہ ان کی حرکات و سکنات تو انسانی تھیں مگر ان کا ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کی ساخت مختلف جانوروں کی سی

تھی۔ وہ آپس میں میرے بارے میں اظہار خیال بھی کر رہے تھے۔ ''کون ہے؟ دشمن! نہیں دوست، یہاں رہے گا! کیا کھائے گا۔'' یہ سب ان کی مختلف آوازیں تھی جو میں صاف طور سے سن رہا تھا۔ ڈاکٹر مورو کے خطرناک تجربات کے قابل افسوس نتائج میرے سامنے تھے۔

میرا رہبر مجھے ایک گول سی جھونپڑی میں لے گیا۔ جہاں بہت زیادہ تاریکی تھی۔ ایک کونے میں کوئی بال دار چیز پھیلی پڑی تھی۔ میں اور میرا رہبر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ جھونپڑی کے دروازے پر بستی کے دوسرے جانور نما یا آدمی نما باسی جمع تھے۔ میں نے ہاتھ کے ڈنڈے پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی تھی۔

''ہاؤ!'' بال دار ڈھیر میں سے آواز آئی۔

''یہ آدمی ہے۔'' میرے رہبر نے منمناتی آواز میں کہا۔

''رہنے آیا ہے؟''

''ہاں رہنے آیا ہے۔'' میرے ساتھی نے کہا اور پھر میری طرف دیکھا جیسے وہ مجھ سے بھی یہی کہلوانا چاہتا۔

''میں آدمی ہوں اور تمہارے ساتھ رہنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا تو قانون پڑھو! میں یہاں تاریکی میں لیٹا قانون پڑھاتا ہوں۔'' پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

''چار ٹانگوں سے چلنا گناہ ہے۔ چشمے یا ندی سے منہ لگا کر پانی پینا گناہ ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ قانون پڑھانے والا جو بولتا ہے وہی الفاظ میرا رہبر دہراتا ہے! صرف یہی نہیں بلکہ باہر سے بھی دہرائے جانے کی آوازیں آتی تھیں۔ میں بھی دہرانے لگا۔

''درختوں پر ناخون گھسنا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔''

''دوسرے آدمیوں پر حملہ کرنا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔''

اسی طرح کے بہت سے احکامات ہم سب مل کر گاتے رہے پھر ان کا احکاماتی سلسلہ ختم ہوا تو سب نے مل کر ایک تعریفی گیت گانا شروع کر دیا۔

وہ جزیرے کا مالک ہے۔

وہ ہمیں بتاتا ہے۔

اس کا حکم ماننا ہم سب کا فرض ہے۔

وہ ہمیں سزا دیتا ہے۔

وہ بیچ جزیرے میں رہتا ہے۔

اس آخری جملے پر میں چونک گیا۔ یہ گیت ڈاکٹر مورو کی تعریف میں تھا تو ڈاکٹر مورو نے ان کے جسموں پر ہی نہیں دماغوں پر بھی تجربات کئے تھے۔ میں نہ چاہنے کے باوجود ان کی آوازوں میں آواز ملاتا رہا۔ میں اب بھی خطرے میں تھا۔ وحشی درندوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ ایسے وحشی جو ڈاکٹر مورو کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ پھر گیت ختم ہو گیا اور بالوں کا ڈھیر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''میں یہاں آنے والوں کو قانون سکھاتا ہوں، جو قانون توڑتا ہے۔ اسے وہ سزا دیتا ہے۔''

''بے شک قانون توڑنے والوں کو وہ ضرور سزا دیتا ہے۔'' سب نے دہرایا۔

اچانک باہر بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے راہبر اور قانون پڑھانے والے نے کان لگا کر سنا۔ شکاری کتے کی آواز مجھے بھی سنائی دی پھر ڈاکٹر مورو کی آواز آئی۔ ''مسٹر لیونارڈ! باہر آ جاؤ۔''

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دروازے میں سے ایک کتا اندر آنے کے لئے لپک رہا تھا۔ جس کی زنجیر کوئی کھینچ رہا تھا۔ جھونپڑی کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ میں جھپٹ کر کھڑکی کی طرف لپکا اور باہر کود گیا۔ یہ جھونپڑی اس بستی کے کنارے پر تھی کیونکہ میں پتھروں پر گرا۔ مگر دیر کرنے کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ میں گر کر فوراً اٹھا اور سیدھا دوڑتا چلا گیا۔ اب مجھے اپنے پیچھے، بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً ڈاکٹر مورو اور اس کے بنائے ہوئے آدمی میرے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں، چیخ پکار، منمناتی آوازیں شکاری کتے کی

غراہٹ اور ڈاکٹر مورو کی آواز۔"

"رک جاؤ! بھاگو گے تو اور کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

میں ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن ڈاکٹر مورو کی تجربہ گاہ میں پڑی ہوئی میز پر لیٹنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔

میں بھاگتا رہا مگر اچانک آس پاس سامنے غرض ہر طرف جھاڑیوں میں جان پڑ گئی۔ میں گھر گیا تھا۔ سامنے بہت سے جانور نما آدمی مجھے گھیرے ہوئے تھے اور عقب سے ڈاکٹر مورو اور فرٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں رک گیا اور میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کو حملہ کرنے کے انداز میں اٹھالیا۔ حیوان نما آدمی اپنی جگہ رک گئے۔ انہوں نے میرے انداز سے سمجھ لیا تھا کہ جو میرے قریب آئے گا، میں اسے مار ڈالوں گا یا پھر انہیں ڈاکٹر مورو نے صرف اسی قدر حکم دیا تھا کہ وہ مجھے گھیر لیں۔

ڈاکٹر مورو اور فرٹ کوئی تیس قدم کے فاصلے پر رک گئے، ڈاکٹر نے جس کتے کی زنجیر پکڑ رکھی تھی وہ میری طرف بار بار آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"واپس چلو!" فرٹ نے کہا۔

"نہیں! میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارے ہاتھوں اذیت سہنے کے بجائے یہیں لڑ کر مرنا پسند کروں گا۔"

"اذیت؟" ڈاکٹر مورو کا چہرہ بجھ گیا۔

"ہاں اذیت!" مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔ "تمہارا اپریشن تھیٹر کسی جہنم سے کم نہیں۔ تم نے ان بے چاروں کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔" میں نے ہاتھ سے ان حیوان نما آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو مجھ سے دور کھڑے تھے۔

"شش! چپ رہو......" فرٹ نے مجھے ڈانٹا۔

"نہیں! میں چپ نہیں رہوں گا۔ تم نے شیطانی عمل سے ان انسانوں کو حیوان سے بدتر بنا دیا ہے۔ تم ان پر ظلم کرتے ہو۔" میں نے محسوس کیا کہ حیوان نما آدمی میری بات توجہ سے سننے لگے تھے۔

"سنو اے، لوگو" میں بدہیت لوگوں سے مخاطب ہو گیا۔ تم ان دو سے مت ڈرو انہیں قتل کر دو!" میں نے جوش میں انہیں باقاعدہ اکسایا۔ میں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ حیوان نما آدمی میری بات غور سے سن رہے ہیں۔ وہ خاموشی سے میرے قریب آ گئے تھے جیسے میری بات سننا چاہتے ہوں۔

"سنو لیونارڈ!" فرٹ نے غصے سے کہا۔ "پاگل مت بنو! یہ حیوان ہے ہم نے انہیں انسانی شکل دینے کی کوشش کی ہے تم واپس چلو میں تمہیں تجربات کی روداد سنا دوں گا۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔ "میں تمہارے فریب میں نہیں آؤں گا۔"

"اچھا تو یہ لو!" فرٹ نے کوئی چیز میری طرف پھینکی جو میرے قدموں کے پاس آ کر گری۔ وہ پستول تھا۔ جو میں نے جھپٹ کر پستول اٹھالیا۔

"یہ بھرا ہوا پستول ہے۔ مسلح ہو کر ہمارے ساتھ واپس چلو۔" ڈاکٹر مورو نے کہا۔

میں نے اطمینان کی غرض سے قریبی پتھر پر پستول داغ دیا۔ آواز آئی اور پتھر کے ٹکڑے اڑ گئے۔ پستول بھرا ہوا تھا۔

"بہت اچھا! مگر تم دونوں آگے آگے چلو گے۔" میں مزید خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھا۔

اب وہ دونوں میرے آگے آگے تھے۔ حیوان نما آدمیوں کا گروہ اپنی جگہ کھڑا تھا۔ ڈاکٹر مورو نے کچھ عجیب سی آواز میں اشارہ کیا اور وہ سب لوگ بھرے ہوئے کھلونے کی طرح بھاگ بھاگ کر جھاڑیوں کے پیچھے چلے گئے۔ ہم تینوں قلعے کی طرف واپس آ رہے تھے مگر میں پوری طرح چوکنا تھا۔

راستے میں مجھے خیال آیا کہ میں پستول کی ایک ایک گولی سے ڈاکٹر مورو اور فرٹ کو ہلاک کر دوں مگر دوسرے لمحے مجھے وہ وحشی یاد آ گئے جن کے ہمراہ دن گزارنے محال تھے۔ یہ دونوں بہر صورت ان وحشیوں

سے بہتر تھے اب مجھے ان پر کسی حد تک اعتماد بھی آ گیا تھا۔ اگر وہ میرے دشمن ہوتے تو بھرا ہوا پستول میرے حوالے نہ کرتے۔ یقیناً انہوں نے آدمیوں کو جانور نہیں بلکہ جانوروں کو آدمی کی شکل دینے کے تجربات کئے تھے۔

قلعہ میں پہنچ کر ڈاکٹر مورو نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔ ''لیونارڈ! ہم دونوں بھی آدمی ہیں اور آدمی کی صحبت پسند کرتے ہیں۔ یہ تو سوچو کہ تم بن بلائے مہمان تھے۔ رہا تمہارا شک، تو وہ بے جا ہے۔ ہم نے تجربات حیوانات پر کئے ہیں اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔'' اس نے غور سے ایک بار پھر مجھے دیکھا اور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''تم سے ہماری ہمدردی صرف انسانی سطح پر ہے۔ یہ حیوان، جن کو میں نے آدمی بنایا ہے۔ کبھی کبھی حیوانی سطح پر لوٹ جاتے ہیں۔ میں نے ان کو انسانی زندگی کے قوانین سکھانے کا بھی بندوبست کیا ہے۔''

مجھے قانون سکھانے والا بالدار ڈھیر یاد گیا۔

''جس طرح ایک سنگ تراش پتھر کو تراش کر مورتیاں بنا سکتا ہے، اسی طرح میں نے حیوانات کے اعضاء کی قطع برید کر کے انہیں انسانی شکل دی ہے۔ میں نے ان کی جسمانی ساخت ہی نہیں بلکہ دماغی ساخت بدلنے کے لئے بھی سرجری کی ہے اور ان میں بولنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔''

میں نے پستول فرٹ کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے لے کر بے دلی سے میز پر رکھ دیا۔

ڈاکٹر مورو نے پستول کو دیکھا پھر میری طرف دیکھا۔ اس بار پہلی دفعہ میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ ''مسٹر لیونارڈ! تم بہت جلد مشکوک ہو گئے ورنہ ہم خود تمہیں ساری باتیں بتا دیتے!''

میں اس سے بہت مرعوب تھا مگر دل ہی دل میں اس کے اس طریقہ کار سے مطمئن نہ تھا۔ میرے نزدیک یہ تجربات ظلم کی حیثیت رکھتے تھے۔ بے چارے جانور اپنی عادتیں ترک کر کے انسانی طور طریقے اپناتے تھے۔ روزانہ ورد کرتے تھے کہ وہ آدمی ہیں اور ان کے لئے کیا باتیں گناہ ہیں!

''مگر کیا یہ مکمل آدمی بن چکے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں! میں ابھی تجربات کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی ان کی اصلی عادتیں عود کر آتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ خطرناک ہو جاتے ہیں مثلاً میں نے ایک ریچھ بنایا تھا مگر جب اس کی عادت واپس آ گئی تو اس نے بڑی تباہی پھیلا دی۔'' اس پر فرٹ نے اپنا داہنا بازو مجھے دکھایا۔ اوپری حصہ جیسے کسی کے سخت دانتوں نے چبا ڈالا تھا۔

''پھر ہم نے اسے گولی ماردی۔''

یہ ڈاکٹر مورو کا آخری جملہ تھا جو میں نے سنا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد جب میرا دل ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہونے لگا تھا تو شاید میرے اعصاب سکون چاہتے تھے۔ میں کئی گھنٹے پرسکون نیند لینے کے بعد اٹھا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میں دس بارہ گھنٹے سو چکا تھا۔

اس واقعے کے بعد زندگی نارمل طور سے گزرنے لگی۔ میں ڈاکٹر مورو اور فرٹ کی جانب سے مطمئن تھا مگر اس کے ان ملازموں کی جانب سے خوفزدہ رہتا تھا جو مختلف جانوروں کے آپریشن کرنے کے بعد بنائے گئے تھے۔ مثلاً بیل آدمی، بھیڑیا آدمی، کتا آدمی! میں سوچتا تھا کہ معلوم نہیں کب ان کی وحشت ان میں جاگ اٹھے! وحشی آدمیوں کی بستی کی طرف میں اکیلا کبھی نہیں گیا۔ کیونکہ انہیں دیکھ کر میرے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھر آتے تھے۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔

ادھر ڈاکٹر مورو تیندوے پر اپنے تجربات کرنے میں مصروف تھا۔ وہ ایک نیا آدمی نما تیندوا بنانے میں دن رات مصروف رہتا تھا۔ اس لئے میری ملاقات اس سے مہینوں نہ ہو سکی۔

میں ڈاکٹر مورو اور فرٹ کا اس لئے ضرور احسان مند رہا کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی مجھے اپنے تجربات میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں قلعہ کے اندر واقع ایک لائبریری میں وقت گزارتا تھا۔ جہاں دنیا جہان کے

اخبارات اور کتابیں موجود تھیں۔ ایک ٹوٹا پھوٹا ریڈیو بھی مجھے مل گیا جسے درست کر کے میں نے بیرونی دنیا سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ اس طرح میں نے چھ ماہ تفریح اور پرسکون رہ کر گزار دیئے۔

مہذب دنیا مجھے اکثر یاد آتی۔ ڈاکٹر مورو اور فرٹ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ مجھے بہت جلد مہذب دنیا تک پہنچا دیں گے۔ ان کے کہنے کے مطابق ان کا کوئی دوست چھ ماہ میں جہاز لے کر جزیرے کے دو تین چکر ضرور لگا لیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ چھ ماہ کی طویل مدت میں مجھے روزانہ یہی آس رہی کہ آج کسی وقت جہاز کے مستول مجھے نظر آ جائیں گے مگر روزانہ یہی حسرت لے کر میں سو جاتا اور خوابوں میں بھی جہاز نظر آتے۔

ایک دن فرٹ کا خاص ملازم جسے جہاز پر کالے شیطان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، بڑی پریشانی کے عالم میں آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خرگوش کا سر تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں مردہ جسم۔ فرٹ اسے دیکھ کر بے چینی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ یہ اطلاع فوراً ڈاکٹر مورو کو پہنچائی گئی اور وہ وہاں بھی آ گیا۔ کالا شیطان جلدی جلدی بتا رہا تھا کہ اس نے یہ خرگوش کہاں سے اٹھایا۔ مجھے ان سب کی بے چینی اور پریشانی کا مطلب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''غضب ہو گیا۔'' ڈاکٹر مورو نے مجھے مخاطب کیا۔ اب اکثر وہ مجھے جزیرے کے معاملات میں اعتماد میں لے لیا کرتا تھا۔

''میں سمجھا نہیں!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''کوئی آدمی نما جانور خون کا عادی ہونے والا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تو؟''

''بس یہی ایک خرابی ہے اگر کوئی وحشی جانور مثلاً بھیڑیا وغیرہ آدمی بننے کے بعد خون کا مزہ چکھ لے تو وہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں قانون ہے کہ گوشت نہیں کھلایا جائے گا۔''

''خطرناک! مگر اکثر جانور تو قانون توڑتے رہتے ہیں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو سزا دی جاتی ہے۔''

ڈاکٹر مورو اور فرٹ اب جنگل میں چلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے ملازم سے فل بوٹ منگوائے تھے جن کی تعداد تین تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اس مہم میں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔

''کیا یہ قانون نہیں ہے کہ کوئی جانور چشمہ یا ندی سے جانوروں کی طرح پانی نہیں پیئے گا۔'' مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا جب نیلے لباس والے ایک حیوان نما آدمی کو میں نے چشمے سے جانوروں کی طرح ہاتھ پیروں پر جھک کر پانی پیتے دیکھا تھا۔

''اس کی بھی سزا ہے مگر تم نے کیسے دیکھا۔''

''نیلے لباس میں کوئی تھا۔'' میں نے اس کا واقعہ دہرایا۔

''نیلے لباس والا!'' ڈاکٹر مورو اور فرٹ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''اس خرگوش والے حادثے میں بھی وہی مشکوک ہے۔''

جب ہم نیلے لباس والے کو سزا دینے نکلے تو ہم تینوں کے ہاتھ میں ایک ایک چابک تھا۔ فرٹ کا ملازم تاروں کا ایک گچھا لیے ہوئے تھا۔ ڈاکٹر مورو کے دائیں کندھے پر ایک بگل لٹکا ہوا تھا۔ ہم اسی راستے پر جا رہے تھے۔ جو وحشی بستی کی طرف جاتا تھا۔ بستی کے قریب واقع میدان میں پہنچ کر ڈاکٹر نے بگل بجا دیا۔ اس کی کرخت آواز گونجی۔ دور بستی میں بھنبھناہٹ شروع ہوئی اور پندرہ منٹ کے اندر اندر میدان میں ہر طرف بدوضع جانور نما آدمی یا آدمی نما جانوروں کا اجتماع ہو گیا۔ وہ سب ایک دوسرے سے لگے بیٹھے تھے۔

فرٹ نے بلند آواز میں گنتی شروع کی۔ اکسٹھ تک گن کر وہ رک گیا۔ اب تک ہر نمبر کے جواب میں کوئی نہ کوئی بول رہا تھا مگر باسٹھ نمبر پر کوئی آواز نہ ابھری۔ فرٹ بلند آواز میں بولا۔ ''باسٹھ نمبر کہاں ہے؟''

میں نے اجتماع میں نظر ڈالی ان میں نیلے لباس

والانہیں تھا۔ یقیناً وہی مجرم تھا۔ تمام آدمی نما حیوان اپنے نمبروں سے شناخت کیے جاتے تھے۔

''قانون پڑھا جائے!''

''قانون پڑھانے والے نے ابھی آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ مشرقی سمت سے نیلے لباس والا آتا دکھائی دیا اور وہ بھی اس مجمعے میں شامل ہوگیا۔ اب جزیرے کی پوری آبادی وہاں موجود تھی۔ قانون دہرایا جانے لگا۔

''چار ہاتھ پیروں پر چلنا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔ چشمے یا ندی سے منہ لگا کر پانی پینا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔'' جب یہ قانون پڑھا گیا ''کسی جانور کو ہلاک کر کے اس کا خون پینا گناہ ہے کیونکہ ہم آدمی ہیں۔'' تو ڈاکٹر نے ہاتھ ہلا کر سب کو خاموش کر دیا۔ سارے مجمعے پر خاموشی چھا گئی۔

''یہ قانون توڑا گیا ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز گونجی۔

''سزا دینے والے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔'' سارا مجمع ایک آواز میں چلایا۔

ڈاکٹر آہستہ آہستہ چلتا ہوا نیلے لباس والے کے پاس پہنچ گیا اور زور سے بولا۔ ''جو قانون توڑے گا اسے کہاں لے جایا جائے گا۔''

''عذاب گھر میں!'' مجمع یکبارگی چلایا۔

''تو تم عذاب گھر جاؤ گے!'' ڈاکٹر مورو نے نیلے لباس والے کے سینے پر اپنے چابک کا دستہ مارا مگر یکباری نیلے لباس والا اچھلا اور اس نے ایک زناٹے دار طمانچہ ڈاکٹر کے گال پر رسید کر دیا۔ حملہ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ ڈاکٹر زمین پر کافی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ہجوم میں گڑبڑ مچ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ ہم پر پل پڑیں گے۔

صرف قانون پڑھانے والے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس وقت بھی قانون پڑھانے میں مصروف تھا یا چند آوازیں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ باقی سب کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا زعم نہیں ہے۔ مگر میں نے اندازہ لگایا کہ بیشتر آنکھوں میں غصہ اشتعال اور نفرت تھی۔

میری اس دن کی تقریر کا اثر آج ہو رہا تھا۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس فرث کو بھی ہوا کیونکہ اس کے پستول سے دو شعلے نکلے اور ہماری طرف بڑھنے والے قدم ٹھٹک گئے۔ اتنی دیر میں نیلے لباس والا اچھل کر چاروں ہاتھ پیروں کے بل برق رفتاری سے جنگل میں گھس گیا تھا۔ ڈاکٹر مورو سنبھل کر اٹھا اور اس نے پوری طاقت سے چابک ہلایا۔

''سب بیٹھ جاؤ!'' وہ چیخا

سارا مجمع پھر بیٹھ گیا۔ چند ان آدمی نما جانوروں کی لاشوں پر بھی بیٹھ گئے جو فرث کے پستول کی گولیوں کے نتیجے میں ہلاک ہوئے تھے۔

قانون پھر دہرایا جانے لگا۔

ڈاکٹر مورو کے اعصاب کی مضبوطی کا میں قائل ہوگیا۔ قانون ختم ہوا پھر ڈاکٹر مورو کی تعریف ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے سب کو حکم دیا کہ وہ نیلے لباس والے کی تلاش میں مدد دیں۔

نیلے لباس والا ایک گھنٹے کی تگ و دو کے بعد مجھے ساحل کے قریب ایک کھائی میں چھپا ہوا ملا۔ وہ اپنی تیز تیز خونی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر یہ زندہ پکڑا گیا تو اس پر ڈاکٹر اپنے خصوصی تجربات ضرور آزمائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لیا۔ گولی کھاتے ہی وہ سیدھا میری طرف آیا۔ اگر میں ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو وہ مجھے ساتھ لے کر گرتا لیکن میں بال بال بچ گیا۔ پستول کی آواز پر مورو اور فرث سب سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔

''ارے، اسے ہم زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔''

اب بہت سے آدمی نما حیوان جمع ہو گئے تھے اور اشتیاق سے مجرم کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔

وہ آپس میں سرگوشیاں بھی کرتے جا رہے تھے اور بار بار ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے کے انداز مشکوک تھے میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ نیلے لباس والے کے حملے کے بعد باقیوں پر ڈاکٹر مورو کا رعب کم ہو گیا تھا۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ صورت حال کافی

بدل گئی ہے۔

صورت حال بدلنے کا احساس ڈاکٹر مورو اور فرٹ کو بھی تھا۔ مگر وہ اپنے تیندوے والے تجربات میں اس قدر مصروف تھے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ ڈاکٹر مورو نے صرف اسی قدر کہا تھا۔

''ہمیں زیادہ سخت طریقے اختیار کرنے ہوں گے۔''

وہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر اپنے تجربات میں مصروف ہو گئے مگر میں نے احتیاطی تدابیر کے طور پر جنگل کی سمت جانا قطعاً ترک کر دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ جب قلعہ کے خاص حیوانی ملازم میری خدمت کے لئے آتے تب بھی میں پوری طرح چوکنا رہتا تھا۔ بھرا ہوا پستول ہر وقت میرے پاس رہتا تھا۔ کمرے میں بھی میں نے چابک اس طرح رکھ دیا تھا۔ جو بوقت ضرورت میری دسترس میں ہو۔

آخر میری احتیاط پسندی ایک دن میرے کام آ گئی۔ اتوار کا دن تھا۔ میں ناشتے سے فرصت پا کر اپنی بنائی ہوئی سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے طوفان آ گیا ہو۔ عقبی دروازہ افراتفری میں کھولا گیا۔ پہلے سراسیمہ حالت میں ڈاکٹر مورو نکلا اور اس کے بالکل پیچھے ایک بھیانک چہرہ۔ وہ تیندوا ہی تھا مگر کس حالت میں! اس کے بے پپوٹوں کی آنکھیں خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اور دانت باہر نکلے پڑ رہے تھے۔

ڈاکٹر مورو کو چھوڑ کر وہ سیدھا میری طرف جھپٹا۔ میں نے اسے روکنے کے لئے ہاتھ بڑھائے مگر اس نے زور سے مجھے ٹکر ماری اور میں دائیں پہلو کے بل زمین پر گر پڑا۔ وہ مجھے پھلانگ کر جنگل کی طرف دوڑ گیا۔

ڈاکٹر مورو اب خود پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے میز پر سے پستول اٹھا لیا تھا مگر اسے دیر ہو گئی تھی۔ اتنی دیر میں تیندوا نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور میں! مجھ سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ کاندھے سے ہی اتر گیا تھا۔

کے کسی دور افتادہ حصے میں کسی کام میں مصروف تھا۔ شور سن کر آیا۔ جب میں نے اسے واقعے سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ فرٹ نے سب سے پہلے میرا ہاتھ اپنی جگہ پر بیٹھایا۔ تکلیف تو کم ہو گئی تھی مگر ٹیسیں برابر جاری تھیں۔ ہم دونوں ڈاکٹر مورو کے تعاقب میں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

فرٹ نے قلعہ کے ملازمین کو جمع کر لیا۔ اب ہم چار ہو گئے تھے۔ فرٹ، فرٹ کا وہ ملازم جو قدرے کتے کی شکل کا تھا۔ اور ایک ریچھ نما آدمی۔

ہم جزیرے کے شمالی جنگل کی طرف چل پڑے کیونکہ میں نے تیندوے کو اسی سمت جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ فاصلے طے کر کے ہم نے بستی کے آدمی نما حیوانوں کی بلند آوازیں سنیں۔

''چابک والا آقا مر گیا ہے۔'' وہ ایک دوسرے کو اسی طرح اطلاع دے رہے تھے جیسے مبارک باد دے رہے ہوں پھر وہ ہمارے قریب آ گئے۔ ان میں قانون پڑھانے والا بھی تھا اور بندر نما آدمی بھی۔

''کیا بات ہے؟'' فرٹ نے گونجدار آواز میں پوچھا۔

''ارے دوسرا آقا! پہلا آقا مر گیا ہے۔ میں نے خود اس کی لاش دیکھی ہے۔'' قانون سکھانے والے کی آواز گونجی۔ آج اس کی آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی۔

''کیا اب بھی قانون باقی ہے؟'' بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں...... فرٹ، ایک لمحہ کے لئے ٹھٹھکا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے اب ذہانت کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔

''وہ مرا نہیں ہے۔ میں زندہ ہوں تو وہ بھی زندہ ہے۔'' ان سب پر سناٹا چھا گیا۔ فرٹ نے ان درندوں کو کنٹرول میں کر لیا تھا۔ ''کہاں ہے وہ جسم جسے پہلا آقا بے کار سمجھ کر چھوڑ گیا ہے۔'' فرٹ کی گونجیلی آواز ابھری۔

تھا۔ اس کے بال خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ ایک ٹانگ غائب تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور یہی حال فرٹ کا بھی ہوگا۔ مگر اس وقت ہم ذرا سی بھی کمزوری دکھانے کے موقف میں نہیں تھے۔ چند قدم پر تیندوا بھی مردہ حالت میں پڑا تھا۔ میں نے اور فرٹ نے اطمینان کی سانس لی۔

ڈاکٹر مورو کی لاش کئی آدمی نما حیوانوں کی مدد سے قلعے میں لائی گئی۔ جب وہ آدمی نما حیوان چلے گئے تو ہم نے قلعہ اندر سے بند کرلیا۔ پھر شام تک ہم تجربہ گاہ میں زیر تجربہ تمام ذی روح اجسام کو تلف کرنے میں مصروف رہے۔

ڈاکٹر مورو کی موت نے ہمیں غیر محفوظ کردیا تھا۔ اس جزیرے پر اب صرف دو انسان تھے۔ بقیہ آدمی نما حیوان۔ فرٹ کی اس اطلاع نے مجھے مزید پریشان کردیا کہ جب یہ آدمی نما حیوان دوبارہ حیوانیت کی سطح پر اتر آتے ہیں تو اس درندگی میں وہ ذہانت بھی شامل ہوتی ہے۔ جو انسانوں کی خصوصیت ہے اس لئے وہ زیادہ خطرناک ہوجاتے ہیں۔

میں اور فرٹ جزیرے سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جیسے ہی شام ڈھلی چاندنی پھیلنی شروع ہوئی۔ بستی کی طرف سے ان وحشیوں کے زور زور سے گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس سے پہلے کبھی انہوں نے زور زور سے گانے کی جسارت نہیں کی تھی۔ چند ثانیے کے بعد یہ گیت شور وغل میں تبدیل ہوگیا۔ اور قلعہ سے قریب آنے لگا۔ میں اور فرٹ خوف سے لرز گئے۔ معلوم نہیں وحشی کس لئے قلعہ کے قریب آگئے تھے۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اتفاق کی بات کہ ڈاکٹر مورو کے مرنے کے بعد قلعہ کے خصوصی حیوانی ملازم بستی میں ہی رہ گئے تھے۔

ہم نے جلدی جلدی قلعہ کے دروازے بند کیئے۔ ہم دونوں مین گیٹ کے اوپر بنائی ہوئی جگہ پر چڑھ گئے۔ وحشی شور مچاتے قلعہ کے بالکل قریب آگئے تھے۔ ان میں سے کسی نے ہمیں دروازے کے اوپر فصیل پر دیکھ لیا۔ ان میں سے بعض کی نگاہیں بہت تیز تھیں۔ وہ شور مچاتے ہوئے دروازے کے سامنے بیٹھ گئے۔

فرٹ ذرا آگے بڑھا۔ وہ ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پتا نہیں اچانک کیا ہوا۔ اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ نیچے گر پڑا۔ بالکل ان وحشیوں کے درمیان میں۔ اس کا گرنا اس قدر حیران کن نہیں تھا۔ جس قدر یہ بات حیران کن اور خوفزدہ کرنے والی تھی کہ وحشی اس پر ٹوٹ پڑے اور میں نے دوسرے آقا کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھ لیا۔

میری پھیلائی ہوئی بغاوت کی آگ رنگ لارہی تھی۔ اور اب اس کے شعلے میرے جسم تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے اس ہجوم پر پستول داغ دیا۔ ایک ہلڑ مچا۔ وہ بھاگ کر ادھر ادھر ہوگئے لیکن شاید وہ پستول کے استعمال سے ذہنی طور پر زیادہ خوفزدہ نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر مورو اور فرٹ نے انہیں پستول کی گولی سے نہیں بلکہ چابک سے ڈرنا سکھایا تھا۔ ان کا وہ عارضی خوف میرے کسی کام کا نہیں تھا۔ ان کے ارادے خطرناک تھے اور میں ان کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ تاہم مجھے اس بات کا ضرور اطمینان تھا کہ وہ قلعہ کے اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کریں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو میرا پستول ان کے اس ارادے میں ایک بڑی رکاوٹ بن سکتا تھا۔

میں ان لوگوں کی طرف منہ کرکے کھڑا ہوگیا۔ میں اس جزیرے میں اکیلا تھا۔ ڈاکٹر مورو کے بعد حیوان باغی ہوچکے تھے ان کی بغاوت کا ثبوت فرٹ کا مردہ جسم تھا جو میرے سامنے پڑا تھا۔ میں نے چابک فضا میں لہرایا۔ اس کی آواز سے ہجوم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''قانون توڑنے والے کو سزا دی جائے گی۔'' میں نے گونجدار آواز بنانے کی کوشش کی۔

''چند آوازوں نے میرے جملے کو دہرایا مگر آدمی نما ریچھ نے زور سے کہا۔ ''سزا کون دے گا؟ چابک والے آقا مر گئے۔ قانون ختم ہوگیا۔''

''نہیں!'' میں نے زور سے کہا۔ ''اب میں سزا دوں گا۔ مرنے والے مجھے تمہارا آقا بنا گئے ہیں۔''

"تم ہمیں سزا نہیں دے سکتے۔ تم بھی ہماری طرح ہو اور اسی کے بنائے ہوئے ہو۔ کیا تم ہمارے ساتھ رہنے نہیں آئے تھے؟" یہ قانون سکھانے والے کی آواز تھی۔

اس کی منطق بالکل درست تھی میں ایک دن ان کی بستی میں رہنے گیا تھا۔ اور اسی آدمی نما حیوان نے مجھے قانون بھی سکھایا تھا۔ اس لئے میں اس کی نظر میں آدمی جیسا تھا۔ میں ان کے خیال میں ان سے اعلیٰ صفات کا حامل نہیں تھا۔ وہ میرے احکامات ماننے سے منکر تھے۔

میں نے سوچا۔ قانون سکھانے والے کی ان وحشیوں میں بہت عزت ہے۔ اب صرف یہی صورت رہ گئی ہے جس سے میں اپنا رعب قائم کرسکتا ہوں کہ میں اسے سزا دوں گا۔ حالانکہ یہ رعب میں صرف اس لئے قائم کرنا چاہتا تھا کہ میں اس منحوس جزیرے سے تہذیب یافتہ دنیا تک پہنچ سکوں۔ اس کے لئے مجھے وقت درکار تھا اور وہ وقت ان وحشیوں کو اپنے قابو میں رکھ کر ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔

میں نے قانون سکھانے والے کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ میرے پستول سے شعلہ نکلا اور مجھے منطق سمجھانے والا پیچھے کی طرف گر گیا۔ ہجوم شور مچانے لگا۔ میری حکمت عملی الٹی ہوگئی تھی۔ اس کے بجائے وہ میرے رعب میں آتے، میرے اس عمل سے وہ سب مشتعل ہوگئے۔

بندر نما آدمی اچھلا اور کہنے لگا۔ "چابک والے آقا نے کہا تھا کہ جو قانون سکھانے والے کو مارے اسے سب مل کر مارو۔"

ڈاکٹر مورو نے کبھی قانون سکھانے والے کے تحفظ کے لئے جو حکم دیا تھا وہ حکم آج میرے لئے موت کا پیغام بن چکا تھا۔ میرے پستول میں اتنی گولیاں بھی نہیں تھیں کہ میں اس غصے سے بے حال اور اپنے دشمن حیوانوں پر قابو رکھ سکتا۔ میں نے چابک دوبارہ لہرایا مگر اس کی آواز سن کر بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔

اتنا ضرور ہوا کہ وہ قلعہ سے دور ہٹ گئے۔ چاندنی میں ان کی اشکال کو صاف نظر آرہی تھی اور بندر نما آدمی ان کے درمیان کھڑا ہو کر تقریر کررہا تھا۔ وہ یقیناً انہیں میرے خلاف اکسا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ لوٹ گئے۔ ابھی ان میں انسانی صفات موجود تھیں۔ اس لئے وہ رات کو سونے کے عادی تھے۔ میں نے ایک بار پھر قلعے کا چکر لگا کر دروازوں اور کھڑکیوں کی مضبوطی کا جائزہ لیا۔ قلعے میں اس قدر خوراک موجود تھی جو میرے لئے ہفتوں کام آتی۔

اسی رات میں نے ڈاکٹر مورو کی لاش لکڑیوں کے ایک ڈھیر پر رکھی اور مٹی کا تیل ڈال کر اس میں آگ لگادی۔ اس کے مردہ جسم کو ٹھکانے لگانے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ پھر میں آگ کے ذریعے ان وحشیوں کو بھی ڈرانا چاہتا تھا۔

فرٹ کی لاش اٹھانے کے لئے مجھے لازماً قلعے کا دروازہ کھولنا پڑتا، مگر میں یہ خطرہ مول لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

دوسری صبح میں نے فصیل پر چڑھ کر دیکھا تو فرٹ کی لاش وہاں موجود نہیں تھی۔ وحشی کسی وقت اس کی لاش گھسیٹ کر لے جاچکے تھے۔

اب میں قلعہ کے اندر محصور رہتا تھا۔ وحشی اکثر قلعہ کے قریب گھومتے نظر آتے تھے۔ مگر ان پر اس قلعہ کے عذاب گھر ہونے کا اس قدر خوف مسلط تھا کہ ان میں سے کسی نے کبھی اندر آنے کی ہمت نہیں کی۔ اگر کبھی ان کی نظر مجھ پر پڑجاتی تو ان کی نگاہوں میں پائی جانے والی درندگی مجھے صاف طور سے نظر آجاتی تھی۔ اور میں خوف سے لرز جاتا تھا۔

چند ہفتوں کے بعد میں نے ان میں ایک اہم تبدیلی دیکھی۔ ان میں سے اکثر چاروں ہاتھ پاؤں پر چلنے لگے تھے۔ بندر نما آدمی جو پہلے مجھے دیکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور بولتا تھا۔ اب زیادہ تر خوں خوں کرنے لگا تھا۔ ان کی حیوانی خصلتیں ان میں لوٹ رہی تھیں۔ ان کے

چہروں پر وحشت آ گئی تھی۔ عجیب مضحکہ خیز صورت تھی۔ وہ دور سے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ مگر ان کی ساری عادتیں حیوانوں جیسی ہونے لگی تھیں۔

مجھے ڈاکٹر مورو یاد آتا۔ یقیناً وہ اپنے ناکام تجربات دیکھ لیتا تو دکھ اور رنج ہوتا اور پاگل ہو جاتا۔ اگر محصور ہونے کی یہی کیفیت چند ہفتے مزید جاری رہتی تو میں بھی پاگل ہو جاتا مگر آخر وہ دن طلوع ہوا جس کا میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ میں قلعہ کی فصیل پر یوں ہی ٹہل رہا تھا کہ جنوبی افق پر مجھے کسی جہاز کے مستول نظر آئے۔ جہاز کا رخ جزیرے کی طرف تھا۔ میں اسے خوشی سے آتا دیکھتا رہا۔

کوئی گھنٹے بھر کے بعد وہ جہاز مکمل دکھائی دینے لگا۔ یہ خوشگوار منظر اس قدر مسرت افزا تھا کہ میں اسے اپنی جگہ ساکت کھڑا دیکھ رہا تھا۔

تین گھنٹے کے بعد جہاز مجھے ساحل کے قریب نظر آیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں انہیں اس خطرے سے آگاہ کردوں جو جزیرے پر موجود تھا۔ میں نے پستول بلند کر کے، ہوائی فائر کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز کی سمت سے بھی پستول چلنے کی آواز آئی۔ انہوں نے میرے پستول کی آواز سن لی تھی اور مجھے مطمئن رہنے کا پیغام دے دیا تھا۔ پھر جہاز سے کچھ لوگ اترتے دکھائی دیئے۔ میری طبیعت چاہی کہ میں قلعہ کا دروازہ کھول کر دوڑ کر ان کی طرف جاؤں مگر دوسرے ہی لمحے میں رک گیا۔ نامعلوم کتنے نادیدہ خطرے قلعہ سے باہر میرے منتظر ہوتے۔ اتنے عرصے کے بعد حقیقی انسانوں کو دیکھ کر میں رو پڑا۔

وہ سب تعداد میں دس تھے۔ اور محتاط انداز میں قلعہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب وہ ذرا آگے بڑھ آئے تو میں نے دیکھا کہ ان سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ذرا سے کھٹکے پر وہ رک کر ادھر ادھر کا جائزہ لے کر آگے بڑھتے تھے۔ ان کے محتاط قدم دیکھ کر میں مشکوک ہو گیا کہ معلوم نہیں کہ وہ کون لوگ ہیں اور کس غرض سے قلعہ کی طرف آرہے ہیں! بہر صورت وہ مجھ جیسے آدمی تھے اور میں انہیں اپنی بپتا سنا سکتا تھا۔ لیکن میرا وہم دور ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے مجھے دور سے دیکھ لیا اور دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلایا۔ میں نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ وہ جو لوگ بھی تھے دوست تھے۔ یقیناً یہ وہی جہاز تھا جس کا ذکر ڈاکٹر مورو نے کیا تھا اور میں جس کا منتظر تھا۔

میں نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا، جب ہم قلعہ کی چار دیواری میں بیٹھے تھے اور میں ان کو ساری روداد سنا رہا تھا، وہ بستی میں شور مچنے کی آواز سنائی دی مگر آج میں ان سے خوفزدہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر مورو کے دوست کپتان نے بتایا کہ وہ ساحل پر ڈاکٹر مورو اور فرٹ کو نہ پا کر ہی محتاط ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں اندیشے پیدا ہو گئے تھے لیکن صرف اس حد تک کہ ڈاکٹر مورو بیمار ہے یا اس کے بنائے ہوئے آدمی نما حیوان خطرناک ہو گئے ہیں۔

اور پھر جب ہم نے واپسی کے لئے جہاز پر سامان رکھنا شروع کیا تو آس پاس کی جھاڑیوں کے پیچھے ہم سب نے وحشی جانوروں کی نقل و حرکت محسوس کی۔ وہ بار بار ہمیں دیکھنے آتے تھے اور پھر چھپ جاتے تھے ان میں سے بیشتر جانوروں جیسی حرکتیں کر رہے تھے بہت سے انسانی آوازوں کے بجائے حیوانی آوازیں نکال رہے تھے۔ وہ سب تیزی سے جانوروں کی خصلتوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ اگرچہ وہ دیکھنے میں عجیب الخلقت آدمی لگتے تھے، مگر اب ان میں حیوانی خصلتیں ابھر آئی تھیں۔

جب جہاز چلا تو وہ سب ساحل پر جمع ہو گئے، میں نے منہ پھیر لیا۔ مجھے ان سب پر رحم آ گیا۔ ڈاکٹر مورو نے ایک ایسی نسل بنائی تھی جو دیکھنے میں آدمی تھی مگر ان کی خصلتیں حیوانوں کی تھیں۔

جزیرہ آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہونا شروع ہوا اور ہچکیاں لے کر میں رونے لگا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میرے اس طرح رونے کی اصل وجہ کیا تھی!

سپرشپ

ساجدہ راجہ۔ ہنڈواں سرگودھا

عرصہ ساٹھ سال سے وہ جہاز دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا، لاکھ کوشش کے کوئی بھی اس کا سراغ نہ لگاسکا لیکن جب اس کا راز کھلا تو کپتان کو اس میں زندگی کے آثار نظر آئے..... کیا یہ صحیح ہوسکتا ہے۔

دل ودماغ پر سکتہ طاری کرتی عجیب کہانی، جو کہ پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دے گی

اس جہاز کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ آج سے ساٹھ سال پہلے سمندر میں ڈوبا تھا۔ برف کے سمندر میں..... یہ حقیقت تھی لیکن تھوڑی مختلف..... قطب شمالی جانے والا وہ جہاز آج سے ساٹھ سال پہلے روانہ ہوا تھا اور پھر وہ کہاں غائب ہوا کسی کو خبر نہ تھی۔ اس کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا جاتا تھا کسی کا خیال تھا کہ ''وہ ڈوب گیا تھا'' لیکن ڈوبنے کی صورت میں اس کی کچھ باقیات تو ملتیں......؟

کوئی کہتا کہ ''اسے بحری قزاقوں نے اغوا کرلیا تھا'' لیکن یہ بھی سچ نہیں تھا کسی کے خیال میں ''وہ راستہ بھٹک کر کسی اور سمت چلا گیا تھا اور پھر غائب ہوگیا'' کیونکہ جہاں وہ جہاز گیا ان راستوں پر ابھی تک کسی نے سفر نہیں کیا تھا اس لئے اس جہاز کا سراغ نہ مل سکا......!

غرض جتنے منہ اتنی باتیں.......!!!

لیکن حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ ''وہ بحری جہاز نہ تو ڈوبا تھا نہ ہی اغوا ہوا تھا بلکہ اس پر اچانک اتنی برف جم گئی کہ وہ برف کا پہاڑ معلوم ہونے لگا، آج تک ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی بحری جہاز بلکہ چلتے ہوئے بحری جہاز پر یوں اچانک برف جم جائے اور وہ چلتے چلتے برف کا پہاڑ بن کے اسی جگہ جم جائے......!''

اس خطے کی سرزمین سے کون واقف نہیں لیکن آج تک ایسا تو پھر کبھی نہ ہوا تھا، اس وقت یقیناً سردی کی شدید ترین لہر آئی ہوگی اور اس نے اس بحری جہاز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوگا، اور گزرتے وقت میں اس پر مزید برف جم گئی ہوگی...... نتیجتاً وہ برف کے پہاڑ میں تبدیل ہوگیا ہوگا لیکن دنیا میں اس حقیقت سے ابھی تک کوئی باخبر نہیں تھا...... اس پراسرار اور انوکھے واقعے کا ابھی تک کسی کو پتہ نہیں تھا لیکن عنقریب پتہ لگنے والا تھا......!

☆......☆......☆

جانسن اپنے جہاز پر قطب شمالی کی مہم پہ تھا جب وہ اس برف کے پہاڑ کے قریب پہنچا جو حقیقت میں بحری جہاز تھا، تو اسے کچھ انوکھا محسوس ہوا...... اس کے اندر تجسس بیدار ہوا۔

''میں اس پہاڑ کے بالکل قریب جانا چاہتا ہوں......'' اس نے اپنے ساتھی سیم سے کہا۔ وہ جان کی اس عجیب وغریب خواہش پر حیران ہوا۔

''لیکن کیوں......؟'' سیم نے جان سے کہا۔

''یہ پورا علاقہ برفانی پہاڑوں سے اٹا پڑا ہے۔ اب سمندر کے درمیان کھڑے اس برفانی پہاڑ میں تمہیں کیا بات نظر آئی کہ تم اتنی ٹھنڈ میں اس پانی میں کود کر اس کے قریب جانا چاہتے ہو......؟''

''پتہ نہیں کیوں لیکن مجھے جانا ہے......''

''دیکھو جان، ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں صرف برف ہی برف ہے تم اپنا یہ شوق ہاں خوب اچھے طریقے سے پورا کر لینا لیکن یہاں، بہرحال جانے کا مشورہ میں تمہیں نہیں دوں گا......'' سیم قطعی لہجے میں کہا تو جان ہنس پڑا۔

''یار تم سے مشورہ کس نے مانگا ہے میں تو محض تمہیں مطلع کر رہا ہوں۔ جونہی جہاز اس پہاڑ کے قریب پہنچے تم جہاز روک لینا، میں ذرا جانے کی تیاری کرلوں۔''

اور سیم جان گیا کہ وہ اب رکنے والا نہیں۔ ناچاروں خاموش ہوگیا اور جہاز کی رفتار بالکل آہستہ کردی۔ اور پہاڑ کے قریب پہنچ کر بالکل روک دیا۔

جان مکمل واٹر پروف لباس میں تھا اور مکمل تیاری کے بعد اس نے سیم کی طرف الوداعی ہاتھ ہلایا اور سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

سیم غور سے اس کی حرکات ملاحظہ کر رہا تھا، وہ پہاڑ کے آس پاس تیرتا رہا۔

اچانک بادل شدت سے گرجے تو سیم نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا گھرے سیاہ بادلوں نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بجلی پورے زور سے چمک اور کڑک نے لگی۔ نرم روی سے چلتی ہوا میں تیزی آنے لگی۔ اور وہ سمندر جو سبک روی سے بہہ رہا تھا اس میں آہستہ آہستہ بھونچال کی صورت نمایاں ہونے لگی۔

سیم کا دل زور سے دھڑکا اس نے جان کی طرف دیکھا وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا، شاید پہاڑ کی دوسری طرف چلا گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر جان کو زور زور سے آوازیں دیں لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا، ہوا کا زور بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بارش کی تیزی بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی سیم کی گھبراہٹ بھی...... جان ابھی سامنے نہیں آیا تھا لیکن اسے آنا چاہئے تھا کیونکہ بادلوں کی صورتحال شدید طوفان کی پیش گوئی کر رہی تھی اور جان پاگل تو ہرگز نہیں تھا کہ اتنے خراب موسم میں یوں سمندر میں موجود رہتا۔

اس نے پھر پوری آواز لگا کر جان کو بلایا لیکن جواب ندارد...... لہروں کی شوریدہ سردی کی وجہ سے جہاز اوپر نیچے ہونے لگا۔ تاریکی گھور تاریکی میں بدلنے لگی لیکن جان نہ آیا۔

سیم کے دل میں طرح طرح کے اندیشے سر

اٹھانے لگے کسی ناگ کی۔ تند ہوا کا زور اتنا بڑھ چکا تھا کہ اس کا عرشے پر کھڑے رہنا خطرناک تھا ویسے بھی وہ کوئی اتنا بڑا بحری جہاز تو تھا نہیں ایک بڑی کشتی کے سائز جتنا تھا لیکن اس میں ہر وہ سہولت تھی جو کسی بھی بڑے بحری جہاز میں موجود ہوتی ہے۔

سیم اندر آ گیا لیکن کھڑکی سے وہ مسلسل اسی طرف دیکھ رہا تھا جہاں جان گیا تھا لیکن وہاں کسی حرکت کے آثار نہیں تھے سوائے بارش کی بوندوں اور ہوا کے......! ہوا جو طوفان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

"اب میں کیا کروں......؟" سیم خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"اتنے طوفان میں وہاں جانا اپنے آپ کو موت کے منہ میں لے جانا ہے۔ ورنہ میں ضرور جان کے پیچھے جاتا۔ اب سوائے طوفان کے رکنے کے انتظار کے اور کچھ نہیں ہو سکتا......!"

"عجیب پر اسراریت سی ہے۔ اس پہاڑ کے قریب......" سیم نے دل میں سوچا۔ "میں ویسے بھی بھی اس کے قریب نہ جاؤں۔" اس نے دل ہی دل میں توبہ کی۔

طوفان اتنا بڑھ چکا تھا کہ ان کا جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ ہوا کی شائیں شائیں دماغ پر ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھیں۔ وسیع و عریض سمندر میں ایک پر اسرار پہاڑ کے قریب اتنے خوفناک طوفان میں اپنے جہاز میں وہ اکیلا تھا اور اس صورت میں کہ چند لمحے پہلے اس کا ساتھی جان بھی غائب ہو چکا تھا۔ بہت خوفناک لمحہ تھا......!

سیم اکیلا تھا اور اس کے لئے سیم اکیلا تھا اور اس اکیلے پن میں بہت خوف تھا اس کا دل بے شک خشک پتے کی مانند کانپ رہا تھا لیکن اس نے اپنے حواس پر قابو رکھے اس کی نظریں مسلسل اس برف کے پہاڑ پر تھیں۔ جہاز کبھی ہچکولے کھاتا کبھی پہاڑ کے قریب آتا اور کبھی لہریں اسے دور لے جاتیں۔

سیم کی شدید خواہش تھی کہ جہاز اس پر اسرار پہاڑ سے دور رہے اور قدرت شاید اس حد تک مہربان

دس یا بیس

جب میں رضوان کو پڑھا چکا تو آخری سوال کے طور پر میں نے پوچھا۔ "بیٹا! پانچ اور پانچ کتنے ہوئے؟" اس نے جواب دیا۔ "دس" میں نے اسے شاباشی دی اور کہا۔ "یہ لو تمہارا انعام دس پیسے۔" وہ منہ بسور کر بولا، "اگر مجھے پتا ہوتا تو بیس بتاتا۔"

(محمد علی شاہ۔ لاہور)

ضرور تھی کہ وہ پہاڑ کے قریب آتے آتے پھر دور چلا جاتا لیکن اس کا جہاز پہاڑ سے نہ ٹکرایا۔

اگر ٹکرا جاتا تو پھر ٹکڑے ٹکڑے......اور سیم سوچ بھی نہ سکتا کہ وہ اس شدید طوفان میں یوں بے یار و مددگار سمندر میں تیر رہا ہوگا۔ دل ہی دل میں مقدس آیات کا ورد جاری تھا۔ کچھ جان کے غائب ہونے کا دکھ اور سب سے بڑھ کر یہ شدید طوفان۔ اس کا دل شدید خوف کے زیر اثر تھا اگر طوفان نہ آتا تو وہ اب تک جان کے پیچھے ضرور جا چکا ہوتا بے شک یہ پہاڑ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا لیکن جان سے بڑھ کر تو کچھ نہیں تھا۔

وہ چاہتا تو انجن اسٹارٹ کر کے جہاز کو اس پہاڑ سے دور لے جا سکتا تھا لیکن وہ ایسا اس لئے نہیں کر رہا تھا کیونکہ اسے جان کی فکر لاحق تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں سے آ جائے اور اگر جہاز موجود نہ ہوا تو وہ اس شدید طوفان میں مر بھی سکتا تھا۔ ایک اور خیال نے جوش کن بھی تھا اس کا دامن پکڑا۔

"ہو سکتا ہے یہ جان پہاڑ کی دوسری جانب کسی ایسی جگہ موجود ہو جہاں وہ طوفان سے محفوظ رہ سکتا ہو۔ لیکن وہ میری آواز کا جواب تو دے سکتا تھا پہاڑ اتنا بھی بڑا نہیں کہ میری آواز اس تک نہ پہنچے۔" سیم خود ہی سوال و جواب میں مصروف تھا۔ ایک بڑی سی لہر جہاز کو

پہاڑ سے کافی دور لے گئی لیکن جب وہی لہر واپس پلٹی تو جہاز اس حد تک پہاڑ کے قریب آ گیا کہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

جہاز جب پہاڑ کے قریب پہنچا تو سیم کو کچھ عجیب سا نظر آیا ایسے جیسے وہ برف تڑخ رہی ہو۔

اتنے میں لہر کے زور پر جہاز پھر پہاڑ سے دور ہو گیا اور سیم نے اسے اپنا وہم سمجھا......!

اسے بھوک محسوس ہونے لگی کیونکہ جب بھی وہ ٹینشن میں ہوتا تھا بہت کھاتا تھا اس وقت بھی ڈر اور ٹینشن نے اس کی بھوک کو جگا دیا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر کچن میں آیا سینڈ وچ کھا کر اس کی جان میں جان آئی۔ کافی کی طلب اتنی شدید تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کافی بنائے جہاز مسلسل ہل رہا تھا اور کافی بنانا نہایت مشکل کام۔ جتنی مشکل سے اس نے کافی تیار کی وہی جانتا تھا۔

''اس سے بہتر میں کافی پیتا ہی نہیں۔'' وہیں کچن کے فرش پر بیٹھ کر سیم نے یہ بات سوچی جب جہاز کے ہچکولے سے کچھ برتن اس کے اوپر آ گرے......! سر میں گومڑ ابھر آیا۔ ''لو جی ایک اور مصیبت......'' وہ دل ہی دل میں خود کو کوستا گرتا پڑتا کھڑکی کے پاس آیا اور جب اس نے باہر نظر ڈالی تو اسے اپنی نظروں کا دھوکا محسوس ہوا کیونکہ وہ منظر ہی ایسا تھا......!

پہاڑ کی برف درمیان سے تڑخ چکی تھی اور درمیان کا منظر اور بھی حیران کر دینے والا تھا۔

جہاں جہاں سے برف تڑخی تھی وہاں سے ایک جہاز کا ڈھانچہ نمودار ہوا تھا۔ وہ جہاز کی کھڑکیاں تھیں جو ٹوٹی ہوئی تھیں اور ان سے کچھ چہرے جھانک رہے تھے!

سفید بالکل سفید برف کی مانند سرد بے جان اور سب سے خوفناک ان کی مسکراہٹ تھی جو ان کے بے جان چہروں پر پھیلی ہوئی تھی وہ سب یک ٹک سیم کو گھور رہے تھے اپنی پراسرار ویران بے نور آنکھوں سے۔

سیم ساکت سا ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ طوفان تھمنا شروع ہو چکا تھا۔ ہوائیں دم توڑ چکی تھیں۔ بارش رک گئی تھی بادل دھیرے دھیرے سمٹنا شروع ہو گئے تھے ماحول پرسکون ہو چکا تھا لیکن اس سکوت میں جان لیوا خوفناک چہرے تھے جو اچانک نمودار ہوئے تھے۔

سیم کی سانس اٹکنے لگی۔ دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہونے لگا۔ لیکن باوجود کوشش کے وہ ان سفید بے جان چہروں سے نظریں نہ ہٹا پایا۔

ہچکولے کھاتا جہاز پرسکون ہو رہا تھا ایسے میں سیم اچھی طرح نظریں جما کر ان کو دیکھ سکتا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا لیکن خوف کے عالم میں......وہ دو آدمی تھے ایک ادھیڑ عمر اور ایک بالکل جوان، ان کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں کھنچے ہوئے تھے جیسے دونوں جبڑوں کو کسی نے چیونگم کی مانند کھینچا ہوا ہو......سیم لرز گیا ایسی بے جان سرد اور موت سے بھرپور مسکراہٹ اس نے کب دیکھی تھی۔

وہ دعا کر رہا تھا کہ وہ لوگ مسکرانا چھوڑ دیں۔ اتنے میں ایک اور چہرہ پیچھے سے نمودار ہوا اور سیم جیسے خواب سے جاگ اٹھا اور وہ جان تھا لیکن یہ کیا......؟ وہ کہیں سے بھی زندہ لوگوں جیسا نہیں لگ رہا تھا کسی روبوٹ کی مانند وہ چلتا ہوا ادھیڑ عمر آدمی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ادھیڑ عمر آدمی نے مسکراتے ہوئے جان کی طرف دیکھا اور اپنا بازو جان کے کندھوں کے گرد پھیلا دیا جیسے ایک دوست دوسرے سے محبت میں کرتا ہے لیکن جان کا چہرہ سپاٹ ہی رہا......!

سیم بھاگ کر ریلنگ کے قریب آیا اور جان کو آوازیں دینے لگا۔ لیکن جان یونہی سپاٹ سے انداز میں کھڑا رہا۔

''یہ جان! بول کیوں نہیں رہا اور یہ لوگ اچانک کہاں سے نمودار ہو گئے؟'' سیم کا دماغ جان کو سامنے پا کر تیزی سے کام کرنے لگا۔ ''یہ لوگ......؟'' اس نے دماغ پر زور دیا۔ ''یہ مجھے دیکھے دیکھے سے کیوں لگ رہے ہیں......؟''

اور پھر ایک جھماکے سے سیم کو سب کچھ یاد آ گیا۔

ادھیڑ عمر آدمی کپتان رچرڈ لی تھا اور اس کے ساتھ جوان آدمی سولنگی تھا۔ سیم نے انہیں دیکھ رکھا تھا

مین اخبارات میں یا انٹرنیٹ پر ان کی تصاویر اتنی بار سیم نے دیکھی تھیں کہ اسے حفظ ہوگئی تھیں!

وہ دونوں آج تے، ساٹھ سال پہلے سپر شپ نامی جہاز میں اس خطے میں آئے تھے اور پھر کبھی واپس نہ جاسکے۔ اس جہاز کے ساتھ کیا ہوا آج تک دنیا اس راز سے ناواقف تھی۔ لیکن اب وہی جہاز سیم کے سامنے تھا اپنے کپتان سمیت......

سب کچھ یاد آنے پر سیم حیرت سے ان کو دیکھ رہا تھا، اب حیرت انگیز طور پر اسے اتنا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن ساٹھ سال تک اتنی سردی میں اور خوراک کے بغیر ساٹھ سال تک زندہ رہنا ناممکن ہے تو پھر یہ لگ کیوں زندہ ہیں؟'' سیم بڑبڑایا۔

''کیا یہ واقعی زندہ ہیں......؟'' سیم نے غور سے ان کے زندگی سے ناآشنا چہروں کو دیکھا اور جھرجھری لی۔

''یہ زندہ تو ہرگز نہیں......تو پھر یہ......؟؟'' سیم کو کچھ سمجھ نہ آئی۔

''خود کو الجھاؤ مت سیم......'' سیم چونک گیا یہ آواز بلاشبہ جان کی تھی۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یہ وہ جہاز ہے جو آج سے ساٹھ سال پہلے قطب شمالی کی مہم پہ نکلا تھا لیکن بدقسمتی سے اپنی منزل پہ نہ پہنچ پایا۔ ایک طوفان نے اسے اپنے راستے سے ہٹادیا اور پھر سردی کی اتنی شدید لہر آئی کہ چلتا جہاز منجمد ہوگیا۔

لاکھ سرتوڑ کوششیں کیں لیکن جہاز کو نہ چلنا تھا نہ چلا اور پھر ایک اور دل دوز واقعہ ہوا۔

جہاز پر برف جمنا شروع ہوگئی حالانکہ برف باری بھی نہیں ہوئی تھی، پہلے ہلکی ہلکی اس پر برف اتنی تیزی سے جمی کہ جہاز میں موجود لوگوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور جو جہاں تھے وہیں جم گئے۔ رگوں میں دوڑتا خون برف میں تبدیل ہوگیا اور دوسری سانس گویا اندر ہی جم گئی۔

یہ دونوں مرے نہیں لیکن زندہ بھی نہیں ہیں یہ کسی درمیانی کیفیت میں ہیں لیکن یہ زندہ انسانوں میں اب ہرگز شمار نہیں ہوتے۔

دن بدن اور پھر سال پر سال گزرتے گئے۔ برف کی تہہ موٹی ہوتی گئی اور آخرکار ایک چھوٹے سے پہاڑ میں تبدیل ہوگئی۔

سب کو سپر شپ کی پراسرار گمشدگی پر حیرانی تھی۔ اسے تلاش کرنے کی بھی کوششیں کی گئیں لیکن سب ناکام۔ اس چھوٹے سے پہاڑ کو ہر بار دیکھا گیا لیکن کسی نے سوچنا تک گوارہ نہ کیا کہ اس پہاڑ کی یہاں موجودگی کی وجہ کیا ہے......؟

حالانکہ اس پہاڑ کی انوکھی ساخت ایک دفعہ تو چونکا دیتی ہے۔ لیکن......؟ خیر تھک ہار کر سب خاموش ہوگئے اور اس واقعہ کو پراسرار کہہ کر سب چپ سادھ کر بیٹھ گئے......!

ساٹھ سال گزر چکے۔ یہ دونوں دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ یہ یہاں زندہ برف میں تبدیل ہوگئے اور دوسرا انسانی دنیا میں اتنا عرصہ رہنے کے بعد انہیں کسی ایسے انسان کی ضرورت محسوس ہوئی جو انہیں ان کی دنیا کی سب باتیں بتاتا اور دنیا کو ان کی سب باتیں......!

ہمارا جہاز قریب سے گزرا میں نے ان پہاڑوں کو دیکھ کر تجسس محسوس کیا اور باقی سارا کچھ تمہارے سامنے ہوا......لیکن افسوس میرے دوست کہ اب میں واپس نہیں آسکتا یہ دونوں کسی انسان کے لئے ترسے ہوئے تھے، بدقسمتی، اور ان کے نزدیک خوش قسمتی کہ میں ادھر آگیا اور یہ مجھے اپنے جہاز میں لے آئے، اب میں کبھی واپس نہیں آسکتا، کیونکہ یہ مجھے کبھی آنے نہیں دیں گے۔ عنقریب میں بھی ان جیسا ہونے والا ہوں اس لئے میرے دوست تم اب واپس جاؤ اور سب کو اس حقیقت سے جلد از جلد آگاہ کرو ورنہ میرے جیسے نہ جانے کتنے یہاں آکر پھنستے رہیں گے۔ جلدی کرو۔''

یہ سن کر سیم نے بوجھل دل کے ساتھ انجن اسٹارٹ کیا اور جہاز کو واپسی کے لئے موڑ دیا۔

☠

زندہ صدیاں

ایم اے راحت

قسط نمبر: 05

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، انوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے در وا کرتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

ہم کارگس میں داخل ہوگئے اور نیولس نے پہلے شاہی محل کا رخ کیا تھا۔ میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ لیکن جس وقت نیولس ایگانوس کے سامنے پہنچا تو میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

نیولس نے بڑے پریشان لہجے میں اپنی ناکامی کی داستان سنائی تھی۔ اس نے بتایا کہ قافلہ لوٹ لیا گیا۔ باغیوں کی نگاہوں سے وہ روپوش نہ ہوسکا اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو زخمی کرکے ڈال دیا گیا۔ ایگانوس کا غصہ شباب پر تھا۔

"یوں لگتا ہے نیولس کہ تم اپنے عہدے کے قابل نہیں ہو۔ باغیوں کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی ہیں اور تم ہمیشہ اپنی ناکام صورت لے کر میرے سامنے آتے ہو۔"

"میں شرمسار ہوں۔" نیولس نے کہا۔

"لیکن تمہاری شرمساری نیوسکی کے باغیوں کو ختم نہیں کرسکتی، میں نیوسکی سے مشورہ کرکے کسی اور شخص کو تمہاری جگہ تعینات کروں گا اس وقت تک تم اپنے عہدے کو چھوڑ کر محل کے محافظوں کے گھروں کی خدمت انجام دو۔"

نیولس نے سر جھکا دیا۔ اور پھر وہاں سے چلا آیا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا خیال ہے یولیسیس ہمارے دوست ایگانوس نے تو ہمارے اوپر عنایت کی ہے۔"

"بے شک ہمیں اس کا شکرگزار ہونا چاہئے۔"

"اور میرا خیال ہے اب تم اپنا کام انجام دو۔"

"کون سا کام؟"

"تم ایگانوس کو اس کی بیٹی ارکاشہ کے بارے میں بتادو۔ یہ ایک دلچسپ کام ہوگا۔"

"لیکن اب تو تمہاری خدمت بدل چکی ہے نیولس۔ کیوں نہ یہ کام اب تم کرو۔ ظاہر ہے تم محل کے محافظوں کے نگران بن گئے ہو۔"

"اوہ جیسا تم کہو۔" نیولس نے کہا اور ہم اس سلسلے میں لائحہ عمل مرتب کرنے لگے۔

اسلحہ خانے سے اسلحے کی چوری کی بات ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ بہرحال نیولس نے محل کے نگران کی حیثیت سے معاملات سنبھال لئے۔ میں حسب معمول گوریلے شہنشاہ نیوسکی کا خادم بن گیا تھا۔ اور مستقل طور پر اس کی خواب گاہ میں تعینات تھا تاکہ اس پر نگاہ رکھوں۔ اور بلاشبہ اس گوریلے کے کارنامے بے حد گھناؤنے اور قابل نفرت تھے۔ مجھے اس کی ذات سے بے پناہ گھن آنے لگی تھی اور میں نے یہ بات بخوبی محسوس

کی تھی کہ دوسرے پہرے دار محل کے دوسرے بے شمار لوگ اس سے بے پناہ نفرت کرتے تھے۔ وہ اس کی رعیت میں تھے لیکن خوش نہیں تھے۔

نوجوان اور زرخیز لڑکیاں گوریلے کی خواب گاہ میں پہنچائی جاتی تھیں۔ اور اس کے بعد یا تو ان کی لاشیں برآمد ہوتیں یا پھر وہ اس حالت میں ہوتیں کہ ان کے جسم لہولہان ہوتے۔ بڑی دردناک کیفیت ہوتی تھی ان کی اور اس کے بعد جب نیوسکی اپنی خواب گاہ سے برآمد ہوتا تو دل چاہتا کہ اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائیں۔ لیکن ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

سارے کام آہستگی سے کرنا تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا، میں اگر چاہتا تو یہ سارے کام کرسکتا تھا۔ لیکن بات صرف اس گوریلے کی نہیں تھی بلکہ کارگس کی پوری حکومت کو تبدیل کرنا تھا اور اس سلسلے میں بہرصورت اس کم بخت جانور کے ہمدرد کافی تھے نجانے کیوں؟

سو میں نے محسوس کیا کہ گوریلا حسین ترین لڑکیوں کے درمیان رہنے کے باوجود ارکاشہ سے خاص رغبت رکھتا تھا۔ اس کی وجہ میں نے محسوس کی تھی جو شاید یہ تھی کہ گوریلا آج بھی مجھے کسی قسم کی پریشانی کا شکار نظر آتا تو ارکاشہ کے کمرے کی جانب چلا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ کوئی خوب صورت حسینہ اس کی خواب گاہ میں بیٹھی اور تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگئی۔ معلوم ہوا کہ ابھی اس کی بدنصیبی کے دن نہیں آئے اور میں نے اسے ارکاشہ کی خواب گاہ کی جانب جاتے دیکھا۔ اور ہوتا اس وقت یہی تھا کہ خادموں میں سے ایک خادم ضرور اس کے ساتھ ارکاشہ کی خواب گاہ میں رہا کرتا تھا۔ لیکن اس بات کا مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔

بڑا ہی گھناؤنا کردار تھا۔ ارکاشہ کے اس بیٹے کا جس کا نطفہ ایک غلام ایمروس کا تھا اور میں نے بارہا محسوس کیا کہ ارکاشہ اب اپنی اس حرکت پر کس قدر پچھتاتی ہے۔ سو اس دن گوریلے کی ذہنی کیفیت زیادہ درست معلوم نہیں ہوتی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ پریشان ہے۔

اتنے دنوں میں مجھے اندازہ تھا کہ میں نے اس کی شخصیت کے کچھ پہلو سمجھ لئے ہیں اور اسی وقت مجھے...... اپنا کام انجام دینا تھا۔ اور اس وقت میرے اندازے کے مطابق گوریلے کی بے چینی اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ وہ ارکاشہ کی جانب ضرور جائے گا کیونکہ اس سے قبل بھی کئی بار ایسا ہی ہوچکا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے دوست نیولس کو اطلاع دی۔

نیولس نے تعجبانہ انداز میں مجھے دیکھا تھا اور پھر وہ کہنے لگا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ آج وہ وہاں ضرور جائے گا''

''ہاں! میرے دوست میرا خیال ہے اگر اسے موقع پر ہی دیکھ لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ میں اس کی بے چینی سے، یہی محسوس کرتا ہوں کہ آج وہ ضرور ارکاشہ کی جانب جائے گا۔''

''تو پھر میں ایگانوس سے بات کروں۔''

''یقیناً۔''

''تم میرے ساتھ چلوگے؟''

''ضروری ہے کیونکہ اطلاع دینے والوں میں تو میں ہی ہوں۔''

''تب آؤ ہمیں دیر نہیں کرنا چاہئے اور بہتر بھی ہوگا کہ تم اس وقت خواب گاہ میں موجود ہو جب ایگانوس کو میں وہاں لے جاؤں۔''

''میں پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے جواب دیا اور ہم دونوں ایگانوس کی جانب چل دیئے۔

ایگانوس تک رسائی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ اس نے اطلاع ملنے پر ہمیں اپنی آرام گاہ میں بلالیا۔

''نیولس کیا تم اپنے عہدے کی بحالی کی بات کرنے آئے ہو۔ لیکن میں اس سلسلے میں سارس کا انتخاب کرچکا ہوں اور میں نے اسے ہدایت بھی دے دی ہے کہ وہ باغیوں کی سرکوبی کے لئے انتہائی اقدامات کرے اور تم اب اس کا نتیجہ دیکھ لوگے۔''

''ایگانوس زیرک اور دانشمند ہے اور اس کے جو

فیصلے ہوتے ہیں وہ...... کارگس کی بقا کے لئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ نیوسکی کے وفادار کی حیثیت سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ ایگانوس کے فیصلوں کی اطاعت کرے اس لئے مجھے جو منصب بخشا گیا ہے وہ میرے۔لئے کم نہیں ہے اور میں اپنے پرانے منصب کی بحالی کے۔لئے نہیں آیا۔"

"پھر...... پھر کیا بات ہے؟" نیولس کے الفاظ سے ایگانوس کا رویہ نرم نظر آنے لگا۔

"اس سے قبل میری توجہ باغیوں کی جانب مبذول تھی لیکن محل میں آکر میں نے حسب استطاعت محل کے حالات کو پرکھا ہے اور اس وقت میں ایک دردناک اطلاع لے کر تیرے پاس آیا ہوں ایگانوس۔ اور یہ میرا فرض تھا۔"

"دردناک اطلاع؟" ایگانوس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں ایگانوس کی غیرت اور وطن دوستی میری نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ نیوسکی اس کا نواسہ ہے لیکن میں جانتا ہوں شاہی وقار اور دبدبہ اسے ایگانوس نے ہی عطا کیا ہے اور ایگانوس اس کا نگران ہے لیکن میرے علم میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ ایگانوس نے بذات خود اپنے اجداد یا کارگس کے قانون یا عزت وحمیت کے قانون کی دھجیاں اڑائی ہوں۔"

"ہاں یہ حقیقت ہے۔ ہم نے نیوسکی کے معاملات میں مداخلت نہیں کی لیکن خود کبھی کارگس کے قوانین کو عمدہ نہیں کہا۔"

"اس لئے مجھے یقین ہے کہ اس معاملے کی ایگانوس کو اطلاع نہیں ہے۔"

"کس معاملے کی بات کر رہے ہو نیولس۔ بات کو الجھائے بغیر صاف صاف کہو۔"

"ہمارے اس خادم کا نام اسلاز ہے اور یہ میری جانب سے نیوسکی کی خواب گاہ پر تعینات تھا۔" نیولس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"تو پھر تمہارے اس خادم نے ایسی کیا بات دیکھی جس سے تم نے محسوس کیا کہ کارگس کا قانون زخمی ہوا ہے۔"

"خادم کی یہ مجال نہیں ہے شاہ ایگانوس کہ وہ کسی قسم کی مداخلت یا اپنی طرف سے کوئی ایسی بات کرے جو اس کی حیثیت سے برتر ہو۔ لیکن شہزادی ارکاشہ نے اس سے خود مظلومانہ درخواست کی کہ وہ کم از کم ایک بار تو ایگانوس کو اس کا پیغام دے اور اسے بتائے کہ جب سے اس نے ارکاشہ کی جانب سے نگاہیں پھیریں۔ ارکاشہ کی حیثیت اس محل میں کیا ہوگئی ہے اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔"

"ارکاشہ" ایگانوس کی آواز میں لرزش تھی۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ پھر بولا۔

"کیا ہوا ارکاشہ کو؟"

"شاہ ایگانوس، کیا تم نے اس دوران کبھی ارکاشہ کی خیریت جاننے کی کوشش کی ہے۔ کیا تم اس سے ملے ہو۔"

"نہیں...... طویل عرصے سے نہیں۔"

"اور اس کی وجہ کیا ہے، یہ پوچھنے کا حق ایک خادم کو تو نہیں ہے لیکن......" نیولس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ارکاشہ کی کچھ باتوں سے شدید...... ناراض تھا۔ میں منتظر تھا اس بات کا کہ ارکاشہ خود مجھ سے رابطہ قائم کرتی۔"

اس کے انداز میں بے پناہ بے چینی تھی۔ وہ پھر بولا۔

"لیکن اس نے مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا اور میں اس سے برگشتہ رہا۔"

"افسوس۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھی کہ تم سے رابطہ قائم کرتی۔ شاہ ایگانوس۔" نیولس نے کہا۔

"کیوں ایسی کیا بات ہوئی؟"

"تمہیں شاید اس بات کی اطلاع نہیں ہے کہ شاہ نیوسکی بعض معاملات میں انسانوں سے قطعی مختلف ہیں۔"

"مجھے اندازہ ہے۔"

"پھر جب تمہیں اندازہ تھا شاہ ایگانوس تو کیا تمہیں معلوم ہے کہ کارگس کی تاریخ میں کبھی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہو کہ کسی ماں کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ اپنی ماں کا رشتہ ذہن سے مٹا دے اور اسے بھی ایک عورت سمجھے۔"

"کیا...... کیا کہہ رہے ہو۔" ایگانوس کی آواز میں

خوف کے آثار تھے۔

"ہاں، میرا یہ خادم اپنی نگاہوں سے وہ درندگی دیکھ چکا ہے۔ جس کے نشانات ارکاشہ کے بدن پر کسی ثبوت کی مانند موجود ہیں۔ اس کا پورا جسم زخمی کیا جا چکا ہے اور وقفے وقفے سے اس کے بدن کی سرخ خراشوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ وہ وحشت خیز سلوک ہے جو ایک درندہ اپنی ماں کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ خراشیں نیوسکی کے ناخنوں سے بنتی ہیں۔ حتیٰ کہ بے چاری ارکاشہ اس قابل نہیں رہ جاتی کہ خود اٹھ سکے۔"

"نہیں...... نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا...... یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔" ایگانوس کے لہجے میں وحشت تھی۔

"یہ بالکل درست ہے ایگانوس۔ میرا خادم اس کا چشم دید گواہ ہے اور خود ارکاشہ نے اس بات کے لئے کہا ہے کہ کم از کم ایگانوس کو اس کی حالت زار کی اطلاع دی جائے گی۔"

"اوہ...... اوہ...... وحشی درندے، وحشی کتے، تو نے ایگانوس کی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ تو نے ایگانوس کے سینے میں سوراخ کیا ہے۔ ایگانوس جس نے تجھے کسی قابل بنایا۔ جس نے تجھے عروج پر پہنچایا۔ وہ تجھے فنا بھی کر سکتا ہے۔ ارکاشہ میری بیٹی میری بچی۔ تیرے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہے۔ نوجوان اسیلازم مجھے ساری باتیں سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے میری بیٹی کے ساتھ درندگی کا سلوک دیکھا ہے۔"

"ہاں شاہ ایگانوس۔ وہ چیختی ہے کراہتی ہے لیکن نیوسکی اس پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ وہ ارکاشہ کو نوچتا کھسوٹتا ہے۔ اسے اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹختا ہے اور اسے بالکل نڈھال کر دیتا ہے۔ ارکاشہ ایک قیدی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اسے اپنے کمرے سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے اور وہ اپنی آواز دروازے پر کھڑے ہوئے پہرے داروں کو نہیں سنا سکتی۔"

ایگانوس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ تب اس نے خوفناک لہجے میں کہا۔

"نیوسکی...... نیوسکی...... اب تیری زندگی میرے لئے مناسب نہیں ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تو وحشت اور درندگی کی یہ بدترین مثال قائم کرے گا۔ نیوسکی تو نے میرے خوابوں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ آہ میں نے تیرے بارے میں کیا سوچا تھا۔ لیکن تو نے میرے سینے میں ہی خنجر بھونک دیا ہے۔ نیولس...... نیولس تو نے میرے اوپر احسان کیا ہے۔ بے شک تو میرا مخلص اور ہمدرد ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بہتر سلوک نہیں کیا۔ میں ابھی ارکاشہ سے ملوں گا۔ آہ میری بچی کس اذیت کا شکار ہے۔"

ایگانوس غصے اور رنج کی کیفیت سے نڈھال ہو گیا تھا۔

"شاہ ایگانوس...... میری ایک درخواست ہے۔"

"کیا؟" اس نے غم واندوزہ کے لہجے میں کہا۔

"ابھی آپ انتظار کریں۔"

"کیا انتظار کروں؟"

"اگر آپ کچھ انتظار کریں تو بہتر ہے۔ میں اس وقت آپ کو وہاں پہنچاؤں جب نیوسکی درندگی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ دوسری صورت میں وہ ہم سب کو جھوٹا بھی ثابت کر سکتا ہے۔"

"لیکن میں کیسے انتظار کروں۔ میں اپنی بچی کے لئے بے چین ہوں۔"

"ہمیں مصلحتاً ایسا کرنا پڑے گا۔"

"کیسی مصلحت؟ میں آج بھی قادر ہوں۔ وہ کیا سمجھتا ہے خود کو۔ اس نے تو اپنی ماں کا خیال کیا نہ میرا۔ میں نے اس کے لئے کیا نہیں کیا۔ لیکن آج بھی میری آواز اس سے برتر ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو...... بولو کیا سمجھتے ہو تم؟"

"کس کے بارے میں شاہ ایگانوس؟"

"کارگس پر کس کی حکومت ہے۔"

"نیوسکی کی۔"

"دوسروں کی طرح تم بھی احمق ہو۔ ذرا بھی سمجھدار ہوتے تو سمجھ جاتے نیوسکی ہوتا کون ہے ایک وحشی صرف ایک جانور جسے میں نے انسان بنایا ہے۔ جب وہ اپنی ہیئت نہیں بدل سکا تو اور کیا کر سکتا ہے۔ نہیں نیولس کارگس

پر آج بھی میری حکومت ہے اور اس کے وفادار میری قوت سے نہیں لڑ سکتے۔"

"شاہ بہتر جانتا ہے۔"

"لیکن میں تمہاری بات مانوں گا خادم۔ جاؤ اپنا کام انجام دو۔ اور نیولس تم میرے ساتھ رہو۔ میں اسے عالم وحشت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے سر جھکا دیا اور پھر میں واپس نیوسکی کی خواب گاہ میں آ گیا۔ وحشی درندہ اندر غرا رہا تھا۔ اور پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ آندھی اور طوفان کی طرح باہر نکلا۔ اس کے انداز میں وحشت تھی۔

تمام خادم مودب ہو گئے۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ اس کے پیچھے جائے لیکن مجھے کسی بات کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا اور میں نے محسوس کر لیا کہ اس کا رخ ارکاشہ کی خواب گاہ کی طرف ہی تھا۔

تب میں نے اس کے ساتھ اندر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اور میں ایگانوس کی طرف چل پڑا۔ نیولس ایگانوس کے پاس موجود تھا۔ دونوں مجھے دیکھ کر اچھل پڑے تھے۔

"وہ...... وہ شہزادی کے کمرے کی جانب گیا ہے۔" میں نے خادموں کے سے انداز میں کہا۔

"اوہ...... چلو...... چلو نیولس...... آؤ۔"

ایگانوس نے بڑا خنجر اپنے لباس میں چھپا لیا اور پھر وہ باہر لپکا۔ میں اور نیولس اس کے پیچھے تھے۔ نیولس نے مسکراتے ہوئے مجھے آنکھ ماری اور میں بھی مسکرانے لگا۔

تب ہم تینوں ارکاشہ کی خواب گاہ پر پہنچ گئے۔ خواب گاہ کا دروازہ بند نہیں تھا۔ اور اندر سے ارکاشہ کی وحشت زدہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی کبھی یہ آوازیں کربناک چیخوں میں بھی بدل جاتی تھیں۔

ایگانوس دیوانہ وار اندر داخل ہو گیا اور نیولس بھی اس کے پیچھے ہی اندر چلا گیا۔

اندر کا منظر میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ شراب کے برتن زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ ارکاشہ بے لباس تھی۔ اس کے بدن پر نئی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ اور قوی ہیکل گوریلا درمیان میں کھڑا ہوا تھا۔

"نیوسکی......" ایگانوس کی آواز سنائی دی اور گوریلے کے اندر ایگانوس کی آواز سے ایک نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ وہ پلٹ کر ایگانوس کو دیکھنے لگا اور پھر اس نے مجھے اور نیولس کو دیکھا۔

ایگانوس آگے بڑھ گیا اور اب وہ گوریلے کے مقابل نظر آ رہا تھا۔

"نیوسکی یہ تو ہے۔" ایگانوس نے کہا اور اسی وقت ارکاشہ...... آگے بڑھ آئی۔

"صرف اسے دیکھ رہا ہے ایگانوس مجھے بھی تو دیکھ یہ میں ہوں۔" اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کا بے لباس جسم دیکھ کر ایگانوس کی آنکھیں جھک گئیں۔

"مجھے نہیں معلوم تھا ارکاشہ...... میری بچی مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"نیوسکی...... نیوسکی...... اسے نہیں معلوم تھا، سمجھا تو میرے بچے میرے بیٹے! اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس کی بیٹی کس حال میں ہے آ...... میرے نزدیک آ...... اسے بتا کہ تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ دیکھ میرا بدن تیرے لئے ہے۔ ایگانوس کو اپنی قوت کے مظاہرے دکھا نیوسکی۔"

اس نے گوریلے کو جھنجھوڑ ڈالا لیکن ایگانوس نے ارکاشہ کو پکڑ کر اور گھسیٹ لیا۔ پھر بولا۔

"جنگلی کتے۔ تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ تیری ماں ہے تو نے اس کے پیٹ سے جنم لیا ہے۔ وحشی جانور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا لگایا ہوا پودا اس قدر زہریلا بن جائے گا۔ اور اب مجھے بتا میں تیرے ساتھ کیا سلوک کروں۔"

"گوریلا بول نہیں سکتا تھا لیکن یہ بات سب جانتے تھے کہ وہ انسانوں کی مانند سمجھ دار ہے اور ہر بات پر غور کر سکتا ہے۔

اس کے چہرے پر بے پناہ خوفناک کیفیت طاری تھی۔ تب اس نے خونخوار آوازیں نکالیں اور ایگانوس کو باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے انداز میں بغاوت نظر آ رہی تھی۔

"میں کہتا ہوں فوراً یہاں سے چلا جا اور کسی جنگل میں جا کر پناہ لے اب تیری یہاں گنجائش نہیں ہے چلا جا ورنہ میں...... میں تجھے قتل بھی کرسکتا ہوں۔" ایگانوس نے اپنا خنجر نکال لیا۔ ہم دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ تب گوریلے کے انداز میں وحشت ابھر آئی۔ اس کے حلق سے ہلکی ہلکی غراہٹیں نکلنے لگیں پھر اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور آگے بڑھا۔

یقیناً کوئی خاص واقعہ ہونے والا تھا اور یہ بات میں اور نیولس دونوں ہی جانتے تھے کہ ایگانوس اس گوریلے کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ گوریلا بے پناہ طاقتور تھا اور ایگانوس کسی حادثے کا شکار ہونے والا تھا۔

گوریلا قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔ ایگانوس نے ارکاشہ کو اپنے پیچھے کرلیا۔ لیکن دوسرے لمحے ارکاشہ نے اپنے باپ کو دھکا دیا اور آگے آگئی۔

"نہیں ایگانوس تو اسے قتل نہیں کرسکتا۔ اسے قتل کرنے سے پہلے اس کی وحشت کا مظاہرہ تجھے دیکھنا ہوگا۔ تجھے دیکھنا ہوگا کہ آج تک تیری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے اور تو کس طرح مجرمانہ غفلت برتتا رہا ہے۔"

"ارکاشہ میری وحشت کو آواز نہ دے، مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو کس کیفیت میں ہے۔ ہٹ جا سامنے سے ہٹ جا۔" ایگانوس نے ارکاشہ کو ایک طرف کردیا اور خود چند قدم آگے بڑھ گیا۔

تب اچانک گوریلا اپنی جگہ رک گیا۔ وہ اس انداز میں رکا تھا جیسے اب وہ ایگانوس پر حملہ آور ہونا چاہتا ہو۔ ایگانوس کے انداز میں وہی کیفیت تھی۔ وہ بے حد خون خوار نظر آرہا تھا۔ اس کا لمبا خنجر ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔

"رک کیوں گیا بزدل آگے بڑھ اور مجھ سے مقابلہ کر۔ میں آزمانا چاہتا ہوں کہ میرے بازوؤں میں اب کتنی قوت ہے اور کیا اب میں اس مجرم کو شکست نہیں دے سکتا جس نے کارگس کے قوانین سے بغاوت کی ہے اور جو ہمارے اجداد کے بنائے ہوئے اصول توڑنے کا مرتکب ہوا ہے۔ تو نے جو کچھ کیا ہے اس کے لئے تجھے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ارکاشہ تیری ماں ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" اچانک گوریلے کے منہ سے آواز نکلی اور ایگانوس کا منہ بھی حیرت سے پھیل گیا۔

"میں اس کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں لکمر دس کا بیٹا بھی نہیں ہوں۔ میں کون ہوں اس کے بارے میں اس وقت بتاؤں گا جب تم زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہوگے۔"

اور یہ ایسی اچانک اور ایسی حیرت انگیز بات تھی کہ نہ صرف میں اور نیولس بلکہ ارکاشہ اور ایگانوس بھی ششدر رہ گئے تھے۔ انہوں نے کبھی اس گوریلے کو بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ تب گوریلے نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور ایک ناقابل یقین واقعہ رونما ہوا۔

گوریلے نے اپنے پورے بدن سے پوری کھال اتار دی تھی۔ ایک گوریلے کی کھال اور اس کھال کے نیچے سے جو انسان برآمد ہوا تھا، وہ میرے لئے، ارکاشہ کے لئے اور ایگانوس کے لئے تحیر خیز تھا۔ نیولس اسے نہیں جانتا تھا۔ لیکن ہم اسے جانتے تھے، ذیشان عالی اور کوروتی وہ گوتم بھنسالی تھا۔

"تو...... تو کون ہے؟" ایگانوس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایک کہانی ایک داستان ہے۔ میری صورت تیرے لئے اور تیری بیٹی کے لئے اجنبی نہ ہوگی۔" اس نے جواب دیا۔

"لیزل۔ تو...... یہ تو ہے۔"

"ہاں۔ اور اب تجھے معلوم ہوگیا ہوگا ایگانوس کہ ارکاشہ میری ماں نہیں میری محبوبہ ہے۔"

"لیکن...... لیکن تو تو مرچکا تھا؟"

"ہاں میں مرچکا تھا لیکن میرا علم میرا جادو زندہ تھا۔ میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ میں ایک داستان ہوں ایک انوکھی داستان، اور اب وقت آگیا ہے کہ میں خود کو افشا کردوں کہ اس سے مناسب وقت اور کوئی نہیں ہے۔"

یہ کارگس کی داستان کا سب سے عجیب اور پراسرار موڑ تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ گوریلا لیزل کیسے بن گیا اس نے تو ارکاشہ کے بطن سے جنم لیا تھا اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم

تھا کہ وہ جادوگر کبڑا میری اس وقت کی حیثیت سے بھی واقف تھا یا نہیں، کبڑا لیزل یاد ہے نا۔ وہی جادوگر کبڑا جس نے آرمون سے کہا تھا کہ ارکاشہ۔ اسے دے دے اور حکومت خود لے لے اور پھر اس نے خود کو آرمون کے سامنے ہلاک کرلیا تھا......

گوریلے کی کھال زمین پر پڑی تھی اور خنجر ایگانوس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ سب تصویر حیرت بنے ہوئے تھے۔ ایگانوس گویا سب کچھ بھول گیا تھا۔ بس وہ آنکھیں پھاڑے کبڑے کو دیکھ رہا تھا۔

''ناممکن...... ناقابل یقین۔ مرنے والے اس طرح زندہ نہیں ہوتے۔'' اس کے منہ سے نکلا۔

''ہاں وہ کسی مشن کی خاطر اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کردیتے ہیں۔ کیا انہیں اپنی بقیہ زندگی کے استعمال کا حق نہیں ہے۔''

''لیکن...... لیکن لیزل...... تو...... تو......؟''

''میں نے پوری زندگی میں صرف دو کام کئے ہیں ایگانوس پوشیدہ علوم کا حصول یا ارکاشہ سے عشق۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے صرف ارکاشہ کے عشق میں اپنے سارے علم قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن ارکاشہ میری نہ بن سکی اور اس نے آرمون کو اپنا لیا۔ تب میں نے آرمون سے کہا کہ وہ ساری زندگی خوش نہ رہ سکے گا۔ میں اسے سکون نہ لینے دوں گا اور...... ایگانوس اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کے تین حصے کئے ایک جگہ میرا علم ناکام رہا تو میں نے پوری توجہ اپنے علم پر دی۔ تین حصوں میں پہلا حصہ وہ تھا۔ جب میں غلام ایمبروس کی حیثیت سے ارکاشہ کے سامنے آیا۔ غلام ایمبروس کو میں نے فنا کردیا تھا۔ اور پھر میں نے اپنی اس زندگی کو بھی قربان کیا اور خود کو ارکاشہ کے بطن میں محفوظ کرلیا اور پھر لیزل کو آرمون کے سامنے قتل کرکے میں نے اس زندگی کا خاتمہ کردیا۔ تاکہ تیسری زندگی میں داخل ہوجاؤں جو بظاہر ایک جانور کی زندگی ہو لیکن اس کے اندر لیزل پرورش پارہا ہو۔ میں نے جانور کا روپ اس لئے اختیار کیا تھا، ایگانوس کہ ساری سازشوں سے محفوظ رہوں اور دوسرے میرے لئے سازشیں کرتے رہیں اور اس بار میں لیزل کبڑے کی طرح کمزور نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے رقیب کو شکست دی اور آرمون میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اب ارکاشہ میرے سوا کسی کی نہیں تھی اور میں لیزل کی مانند کمزور نہیں تھا۔ پہلی بار میرے علم نے میری کوئی مدد نہیں کی لیکن دوسری بار وہ میرا بھرپور ساتھی تھا۔'' لیزل کبڑے کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔

اور واقعی انوکھی کہانی تھی یہ۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے ایگانوس بھی اس کہانی کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہو۔ اس کے انداز میں ہیجان نظر آرہا تھا۔

تب تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''تیرے علوم اپنی جگہ لیکن کارگس کے کسی شیطان نے بھی اس عورت کی عزت نہ کی ہے۔ جس کے بطن سے اس نے جنم لیا تو کیا تو نے اس ہستی کو بھی فراموش کردیا جس نے تجھے تشکیل کیا۔''

''اگر ایسا ہوا ہو تو؟'' لیزل نے پوچھا۔

''تب ایکالائی سٹس کے عتاب سے محفوظ نہیں رہے گا اور ایکالائی سٹس قوتیں سلب کرنے والوں میں سے ہے۔ وہ ماؤں کا محافظ ہے اور اس کے عتاب سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ میں اس کی قوتوں کو آواز دوں گا۔''

کبڑے کی شیطانی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔

''ہوتا یوں ہے کہ جب کارگس کے قوانین سے بغاوت ہوتی ہے۔ علمی اور روحانی بغاوت تو وہ آپہنچتا ہے اس جگہ جہاں اسے پکارا جائے لیکن تو نے دیکھا تیری آواز بے اثر ہے اور ایکالائی سٹس کا یہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ آخر کیوں؟'' اس نے کہا۔

''صرف اس لئے کہ تیری کہانی جھوٹ ہے، تیرے علم کی داستان جھوٹی ہے۔'' ایگانوس نے کہا اور کبڑے نے اپنا ایک ہاتھ بند کیا۔ اس کے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے روشنی پھوٹنے لگی اور اس نے اپنا ہاتھ ایگانوس کی سمت کردیا۔

ایگانوس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا تھا اور یوں لگا جیسے فضاؤں کی حرارت فنا ہوگئی ہو۔ سخت ٹھٹھرا دینے والی خنکی

پیدا ہوگئی تھی۔ کبڑے نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔
"میرا علم نہ کمزور ہے نہ جھوٹا...... تو نے دیکھ لیا
محسوس کرلیا...... لیکن تو بے حد چالاک ہے اور کیوں نہ ہو۔
عرصہ دراز تک، کارگس کا حکمران رہا ہے۔ لیکن ایگانوس زیادہ
بہتر تھا کہ تو حسب معمول حکمرانی کرتا رہتا۔ اور میرے
معاملات میں دخل نہ دیتا۔"
"میں نے تیرے دوسرے معاملات میں کبھی دخل
نہیں دیا نیوسکی لیکن ارکاشہ میری بیٹی ہے اور تیری ماں
ہے۔"
"میں کہہ چکا ہوں وہ صرف میری محبوبہ ہے۔ میں
نے غلام ایمر اس کی حیثیت سے اسے حاصل کیا اور اس کا
بطن میری اولاد سے آباد ہوگیا۔"
"لیکن اپنے علم کی مدد سے تو نے اس کے بطن میں
گھر کیا۔"
"ہاں لیکن اس نے جس بچے کو جنم دیا وہ میں نہ تھا۔
ہاں اس وقت میں بھی اس کے نزدیک تھا جب میری
آنکھوں نے اس بچے کو دیکھا۔"
"اور اس کا بچہ؟"
"وہ میری تحویل میں تھا۔"
"تو نے اسے ہلاک کردیا؟"
"نہیں غلام ایمر وس کو ہلاک کرکے میں نے اس
کا بدن حاصل کیا لیکن وہ بچہ میری ہی اولاد تھا۔ اس لئے
میں اسے ہلاک کیوں کرتا۔"
"پھر وہ کہاں ہے؟"
"دیکھنا چاہتے ہو اسے۔ لیکن تم کیا سمجھتے ہو میری
اولاد صاحب علم نہ ہوگی......" اور پھر اس نے ایک ہاتھ بلند
کرتے ہوئے کہا۔
"تماسر! تو کہاں ہے ان کے سامنے اپنا وجود پیش
کر......"
دوسرے ہی لمحے کمرے میں ایک قوی ہیکل سیاہ
فام نظر آیا۔ جس کے آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن اس کی
شکل دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ کیونکہ وہ ایمر وس کی جوانی
تھی۔ سو فیصدی اس کا ہم شکل۔ سب دنگ رہ گئے تھے
یہاں تک کہ ارکاشہ بھی۔ سب متحیرانہ نگاہوں سے اس غلام
کو دیکھ رہے تھے۔ ارکاشہ کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔
"یہ...... یہ میرا بیٹا ہے۔ آہ ذلیل لیزل کبڑے تو
نے میرے بیٹے کی پیدائش کے فوراً بعد اسے مجھ سے جدا
کردیا تھا...... میرا بیٹا......"
لیزل کے چہرے پر بدستور شیطانیت تھی اور اس
کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اس نے نوجوان کی طرف دیکھا
اور بولا۔
"یہ میرا بھی بیٹا ہے اور اس نے میری آغوش میں
پرورش پائی ہے۔ یہ ماں کے وجود سے ناواقف ہے
ارکاشہ۔ اس لئے تمہاری آواز اس کے لئے بے کار ہے۔"
"آہ تو نے...... تو نے میرے ساتھ بہت برا
سلوک کیا ہے لیزل۔"
"اور تو آج بھی میرے ساتھ ناانصافی سے کام
لے رہی ہے ارکاشہ...... میری محبت کو دیکھ میری پائیداری کو
دیکھ میں کب سے تجھے چاہتا ہوں۔ اگر میں جسمانی طور پر
کمزور نہ ہوتا تو اس وقت تیری محبت تیرا وجود حاصل کرلیتا
جب تیرے لئے مقابلے ہوئے تھے۔ لیکن میری محبت کی
آگ سرد نہ پڑی اور پھر تیرے لئے میں نے اپنا وجود فنا
کردیا اور اس فنا کے بعد تو مجھے حاصل ہوئی۔ کس طرح کس
مصیبت سے اور کس کسمپرسی کے عالم میں، میں نے تجھے
پایا۔ ہاں ارکاشہ آج بھی میں تجھے سارے عالم کی
حسیناؤں پر ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن کتنا بدنصیب ہوں میں کہ
آج بھی تیری محبت حاصل نہیں کرسکا۔"
"تو شیطان ہے اور میں ہر عالم میں تجھ سے نفرت
کرتی رہوں گی۔"
"ٹھیک ہے میں نے تجھے محبت کے لئے مجبور
نہیں کیا۔" اس نے کہا اور تماسر کو جانے کا اشارہ کیا۔
نوجوان غائب ہوگیا تھا۔
تب کبڑا ایگانوس کی طرف متوجہ ہوگیا اس کا چہرہ
اب خشک اور بدرونق معلوم ہو رہا تھا۔
"ور اب تیرا کیا خیال ہے ایگانوس، تیری پریشانی
ختم ہوئی کہ نہیں میں نے کارگس کے قوانین کو نہیں ٹھکرایا۔

میں اس کا بیٹا نہیں اس کا عاشق ہوں، اب بھی تجھے کوئی وہم ہے۔"

"لیکن......لیکن تو نے ایگانوس کو دھوکا دیا ہے لیزل!"

"ہرگز نہیں۔ دیکھ لے میں آج بھی حکومت پر محبت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں نے حکومت کی خواہش نہیں کی جو تو نے چاہا کیا۔ میں نے حکومت کے معاملات میں بھی مداخلت نہیں کی۔ بہتر یہی تھا کہ تو حکومت کرتا رہتا۔ تو نے میرے معاملات میں مداخلت کیوں کی؟"

"لیکن لیزل، کیا تو مجھے ہمیشہ دھوکا دیتا رہے گا۔"

"تو بھی تو لاکھوں انسانوں کو دھوکا دیتا رہا ہے۔ جواب دے کیا تو نے میری آڑ میں اپنی حکومت برقرار نہیں رکھی۔ کیا آرمون کو حکومت سے ہٹانے کے لئے تو نے اس بن مانس کا سہارا نہیں لیا جو میری چال تھی۔"

"لیکن۔" ایگانوس کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

"ارکاشہ میری ہے۔ میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا تو چونکہ ایک ایسی بات کے لئے چراغ پا ہو رہا تھا جو یہاں کے قوانین کے خلاف ہے اس لئے میں تجھے معاف کرسکتا ہوں۔ لیکن آئندہ میرے معاملات میں مداخلت نہ کرنا اور تم دونوں۔ تم دونوں ایگانوس کی وفاداری کے زعم میں اپنی زندگیاں خطرے میں نہ ڈالنا۔ میں ہر شے کو فنا کرنے کی قوت رکھتا ہوں۔ تم غلام ہو غلام رہو گے میرے یا ایگانوس کے تمہارا کام صرف غلامی ہے۔ اس لئے تم اپنی زبان بند رکھنا۔"

اور میں نے سکون کی سانس لی۔ گویا اس کا علم محدود تھا۔ مگر بے شمار پراسرار باتوں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ درندہ میری شخصیت اور باغیوں کے بارے میں ضرور معلوم کرلیتا۔ میں نے ایگانوس کی جانب دیکھا۔ ایگانوس اب بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

"جاؤ ایگانوس اور آئندہ میرے اور ارکاشہ کے درمیان مداخلت کی کوشش مت کرنا۔" اس نے آگے بڑھ کر دوبارہ اپنی کھال اوڑھ لی اور اب کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ ایک گوریلا نہیں۔

ایگانوس گردن جھکائے باہر نکل گیا۔ ہم دونوں اس کے ساتھ تھے۔ باہر نکل کر ایگانوس نے کہا۔

"تم لوگ جاؤ، میں دوبارہ تمہیں طلب کروں گا۔"

اور ہم دونوں واپس چل پڑے ہماری ترکیب بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ یعنی ہم نے جو سوچا تھا، معاملہ اس کے برعکس ہوگیا تھا۔ پھر جب ہم اپنی رہائش گاہ پر آگئے تو نیولس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"تم ضرورت سے زیادہ خاموش ہو یولیسیس! کیا بات ہے؟"

"انہی حالات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"ہم ناکام ہوگئے۔"

"ہاں واقعی، وقتی طور پر یہی لگتا ہے لیکن اس انکشاف کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تعجب خیز، انتہائی تعجب خیز!"

"میں لیزل کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا اور یہ کہانی میرے لئے اجنبی ہے لیکن وہ بڑا عالم ہے اور ایگانوس جیسے انسان کو بے وقوف بناتا رہا ہے۔ گویا آج تک قریب سے جاننے والے یہی سمجھتے رہے کہ بن مانس صرف ایک کھلونا ہے جسکے عقب میں ایگانوس کا چہرہ ہے۔ لیکن ایگانوس تو نرالا احمق نکلا اور وہ چالاک۔ کیا تمہیں لیزل کی کہانی معلوم ہے یولیسیس؟"

"ہاں میں جانتا ہوں۔"

"اوہ مجھے اس سے بے حد دلچسپی ہے کیا مختصراً تم مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گے۔"

"لیزل نے جو الفاظ استعمال کئے تمہیں یاد ہیں؟"

"ہاں۔"

"تب کہانی مختصر رہ جاتی ہے، وہ ایک صاحب علم لیکن کمزور آدمی تھا۔ لیکن اس کا علم اسے جسمانی برتری نہیں دے سکا۔ لیکن وہ ایگانوس کی بیٹی ارکاشہ کو چاہتا تھا اور ارکاشہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ پھر ایگانوس نے کارگس کے قانون کے تحت لوگوں کو ارکاشہ اور حکومت کے حصول کے لئے مقابلہ کی دعوت دی اور اس مقابلے میں

ایک چہرہ۔ ہے کا بیٹا آرمون بھی شامل تھا جو ارکاشہ کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ لیزل کبڑا خود تو مقابلہ نہیں کرسکتا تھا لیکن اس نے آرمون کو پیشکش کی کہ وہ چاہے تو لیزل اسکی مدد کرسکتا ہے۔ اور کوئی اسے شکست نہیں دے سکتا۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ آرمون صرف حکومت کرے گا اور ارکاشہ اس کی ہوگی۔ آرمون نے یہ شرط تسلیم نہ کی اور کبڑے کے علم کو بھی شکست دے دی۔ تب کبڑے نے وہ چالیں چلیں جن کا اس نے تذکرہ کیا۔ اور س نے اپنے علم کو مضبوط بنایا۔ اس نے بظاہر آرمون کے سامنے خود کو ختم کرلیا۔ لیکن دوسری شکل میں زندہ ہوگیا۔ یہ اس کا علم تھا۔ ایگانوس جو حکومت چھوڑ کر اس احساس کا شکار ہوگیا تھا کہ اب اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی اس سازش کا شریک رہا۔ لیکن وہ بھی حالات سے لاعلم تھا اور آج تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ رکاشہ کا عجیب الخلقت بیٹا اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے۔"

"آہ بھی عجیب کہانی ہے کتنی پراسرار اور حیرت انگیز، کون کون اس کہانی میں عیاں ہوا ہے۔ لیکن اب کیا ہوگا۔"

"ہماری جدوجہد میں کچھ اور تیزی آجائے گی۔"

"تم پریشان نہیں ہو۔"

"کیوں، پریشانی کی وجہ؟"

"اوہ، تم بھی تو معمولی انسان نہیں ہو۔ لیکن تمہارا اب کیا خیال ہے۔ کیا ایگانوس اس انکشاف کے بعد خاموش ہوجائے گا؟"

"اگر خاموش ہونا چاہے گا تو ہم اسے خاموش نہیں رہنے دیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اس کے بعد احساس کو ہوا دو گے کہ اس کبڑے نے شکست دی ہے۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"ہم اسے ایک ترکیب بتائیں گے۔"

"کیسی ترکیب۔"

"اور میں نیولیسیس کو اپنی تجویز کے بارے میں بتانے لگا۔ نیولیسیس پرخیال انداز میں گردن ہلا رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

"ایگانوس کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوجائے۔"

"یہ تمہاری ذہانت کی بات ہے، ویسے وہ ذہنی طور پر سخت پریشان ہے اور ایسے حالات میں انسان دوسروں کے سہارے تلاش کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، لیکن اس کے بعد؟"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"یہی میں پوچھ رہا ہوں، یعنی بغاوت؟"

"ان دونوں میں سے ایک کو زندہ رہنا چاہئے نیولیسیس۔ دونوں کی زندگی زیادہ خطرناک ہے۔"

"تمہارے خیال میں کون زیادہ خطرناک ہے؟"

"ہر حال میں لیزل، خاص طور پر نئی شکل میں آنے کے بعد!"

"وہ زبردست جادوگر ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ ہم سے لاعلم ہے حالانکہ اگر اس کا علم زیادہ طاقتور ہوتا تو وہ یہ جان جاتا کہ اس کی حکومت کے اصل باغی اس کے نزدیک موجود ہیں۔"

"اوہ۔ ہاں یہ تو درست ہے۔"

"کچھ بھی ہو نیولیسیس ہمیں اپنے مشن کو پورا کرنا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کی حکومت نہیں ہونا چاہئے۔ اور تم میرے ہمنوا ہو۔ ویسے ایگانوس کو زبردست شکست ہوئی ہے۔ اب اس کی سوچ کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ یہ دیکھنا ہے۔"

اور پھر ایگانوس کے دو سپاہی ہمیں بلانے آگئے۔ اس خادم کو بھی طلب کیا گیا جو نیوسکی کی خواب گاہ پر تعینات تھا۔ سپاہی نے خاص طور سے کہا اور پھر ہم دونوں تیار ہوگئے۔

"یہ بھی بہتر ہی ہوا ہے نیولیسیس کہ تم میرے ساتھ ہو۔ اس طرح میں بھی مطمئن رہوں گا۔ لیکن ایگانوس سے جو کچھ بات چیت کرنا ہے اس سے تم مطمئن ہو؟"

"پوری طرح۔ بات یہ ہے نیولیسیس کہ ہمیں وہ جوا کھیلنا ہے۔ ہم نے چاروں طرف پاؤں پھیلا رکھے ہیں اور ہم کسی طور پر محدود نہیں ہیں۔ اگر ہم ایک پہلو سے شکست کھاتے ہیں تو ہمارے پاس دوسرا ذریعہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ سرنگ مکمل ہوجائے تو ہماری طاقت بھی کارگس میں بڑھ سکتی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے کارگس کے دوسرے علاقوں میں نیوسکی کے اتنے حامی اور ہمدرد نہ ہوں گے جتنے کہ اس علاقے میں موجود ہیں۔ گویا اگر ہمیں کسی جگہ سے خدشہ ہوسکتا ہے تو وہ صرف اسی علاقے سے۔ اگر ہم نے یہاں نیوسکی پر قابو پالیا تو باقی معاملات سے باآسانی نمٹا جاسکتا ہے۔"

"یقیناً" نیولیسیس نے جواب دیا۔ پھر وہ پرخیال انداز میں بولا۔

"لیکن نیولیسیس یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔"

"سپاہی ہم سے فاصلے پر تھا۔ اس لئے ہمیں یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ ہماری گفتگو سن لے گا۔"

"کیا سوال پیدا ہوتا ہے نولس؟" میں نے پوچھا۔

"ان دونوں کا مسئلہ تھا۔ تمہارے خیال میں ان میں سے کس کی زندگی زیادہ اہم ہے۔ نیوسکی کی یا ایگانوس کی۔" نیولیسیس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا اور میں اسے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

"آہ...... میرے دوست نیولیسیس تم اس بات سے قطعی ناواقف ہو کہ نیوسکی درحقیقت کیا ہے۔ تم نے اس کی ایک شکل دیکھی اور دوسری شکل بھی دیکھ لی جس میں وہ لیزل کی حیثیت سے سامنے آیا۔ لیزل ایک شیطان ہے۔ اسے شیطان صفت کہنا میرے خیال کے مطابق مناسب نہیں ہے۔ ہاں اگر ہم اسے مکمل شیطان کہیں تو یہ زیادہ مناسب ہے۔

میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ ایگانوس اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے دیکھا اس نے ایگانوس کی زندگی بھر کی کاوشوں کو شکست دی ہے اور کس طرح اس نے اپنے آپ کو ایگانوس کی نگاہوں سے محفوظ رکھا۔ بہت ہی چالاک انسان ہے یہ۔ گو عنایات کی زندگی میں ڈوبا رہا لیکن حکومت مکمل طور پر اس کی رہی۔ یعنی باہر کے لوگ بھی بات جانتے ہیں کہ نیوسکی شہنشاہ ہے اور ایگانوس نے بھی یہی بات مشہور کی نیوسکی کی بادشاہت میں اس کی شخصیت کا کوئی خاص عمل دخل نہیں ہے۔ ادھر ایگانوس اپنے طور پر یہی سمجھتا رہا کہ حکومت وہ خود کررہا ہے اور ذریعہ نیوسکی ہے۔ لیکن نیوسکی کی سوچ زیادہ خطرناک تھی اس نے یہی سوچا کہ ایگانوس حیثیت کیا رکھتا ہے، اسے جب چاہے وہ مٹا سکتا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے نیوسکی ذہنی طور پر بہت زیادہ طاقتور ہے اور بلاشبہ اس کے علوم حیرت انگیز ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں نت نئے تجربات کرسکتا ہے جو میں نے کارگس کے کسی دوسرے شخص میں نہیں پائے۔ اسی لئے میں نے یہ بات کہی کہ لیزل مکمل شیطان ہے۔"

"بالکل درست، تو اس لئے تمہارا خیال یہ ہے نیولیسیس کہ اگر نیوسکی ہمارے راستے سے ہٹ جائے تو زیادہ بہتر ہے۔"

"زیادہ بہتر کیا بلکہ نیوسکی کو ہمارے راستے سے ہٹنا ہی چاہئے اور اب خاص طور سے ان حالات میں جبکہ اس کی شخصیت کھل گئی ہے، ہم اسے نظرانداز نہیں کرسکتے۔"

"بہت خوب گویا تم یہ چاہتے ہو کہ نیوسکی راستے سے ہٹ جائے۔"

"ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔ لیکن تم کیا سمجھتے ہو۔ کیا نیوسکی کا راستے سے ہٹنا اتنا آسان ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں جو کچھ تم نے بتایا ہے اس کے تحت تو یہ اتنا آسان نہیں معلوم ہوتا۔"

"دیکھنا یہ ہے نیولیسیس کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس وقت جب تک میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ نیوسکی صرف ایک طاقتور گوریلا ہے اور ایگانوس اصل ذہن ہے جو اس کی پشت پر کام کررہا ہے میرے ذہن میں کوئی تردد نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں نیوسکی کو شکست دوں گا۔

لیکن جب سے مجھے اس کی اصلیت معلوم ہوئی ہے میرے ذہن میں بہت سے خیالات ہیں۔"

"تم یوں ہو پولیسیس؟" نیولس نے پوچھا۔

"نہیں نیولس۔ لیکن اب معاملہ بدل گیا ہے۔"

"وہ بہت طاقتور ہے۔"

"ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے خاص طور سے اس کے علوم ہمیں دشمن کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

پھر اب تم نے کیا سوچا ہے نیولس۔

"میں بھلا کیا سوچوں میں تو ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔" نیولس نے پریشان لہجے میں کہا۔

"تو پھر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ الجھو نہیں ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے۔ اگر حل نہ ہو تو مشکل بھی نہیں ہوتی۔"

"یہ تو درست ہے۔" نیولس نے کہا۔

"گفتگو کرتے ہوئے ہم دونوں محل کے دروازے میں داخل ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ہم ایگانوس کے سامنے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں عام لوگوں کا گزر نہیں تھا۔ یعنی ایگانوس کی وہ پوشیدہ رہائش گاہ جس کے گرد سخت پہرہ رہتا تھا اور ایگانوس اپنے شیطانی کارنامے وہیں بیٹھ کر انجام دیتا تھا۔ باہر کی دنیا میں وہ صرف ارکاشہ کا باپ یعنی معزول شہنشاہ اور نیوسکی کا نانا تھا۔ لیکن یہاں اس کے لئے اس کے اختیارات لامحدود تھے۔

ایگانوس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار صاف طور سے ہوتا تھا۔ وہ ایک آرام کرسی میں دراز تھا اور اس کے ہاتھ میں شراب کا جام تھا۔ ہم دونوں کو اس نے اپنائیت کی نگاہ سے دیکھا۔

"آؤ بیٹھو۔ تم دونوں اس سے قبل جس حیثیت سے آئے تھے اب اسے بھول جاؤ کیونکہ تم میرے ایک ایسے راز کے شریک ہو گئے ہو جس سے کوئی اور واقف نہیں ہے۔ لیکن کیا تم قابل اعتماد ہو؟" ایگانوس نے گہری نگاہوں سے ہمیں دیکھا

"اس کا فیصلہ ایگانوس کرے۔" نیولس نے جواب دیا۔

"ایگانوس فیصلے کرنے کا اہل ہے کیونکہ اس نے ایک طویل عرصہ تک حکومت کی ہے اور اس کا ذہن آج بھی اس کا ساتھی ہے۔"

"درست کہا شہنشاہ نے۔" نیولس بولا۔

"اور ہر دور میں کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کا پابند رہا ہے۔ میں صرف تم لوگوں کی وفاداری نہیں مانگوں گا بلکہ اس کا صلہ بھی دوں گا۔"

"حقیقت پسند شہنشاہ کی بات دانشمندانہ ہے۔" نیولس نے کہا۔

"سو یہ سوچ لو کہ مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی کچھ نہیں دے گا اور جو تم مانگو گے میں اسے دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"شہنشاہ کی یہ بات کافی ہے۔"

"گویا میرے وفادار بن کر تم کسی اور کے وفادار بننے کی کوشش نہیں کرو گے۔ کیا تم اس بات کا وعدہ کرتے ہو؟"

"شاہ ایگانوس ہماری نیت پر شک نہ کرے اور اس بات کا یقین کرے کہ ہم نے جو کچھ کیا اپنی وفاداری کے تحت ہی کیا اور آئندہ بھی جو کچھ کریں گے اس میں یہ احساس مزید شامل ہوگا کہ شاہ کی نگاہوں میں وقعت پانے کے بعد ہماری حیثیت مختلف ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود ہماری وفاداری مشکوک نہیں ہوگی...... ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہمیشہ شاہ ایگانوس کے وفاداروں میں رہیں گے اس کی اچھائی کے خواہاں رہیں گے۔"

"تمہاری زبان سے سچائی کی جو بو آتی ہے خادم! اس سلسلے میں تم کیا کہتے ہو؟" ایگانوس نے سوال کیا۔

"میں پشت ہا پشت سے ایگانوس کے وفاداروں میں سے ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تب ٹھیک ہے۔ اگر ایسے وفادار مجھے حاصل ہیں تو بہرصورت میں مایوس نہیں ہوں۔ لیزل کڑا کیسے ہی علوم کا ماہر کیوں نہ ہو لیکن میری ذہنی قوتیں اور میرے وفاداروں کا تعاون اسے شکست دے گا۔ اور مجھے اس بات کا بھرپور یقین ہے میں اپنے معتمدوں کے ساتھ تنہا نہیں ہوں اور

کبڑے کو حیرت ہوگی جب وہ یہ محسوس کرے گا کہ خود محل میں میرے بے شمار دوست ہیں۔" شاہ ایگانوس نے کہا۔

"یقیناً یقیناً شاہ کی قوت محدود نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سو میرے دوستو! مجھے تمہارا مشورہ بھی درکار ہے، اور میں یہ مشورہ تم سے لے رہا ہوں۔ تمہاری اس حیثیت سے نہیں جو اس سے قبل تھی بلکہ میں اپنے مخصوص ساتھیوں کی حیثیت سے تمہارا مشورہ چاہتا ہوں۔"

"ہم خلوص دل سے تیار ہیں شاہ ایگانوس۔" نیولس نے جواب دیا۔

"تو کیا کہتے ہو تم اس سلسلے میں جب کہ تمہیں یہ معلوم ہے کہ نیوسکی کے سلسلے میں میں نے دھوکا کھایا ہے، گویا نیوسکی وہ نہیں تھا جو میں نے اسے سمجھا بلکہ وہ کچھ اور نکلا اور اس نے اپنی قوتوں کو محفوظ رکھا لیکن محل کے لوگ جن کے تحت حکومت کے کاروبار چلتے ہیں وہ اس بات سے واقف ہیں کہ زبان نیوسکی کی اور ذہن ایگانوس کا ہے اور زبان بظاہر کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ اس سے قبل وہ لیزل کو اس کی اصل حیثیت سے نہیں جانتے تھے، یہ بات تو ان کے علم میں بھی ہوگی کہ سوچتا ایگانوس ہے اور اگر لیزل بذات خود کوئی حیثیت رکھتا ہے تو اس کا استحصال نہیں کرسکتا۔ گویا ہم لوگوں کی واقفیت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ہم کبڑے کی اصلیت کو چاہیں تو چھپا سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو نیوسکی کے روپ میں چھپے ہوئے لیزل کو ظاہر بھی کرسکتے ہیں۔"

"بے شک" میں نے جواب دیا۔

"تو تمہارے خیال میں اس سلسلہ میں کوئی موزوں ترکیب ہے؟" ایگانوس نے سوال کیا اور میں اس کی ذہنی الجھنوں پر غور کرنے لگا۔ وہ ہمارے بارے میں جانے بوجھے بغیر ہم سے مشورہ لے رہا تھا۔ چنانچہ نیولس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"شاہ ایگانوس کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ بھرے دربار میں ہم لیزل کو بے نقاب کردیں۔"

"اوہ......! اوہ میں جانتا ہوں کہ تم ایک ایسے عہدے پر فائز رہ چکے ہو جس کی ذمے داریاں اہم ہوتی ہیں لیکن اس سے قبل میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تم ذہنی برتری کے حامل ہو اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے عہدے سے معزول کردیا تھا اور ایک دوسرے شخص کو تمہاری جگہ دے دی تھی۔ نیولس گزری باتوں کو ذہن سے نکال دو اور مجھے بتاؤ کہ تم اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کیا بہتر تجویز پیش کرسکتے ہو۔ یعنی اگر میں کبڑے کو بے نقاب کرنا چاہوں تو کس طرح؟" ایگانوس نے سوال کیا۔

"شاہ ایگانوس، لیزل کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ ایک باعلم انسان ہے لیکن کارگس کے قانون کے مطابق نہ تو اس نے آرسون سے جنگ کی ہے۔ جس کی حکومت حاصل کی گئی اور نہ اس نے ایسا کوئی قدم اٹھایا جس سے اس کی اپنی حیثیت مسلم ہوجائے۔ اب اگر ہم دربار عام میں اس کی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہوئے کہیں کہ لیزل نے اپنے علم کے ذریعے اس ہستی کو ختم کردیا جو حکمران تھی اور قورگیلے کے نقاب میں ملفوف ہوکر لیزل نے خود کو حکومت کا وارث ثابت کرنے کی کوشش کی اور حکومت پر قبضہ کر بیٹھا تو کیا اہل دربار اس کی حکومت کو تسلیم کریں گے؟"

"ہرگز نہیں کریں گے اور نہ ہی کارگس کا قانون ہے۔" شاہ ایگانوس نے جواب دیا۔

"ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم اہل دربار کو اس کی حیثیت بتا دیں تو کیا وہ لیزل کی مخالفت نہیں کریں گے؟"

"یقیناً کریں گے۔"

"تو پھر اس سے بہتر ترکیب اور کون سی ہوسکتی ہے کہ بھرے دربار میں کبڑے کو نقاب کردیا جائے اور اس کی معزولی کا مطالبہ کیا جائے۔ شاہ ایگانوس تم اپنی حیثیت میں فوری طور پر حکومت سنبھال سکتے ہو اور یہ اعلان کرسکتے ہو کہ جب تک کسی بہتر حکمران کا انتخاب نہ ہوجائے تم اس حکومت کے نگران ہو اور اپنی اس نگرانی میں نئے حکمران کا انتخاب کراؤ گے.....۔" نیولس نے کہا اور ایگانوس نے فخریہ

نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔
"خوب خوب کہا تم یقین کرو گے نیولس کہ میں نے بھی اپنے ذہن میں یہی فیصلہ کیا تھا۔"
"یقیناً شاہ ایگانوس کی زبان پر شک کیسے ہوسکتا ہے۔" نیولس نے جواب دیا۔
"تو پھر میرے دوستو! میں تمہاری تجویز سے پوری طرح متفق ہوں۔ اور مجھے انتہائی خوشی ہے کہ میں نے جو کچھ سوچا تھا اور لوگ بھی اسی انداز میں سوچ رہے ہیں اور وہ چیز جس کے بارے میں میں کچھ سوچتا یا سمجھتا ہوں اس چیز کو میرے لئے بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میں تمہاری اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے یہی فیصلہ کرتا ہوں کہ پھر سے دربار میں، میں کبڑے کی نقلی شخصیت کا اعلان کردوں گا۔ ہاں اس سلسلے میں اگر کوئی اور تجویز ہو تو وہ بھی بتاؤ۔"
"میں یہ چاہوں گا کہ شاہ ایگانوس کہ تم اس سلسلہ میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرو بلکہ پہلے اپنے کچھ اہل دربار کو اپنا ہمنوا بناؤ اور انہیں اس حقیقت سے آگاہ کہ لیزل کیا ہے اس طرح جب دربار میں تم اس بات کا اعلان کرو گے تو شاہ ایگانوس! اس صورت میں تمہارے ہمدردوں کے لئے وہ اعلان اجنبی نہ ہوگا اور وہ تمہارا ساتھ دینے کے لئے پوری طرح تیار ہوں گے۔" نیولس نے کہا۔
تب میں نے اس گفتگو میں مداخلت کی۔
"میری رائے کچھ اور ہے نیولس۔"
"کیا؟" نیولس نے پوری توجہ سے مجھے دیکھا۔
"یہ اتفاق نہیں ہے کہ تم نے اور شہنشاہ ایگانوس نے ایک ہی بات سوچی اور اس کا اظہار کردیا...... کیا تم اس سے اتفاق سمجھتے ہو؟"
"تمہارے خیال میں یہ کیا ہے؟"
"ایک موثر تدبیر یعنی لیزل کو بے نقاب کرنے کے لئے یہی طریقہ کار سوچا جاسکتا ہے۔"
"تو پھر اس سے مقصد؟"
"گویا اگر کوئی ایسے مرحلے میں داخل ہوجائے تو پھر وہ کیا کرسکتا ہے۔ وہی جو شاہ ایگانوس نے سوچا اور جو تم نے ورنہ تمہاری تجویز کچھ اور ہوتی۔"
"ٹھیک ہے لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی۔"
"کیا لیزل احمق ہے۔ جب دو ذہن ایک ہی انداز میں سوچ سکتے ہیں تو تیسرا ذہن کیوں نہیں سوچ سکتا۔"
"خادم کی بات قابل غور ہے نیولس۔" ایگانوس نے کہا۔
"لیزل خود بھی تو مطمئن نہیں ہوگا اور وہ بھی یہ سوچ سکتا ہے لیکن خادم اس بارے میں تم کیا کہنا چاہتے ہو کیا یہ تجویز مناسب نہیں؟"
"یہ بات نہیں ہے، اس سے عمدہ اور کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی۔"
"مگر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"یہی کہ اہل دربار میں سے پہلے سے کچھ لوگوں کو اس بارے میں بتانا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ یہ انکشاف اچانک کیا جائے۔"
"ہاں غور کیا جاسکتا ہے۔"
"شاہ ایگانوس، کیا اہل دربار صرف اس کے ہمنوا ہوں گے جب کہ میرے خیال میں وہاں تمہارے بارے میں جاننے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔"
"ہاں یہ درست ہے۔"
"پھر انہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ تم جب بھی اور جو بھی قدم اٹھاؤ اس میں زیادہ لوگوں کو شامل نہ کرو اور جس وقت چاہو قدم اٹھالو۔"
"تو مگر دوسرے دربار میں یہ کام کرلیا جائے۔ ویسے خادم کی بات میرے ذہن کو لگتی ہے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔"
"مناسب۔" نیولس نے کہا۔
"دوسرے دربار میں تم موجود ہوگے اس کے علاوہ مجھے کچھ اور لوگوں کی بھی ضرورت رہے گی جو میرے لئے جنگ کریں۔"
"بہتر ان کا بندوبست میں کرلوں گا۔" نیولس نے کہا۔
"تو پھر میں اس بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کروں

۔بس اس معاملے کو طے سمجھو اور خود کو اس کے لئے تیار کر کے دوسرے دربار میں شرکت کرو۔"

"جو حکم۔" نیولس نے کہا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ نیولس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے دلچسپ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگا۔

"کیوں نیولس کیوں ہنسی آرہی ہے۔"

"تمہارے بارے میں سوچ کر۔"

"خیریت؟"

"ایگانوس تمہیں خادم کہہ کر پکارتا ہے اور اسے اس بات پر حیرت ہے کہ اس کے ہاں کے معمولی لوگ اس کی ذہانت کو چھوتے ہیں۔ ابھی تو وہ صرف لیزل اور نیوسکی کی طرف متوجہ ہے۔ لیکن اسے دوسری خصوصیت کا علم ہوگا تو وہ کتنی حیرت کرے گا۔"

"اس نے بھی لوگوں کو دھوکا دیا ہے اسے اس دھوکے کی سزا ملنا بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے بالکل ٹھیک۔ بہرحال دوسرے دربار کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔ کام ہماری مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں۔"

"ہمارا اپنا کردار وہاں کیا ہوگا؟"

"ایک تماشائی کا۔" میں نے جواب دیا۔ اور نیولس چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟" وہ آہستہ سے بولا۔

"ہم حالات کے تماشائی ہیں نیولس، جن لوگوں کو تم ایگانوس کی طرفدار کے لئے لے جاؤ گے وہ تمہارے اپنے آدمی ہونے چاہئیں۔"

"ظاہر ہی ہوں گے۔"

"لیکن تم انہیں جو ہدایات دو گے وہ یوں ہوں گی کہ اگر دربار میں کوئی گڑبڑ ہو تو وہ حالات کا جائزہ لیں اگر ایگانوس کا پلہ بھاری رہے تو وہ ایگانوس کے لئے جنگ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں اور اگر دیکھیں کہ نیوسکی بھاری پڑ رہا ہے تو خاموشی اختیار کر لیں اور حالات کا جائزہ لیں۔"

"اوہ۔" نیولس نے پرخیال انداز میں کہا۔

"یہی بہتر بھی ہے نیولس۔"

"ہاں میں سمجھتا ہوں۔" نیولس نے کہا اور پھر گردن ہلا کر بولا۔

"ٹھیک ہے پولیسیس۔ میں تمہاری ہدایت پر عمل کروں گا۔"

پھر وہ وقت بھی آ گیا۔ جب دربار عام لگا۔ گوریلا نیوسکی تخت شاہی پر فروکش تھا اور اس کا مشیر اور پیشروا ایگانوس اس کی جانب سے مقدمات کی پیروی کر رہا تھا اور اس کی ایما پر فیصلے دے رہا تھا۔

آخری مقدمہ نمٹانے کے بعد ایگانوس نے دربار پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر خود بھی کھڑا ہو گیا۔

"اہل دربار اور معزز لوگو! ایک مقدمہ میں خود بھی پیش کرنا چاہتا ہوں اور اپنی جگہ میں اپنے بزرگ ہیلا لاز کو مقرر کرتا ہوں تاکہ وہ میرے اس مقدمے کی پیروی کرے۔"

"میری نگاہیں نیوسکی پر جمی ہوئی تھیں جس نے چونک کر ایگانوس کی جانب دیکھا تھا۔ ہیلا لاز کھڑا ہو گیا۔

"تیرا مقدمہ کس کے خلاف ہے ایگانوس؟" اس نے پوچھا۔

"نیوسکی کے خلاف۔" ایگانوس نے کہا اور دربار میں بھنبھناہٹ گونج اٹھی۔ نیوسکی گردن ہلانے لگا تھا۔

"کیا کہنا چاہتا ہے تو نیوسکی کے خلاف؟" ہیلا لاز نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ نیوسکی نہیں بلکہ لیزل ہے ایک قدیم جادوگر جس نے اپنے علم کے سہارے یہ انداز اختیار کیا اور حکومت کے اصل حقدار کو اغوا کر کے اس کی جگہ خود قابض ہو گیا۔ اس کھال کے نیچے لیزل پوشیدہ ہے اور ہیلا لاز لیزل کو بھولا نہ ہوگا۔"

نیوسکی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دربار میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔

"کیا یہ حقیقت ہے۔ کیا ایگانوس سچ کہہ رہا ہے۔ جواب دیا جائے۔ نیوسکی کیا کہتا ہے۔"

''تب نیوسکی نے غصیلے انداز میں گردن ہلائی اور فضا میں ہاتھ ہلانے لگا۔ گویا اپنے غصے کا اظہار کررہا ہو۔ اور پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور ایک قوی ہیکل آدمی تخت کے پاس پہنچ گیا۔

''میرا نام الاشا ہے اور میں نیوسکی کا نمائندہ ہوں۔ چونکہ نیوسکی کے پاس قوت گویائی نہیں ہے اور اس کا ترجمان صرف ایگانوس ہے لیکن یہ ایگانوس کی بھول ہے۔ نیوسکی صرف قوت گویائی اور انسانی جسم سے محروم ہے۔ اس کے پاس عقل و دانش کی کمی نہیں ہے۔ اس لئے اس نے مجھے ابھی اپنی اشارتی زبان سے آگاہ کیا تھا۔ اب میں اس کا ہم زبان ہوں۔''

''آؤ تم بھی آجاؤ لیکن آج میں نیوسکی کے وجود میں چھپے ہوئے اس شیطان لیزل کو بے نقاب کردینا چاہتا ہوں۔'' ایگانوس نے کہا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو ایگانوس؟'' الاشا نے پوچھا۔

''یہی کہ جانور کی اس کھال کے نیچے جو لیزل پوشیدہ ہے۔ اس نے ارکاشہ کے بیٹے جسے وہ اب تماسرا کہتا ہے، کو اس وقت اغوا کیا جب وہ پیدا ہوا تھا اور خود ایک انوکھی سازش کے تحت اس بچہ کی شکل اختیار کرلی۔ اور اس کے بعد سے وہ خود ارکاشہ کے لئے بھی ایک عذاب بنا ہوا ہے، اور کارگس کے لوگوں کے لئے بھی میں صرف اس لئے اس کا مشیر کار بنا رہا کہ وہ قوت گویائی سے محروم ہے اور میں کارگس کا محافظ۔ میرے علم میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ دراصل لیزل ہے اور جب مجھے معلوم ہوگیا تو پھر میں بھلا اپنے فرائض کی انجام دہی سے غافل کیوں رہتا۔ چنانچہ آج میں اہل دربار کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ نیوسکی لیزل کا دوسرا روپ ہے اور وہ کسی بھی طور حکومت کے قابل نہیں ہے۔'' ایگانوس نے کہا اور سارے درباری چونک پڑے۔

''لیکن ایگانوس تمہیں اس بات کو ثابت بھی تو کرنا ہوگا کہ وہ نیوسکی نہیں لیزل ہے۔''

''ہاں اس کی کھال کے نیچے لیزل پوشیدہ ہے۔ اس کے بدن سے کھال کو اتار دیا جائے۔'' ایگانوس نے کہا

اور دربار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تب الاشا اٹھا۔ الاشا نیوسکی کے پاس جاکر رک گیا۔ اور نیوسکی سے کچھ سوالات کرنے لگا۔ تب الاشا نے ایگانوس کی جانب دیکھا اور عجیب سے انداز میں بولا۔

''ایگانوس! نیوسکی کہتا ہے کہ وہ کارگس کا حکمران ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ کارگس کے قوانین کے تحت اس سرزمین کا حکمران بنا ہے۔ اس نے یہ حکومت آرمون کو شکست دے کر حاصل کی ہے۔ اور ایگانوس چونکہ ایک معزول شدہ حکمران ہے اس لئے وہ مشیر تو ہوسکتا ہے قادر و حاکم نہیں۔ پھر وہ کس حیثیت سے یہ مقدمہ طے کرتے ہوئے اپنے اس اعتراض کو منظر عام پر لایا ہے۔'' الاشا نے نیوسکی کے ترجمان کی حیثیت سے کہا۔

سابق حکمران ہونے کی حیثیت سے اور چونکہ اس وقت اس حکومت کا حکمران کوئی نہیں ہے اس لئے سابق حکمران ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ میں اس حکومت کا نگران بن جاؤں اور حکومت کسی ایسے شخص کے سپرد کردوں جو اس کا اہل ہو اور غدار نہ ہو۔'' ایگانوس نے جواب دیا۔

''لوگو! تمہارا کیا خیال ہے؟'' ہیلالاز نے ایگانوس کے ترجمان کی حیثیت سے اہل دربار سے پوچھا۔

''ایگانوس کو سب سے پہلے یہ بات ثابت کرنا ہوگی کہ نیوسکی کے روپ میں لیزل ہے۔'' بہت سی آوازیں ابھریں۔

''اور اس کے بعد اگر یہ بات سچ ثابت ہوگئی تب پھر کیا ہوگا؟'' ہیلالاز نے سوال کیا۔

''تب لیزل کو اسی وقت گرفتار کیا جائے گا اور حکومت کارگس کے سابق حکمران ایگانوس کے حوالے کردی جائے گی۔ لیکن صرف ایک نگران حکومت اور پھر ایگانوس نئے حکمران کے لئے انتخابات کرائے گا۔''

''کیا نیوسکی کو اس پر اعتراض ہے؟'' ہیلالاز نے نیوسکی سے سوال کیا اور نیوسکی کا ترجمان الاشا آگے بڑھ آیا۔

''نہیں نیوسکی اس بات کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس

کے ساتھ ساتھ اس کی ایک اور شرط بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" ایگانوس نے پوچھا۔

"اگر ایگانوس یہ بات ثابت نہیں کرسکا تو پھر اسے مداخلت بیجا کے جرم میں گرفتار کیا جائے گا یا پھر اسے یہ مہلت دی جائے گی کہ چونکہ وہ اچانک ہی حکومت کا دعوے دار بن کر ظاہر ہوا ہے اس لئے اسے قانون کے مطابق نیوسکی کے سامنے آنا پڑے گا اور اس کا فیصلہ کرنا نیوسکی کا کام ہوگا کہ اسے زندگی دے یا موت۔

"میں یہ بات نہیں مانتا، کیونکہ نیوسکی سرے سے حکومت کا حقدار ہی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ تو چند ساعت کے بعد ہوجائے گا۔ اگر نیوسکی، نیوسکی نہیں ثابت ہوتا تو پھر ایگانوس کو یہ حق حاصل ہے۔ ورنہ دوسری مشکل میں یہ بات بھی بالکل مناسب ہے کہ نیوسکی اس شخص کو اپنی مرضی کے مطابق سزا دے جس نے اس پر شک کیا اور اپنی آواز شہنشاہ کے سامنے اس سے بلند اور برتر ثابت کرنے کی کوشش کی۔" الاشا نے کہا۔

اس بات پر سب ہی نے اتفاق کیا۔ میں نے خوفزدہ انداز میں نیولس کی جانب دیکھا اور نیولس نے گردن ہلادی۔

"ہم نے اس سلسلہ میں نہیں سوچا تھا یولیسیس۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا نیوسکی یا لیزل اپنی حکمت عملی یا اپنے علم کی قوت سے کام لے کر خود کو وہی نہیں ثابت کردے گا جو وہ عوام کے سامنے ہے۔"

"ہاں ممکن ہے۔"

"کسی صورت میں جو کچھ ہوگا اس کا اندازہ تم کرلو۔"

"سب ٹھیک ہے نیولس۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا تم ایگانوس کے لئے دل میں ہمدردی محسوس کررہے ہو۔ میرا خیال ہے ہم لوگ صرف تماشائی ہیں۔ دو پہلوان آمنے سامنے ہیں۔ کون بھاری پڑے اس کا اندازہ بعد میں ہوجائے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ باقی رہ جانے والے کو تو ہم شکست دے دیں گے۔"

"لیکن ایگانوس کے پاس ایک داؤ محفوظ ہے۔"

"کیا؟"

"اس وقت وہ ارکاشہ کو پیش کرے وہ اس کی مدد کرسکتی ہے۔"

"افسوس، اس بارے میں تو ہم نے سوچا ہی نہیں۔"

"افسوس کی کوئی بات نہیں ہے نیولس بس کھیل دیکھتے رہو۔" میں نے جواب دیا۔ اور نیولس خاموش ہوگیا۔

ایگانوس کافی پرجوش تھا۔ اسے خود پر بے حد اعتماد بھی تھا۔ چنانچہ اس نے اعلان کردیا کہ وہ اس شرط کو تسلیم کرتا ہے اور ہم نے سوچ لیا کہ ایگانوس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی ہے۔

نیوسکی نے خود کو پیش کردیا وہ اس امتحان کے لئے تیار تھا۔ دربار میں بھی میں نے دیکھا کہ ایگانوس کے ہمنوا بہت کم ہیں۔ شرط ایسی آن پڑی تھی کہ ان کی آواز بھی دب گئی تھیں اور اب صرف اس بات کے نتیجے کے منتظر تھے۔

چنانچہ ہیلا باز کے طلب کرنے پر اہل دربار میں سے دو اشخاص آگئے اور پھر اس کے اشارے پر نیوسکی کی کھال اتارنے کی کوشش کی جانے لگی۔ نیوسکی گوریلوں کے سے انداز میں سینہ پیٹ رہا تھا۔ وہ شدید غصے میں نظر آرہا تھا۔ لیکن اس نے تعرض نہیں کیا اور ان لوگوں کو اپنی سی کوشش کرنے دی۔

وہ لوگ بھی شاید ایگانوس کے وفاداروں میں سے تھے جو نیوسکی کو عریاں کردینا چاہتے تھے لیکن وہ کیا کرتے۔ خود لیزل کی بات دوسری تھی لیکن وہ دوسرے اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اور بالآخر لوگوں نے اعتراف کیا کہ نیوسکی ایک گوریلے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ایگانوس کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار صرف نظر آرہے تھے۔

''میں نے..... میں نے خود دیکھا ہے کہ اس نے اپنی کھال اتار دی تھی اور خود کو لیزل کہا تھا بلکہ میرے دو گواہ بھی تھے..... آہ..... میری بیٹی ارکاشہ کو بلاؤ۔ وہ اس بات کی گواہی دے گی۔ آخر وہ اس کی ماں ہے۔''

''تمہارے گواہ کون ہیں ایگانوس؟'' الاشا نے پوچھا۔ اور ایگانوس نے ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

''تم لوگ آگے آؤ۔'' الاشا نے کہا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔

''اب..... اب کیا کریں۔'' نیولس نے آگے بڑھتے ہوئے مضطربانہ انداز میں کہا۔

''انکار کردینا! ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔'' میں نے جواب دیا اور نیولس کے انداز میں تشنج پیدا ہوگیا۔

''کیا ایگانوس درست کہتا ہے کہ تم دونوں اس کے گواہ ہو؟'' الاشا نے پوچھا۔

''کس بات کے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''کیا تمہارے سامنے نوسکی لیزل کی شکل میں نظر آیا تھا؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''کیا کہہ رہے ہو خادم؟'' ایگانوس پاگلوں کے سے انداز میں بولا اور پھر اس نے نیولس کی طرف دیکھا۔

''نیولس تم بھی!''

''شہنشاہ نیوسکی کے خلاف کسی سازش میں ہم حصہ نہیں لے سکتے ایگانوس۔'' نیولس نے جواب دیا اور ایگانوس کے جسم میں لرزش نمایاں ہوگئی۔

''تم گواہی نہیں دوگے کہ نیولس ارکاشہ کو اپنی ماں نہیں سمجھتا اوہ، اوہ تم سب بدل گئے۔''

تب نیوسکی کے خادم نے کہا۔

''ایگانوس تم شہنشاہ نیوسکی کے خلاف سازش کرنے میں ناکام رہے ہو اس کا مظاہرہ پورے دربار میں ہوچکا ہے۔ چنانچہ اب تمہارے بارے میں فیصلہ کرنا ضروری ہے۔''

گوریلا کھڑا ہوگیا۔ تب ایگانوس سخت وحشت کے عالم میں چیخا۔

''میرے وفادار میرے ساتھیو! نیوسکی کو قتل کردو۔ ان تمام لوگوں کو فنا کردو جو غدار ہیں۔ ہاں شہنشاہ میں ہوں۔ سارے احکامات میرے ہوتے ہیں۔''

لیکن دربار پر سکوت ہوگیا۔ ایگانوس کے ہمدرد بھی سمجھ گئے کہ ایگانوس کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ کوئی ٹھوس بات کہنے میں ناکام رہا ہے اور اس وقت اس کا ساتھ دینا موت کے مترادف ہے۔ چنانچہ سب خاموش رہے ایگانوس دیوانوں کی مانند گھوم گھوم کر سب کو دیکھ رہا تھا۔

''کوئی..... کوئی نہیں بولے گا۔ تم میں سے کوئی میرا ساتھی نہیں ہے۔'' وہ چیخ کر بولا۔

اب گوریلا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پورے دربار میں پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''میں میں خود ہی سب ٹھیک کروں گا۔ تم ایگانوس کی قوت کو محدود سمجھتے ہو۔'' اب نیوسکی اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ ایگانوس نے اس پر خنجر کا بھرپور وار کیا تھا۔ لیکن اس جنگجو گوریلے کے بارے میں، میں خود بھی جانتا تھا اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور ایگانوس کی کلائی پکڑلی۔ پھر اس نے ایگانوس کی کلائی کو جھٹکا دیا اور ایگانوس کی دہاڑ گونج اٹھی۔ اس کا پورا بازو لٹک گیا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ چیختا ہوا پلٹ کر بھاگا۔ لیکن گوریلے نے عقب سے اسے دبوچ لیا اور پھر اس نے ایگانوس کو زمین سے اونچا اٹھالیا۔

''دیکھنے والے ساکت و جامد کھڑے تھے اور یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کی جرأت نہ تھی کہ وہ اس مسئلہ میں کچھ بول سکیں۔ خود ایگانوس کے ہمنوا بھی خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اور انہیں سانپ سونگھ گیا تھا۔ کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ گوریلے کو روکنے کی کوشش کرے۔ وہ لوگ جو شاید ایگانوس کے لئے جان دینے کا عہد کرکے آئے ہوں گے، اس وقت اپنی جان بچانے کی فکر میں کوشاں تھے۔

تب ایک بار گوریلے نے ایگانوس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اسے الٹا لٹکا دیا۔

پھر اس کے حلق سے دہاڑیں نکلنے لگیں، ایسی

خوفناک چیخیں جو دل دہلا دینے والی تھیں۔ اہل دربار پر سکتہ طاری تھا۔ ان کے بدن آہستہ آہستہ لرز رہے تھے اور ایگانوس کا بدن دو حصوں میں منقسم ہوتا جارہا تھا۔ تب گوریلے نے اسے زمین پر پھینک دیا۔ ساری زمین ایگانوس کے خون سے رنگین ہورہی تھی۔ میں اور نیولس ساکت و جامد نگاہوں سے گوریلے کی اس حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ بہر صورت ہمارا ایک دشمن ختم ہوگیا تھا اور نیولس تو یہ بات جانتا بھی نہ تھا کہ ایگانوس کی موت میرے لئے کس قدر دلچسپ ہے...... یہ وہی شخص تھا جو میرے خلاف سازش میں شریک تھا۔

اہل دربار خاموش ہی رہے اور چند ساعت کے بعد گوریلے نے گویا دربار برخاست کردیا۔ اب اس کا ہموا اس کا ترجمان الاشا تھا۔ سارے درباری خاموشی سے واپس پلٹ پڑے۔ ان میں، میں اور نیولس بھی تھے۔

نیولس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ اپنی شکل سے خاصا غمگین نظر آرہا تھا۔ گھر تک کا فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ گھر پہنچ کر میں نے نیولس سے یہ سوال کرہی ڈالا۔

''کیا بات ہے، نیولس تم کچھ خاموش اور سنجیدہ سے ہو؟''

''یہ بات نہیں ہے یولیسس بس میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان بعض اوقات کتنا بے حقیقت ہوجاتا ہے۔ ایگانوس نجانے کتنے عرصے سے شاندار زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کا انجام......''

''ہاں نیولس ہر شخص قوت حاصل کرلینے کے بعد یہ سوچ لیتا ہے کہ وہ ناقابل تسخیر ہے اور اب اس کا مقابل اس کا ثانی کوئی بھی نہیں ہے لیکن اس کے بعد اسے ایسے غیر یقینی حالات سے واسطہ پڑتا ہے کہ اس کی تمام سوچ مردہ ہوجاتی ہے۔ ایگانوس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تم نے اس کی کہانی نہ سنی ہوگی۔ اس نے اپنے داماد آرمون کے خلاف جو کچھ کیا وہ کوئی جائز اور مناسب بات نہیں تھی۔ حکومت آرمون نے حاصل کی لیکن ایگانوس نے اسے ختم کرانے کے لئے اپنی بیٹی کے ساتھ تعاون کیا اور آج یہی تعاون اس کی موت بن گیا۔

''ہاں یہ تو درست ہے کوئی بھی شخص احتساب سے مبرا نہیں ہے لیکن مجھے صرف اس بات کے لئے افسوس ہورہا ہے کہ وقت پر ہم نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔''

''تو کیا تم اس کا ساتھ دینا چاہتے ہو؟''

''نہیں یہ بات نہیں ہے بس وعدہ کرنے کے بعد وعدے سے انحراف ذرا افسوس ناک لگا تھا۔''

''صرف تم ہی نہیں تھے دوسرے لوگ بھی تھے۔ آخر وہ بھی تو کسی مقصد کے تحت ہی آئے ہوں گے۔ وہ سب بھی تو ہماری مانند خاموش ہوگئے۔ کیا تمہارے خیال میں ایگانوس تنہا دربار میں پہنچ گیا تھا۔ میرا خیال ہے ایسا ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کے بے شمار آدمی ہوں گے لیکن جب اس کی ساری کوششیں ناکام رہیں تو ان لوگوں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ بالکل ہماری مانند اور ہر سمجھدار آدمی کو ایسا ہی کرنا چاہئے اور اس سلسلے میں ہمارا رویہ بالکل درست تھا۔ ہم جس انداز میں ایگانوس سے منحرف ہوئے تھے۔ وہی ہمارے لئے بہتر تھا ورنہ نتیجہ کیا ہوتا۔ اسی جگہ ہم لوگ بھی ہوتے جہاں ایگانوس پہنچ گیا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں ہم تنہا اہل دربار سے مقابلہ کرسکتے تھے۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔''

''بس تو پھر کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے انتہائی بہتر رویہ اختیار کیا ہے اور اب مجھے یقین ہے کہ ہم پہلے جس انداز میں نیوسکی سے دور تھے اور اس نے ہمارے بارے میں کوئی خاص بات نہیں سوچی تھی اب وہ اسی انداز میں سوچے گا۔''

''ہاں۔ بالکل درست کہا تم نے۔'' نیولس نے جواب دیا۔

''لیکن اب کچھ تبدیلیاں ضرور ہوں گی۔''

''کیسی تبدیلیاں؟'' نیولس نے پوچھا۔

''مقصد یہ کہ اس سے قبل نیوسکی یا لیزل نے

حکومت کے سارے معاملات ایگانوس پر چھوڑے ہوئے تھے لیکن اب وہ خود ان ساری چیزوں کو دیکھے گا اور اس سلسلہ میں کافی ردوبدل کا امکان ہے۔"

"میرے ذہن میں اور کوئی بات نہیں ہے نیولس میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ لیزل کبڑا کچھ ایسے علوم کا ماہر ہے جن کے ذریعے وہ بہت سے کام کرسکتا ہے، اب تک وہ اپنی عیاش فطرت سے کام لے کر صرف عیاشی کے بارے میں سوچتا رہا ہے۔ لیکن اب جبکہ وہ منظر عام پر آچکا ہے ظاہر ہے اب وہ اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے وہ سب کچھ کرے گا جس میں اس کے اپنے لوگوں کا انتخاب بھی شامل ہوگا۔"

"بالکل سچ کہا تم نے پولیسیس۔"

"تو اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی محتاط ہونے کی ضرورت ہے اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔"

"لیکن کیا تمہیں اپنی بغاوت کی کامیابی کے امکانات نظر آتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میرے انداز میں جھنجھلاہٹ سی آگئی۔

"م...... میرا مطلب ہے تم خوفزدہ تو نہیں ہو پولیسیس۔"

"نیولس۔" میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

"میں حکومت کے خلاف جس پیمانے پر مہم چلا چکا ہوں۔ کیا تم نے اس کا جائزہ نہیں لیا۔ کیا ہماری تیاریاں اتنی کمزور ہیں کہ اب تم لیزل کے بارے میں غور کرنے لگو۔"

"نہیں نہیں میرا خیال ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔" نیولس نے شرمندگی سے کہا۔

"میرے دوست! یہ بغاوت کبڑے لیزل کی قوت سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور جس وقت لیزل میرے مقابل ہوگا تو اسے اپنے تمام علوم کے ساتھ موت کی وادیوں میں جانا پڑے گا۔" میرے لہجے میں ایسی غراہٹ تھی کہ نیولس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس نے کہا۔

"مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ میں نے تمہارے جذبات کی توہین کی ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس بات پر یقین رکھو کہ شکست نیوسکی یا لیزل کا مقدر بن چکی ہے۔"

نیولس کے چہرے سے تردد دور ہوگیا۔ ساری باتوں کے باوجود کس قدر معصوم انسان تھا بہر حال ناقابل اعتبار نہیں تھا۔

"ہم لوگ واپس نیولس کے مکان پر پہنچ گئے۔ ایگانوس کی موت کی اطلاع کارگس میں پھیل چکی تھی۔ تونیسا دوڑتی ہوئی ہمارے پاس آئی تھی۔

"کیا یہ حقیقت ہے پولیسیس؟ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں!" نیولس نے جواب دیا۔

"ورکیا میں یہ نہ سمجھوں کہ یہ پولیسیس اور نیولس کی مہم کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے؟" ذہین لڑکی نے کہا اور نیولس تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے تونیسا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں دل کی بات نہیں مانتی لیکن میرا ذہن یہ بات کہتا ہے کہ نیوسکی کی حکومت کا پہلا ستون ہلانے والے تم لوگ ہو۔"

"تمہیں ایگانوس کی موت کی خوشی ہوئی ہے؟"

"ہاں۔ وہ نیوسکی کا تخلیق کار تھا اور بالآخر فنکار کو اس کے فن نے شکست دیا اور یہ منصوبہ شاید کسی بڑے فنکار کی تخلیق ہے۔"

"تمہاری بہن تم سے زیادہ ذہین ہے نیولس۔ میرا خیال ہے، تم ضروری معاملات میں اس سے مشورہ لے لیا کرو۔"

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں نیولس۔" نیولس کے باپ نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔

"کیا بابا؟" نیولس نے پوچھا۔

"تم اس کو میری حماقت تو نہ سمجھو گے؟"

"نہیں بابا۔ آپ ذہین اور زیرک ہیں۔" نیولس نے احترام سے کہا۔

(جاری ہے)

موت کی وادی

محمد رضوان قیوم۔ راولپنڈی

نوجوان ہاسٹل میں اپنے بیڈ پر گھری نیند میں تھا کہ اچانک اس پر جنون سوار ہوا اور وہ اسی کیفیت میں اٹھا اور تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جنگل میں دوڑ پڑا اور پھر جب اس کے حواس بحال ہوئے تو......

زیر نظر کہانی لفاظی نہیں بلکہ حرص و طمع کے متمنی لوگوں کے لئے حقیقت پر مبنی غور طلب سبق ہے

اس پراسرار، مافوق الفطرت کہانی کو مجھے ایک بزرگ ڈاکٹر فہیم گل نے یوں سنایا۔

بقول ڈاکٹر صاحب کے یہ 1941ء کی بات ہے کہ میں ٹیکسلا سے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے بمبئی شہر میں رائل میڈیکل اکیڈمی گیا۔ اس زمانہ میں MBBS کا کورس 5 سال پر مشتمل تھا۔ رائل میڈیکل اکیڈمی میں اسٹوڈنٹس کی رہائش کے لئے ہاسٹل میں بہت سارے کمرے بنائے گئے تھے ہر ایک کمرہ میں 3 اسٹوڈنٹس رہ سکتے تھے ہم تین اسٹوڈنٹس یعنی میرے علاوہ سندر رام اور جلتن سنگھ کو ہاسٹل کا کمرہ نمبر 21/B ملا تھا۔

میں پڑھائی کے معاملہ میں درمیانی دماغی سطح کا تھا۔ جبکہ سندر رام جس کا تعلق کندھا گاؤں (جالندھر) سے تھا۔ وہ کتابی کیڑا یعنی انتہائی پڑھا کو

تھا۔ جبکہ جلتن سنگھ امرتسر کا رہنے والا تھا وہ جس مقصد یعنی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے آیا تھا اسے اس کی کوئی فکر نہ تھی حالانکہ میں نے اور ستقر رام نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ''یار تم میڈیکل کی کتابیں پڑھا کرو۔'' وہ ہماری اس بات سے بعض دفعہ ناراض ہوکر کہتا۔ ''یار تم میرے ذاتی مسئلہ پر اپنی خواہ مخواہ ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ میں ڈاکٹر بنوں یا نہ بنوں یہ میرا مسئلہ ہے۔'' اور پھر ہم نے اس کی ناراضگی کے پیش نظر اسے کچھ سمجھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

جلتن سنگھ کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ وہ امرتسر کے ایک رئیس سکھ خاندان کا اکلوتا بیٹا ہے اور اس کے باپ نے اسے میڈیکل کی تعلیم کے ابتدائی ٹیسٹ میں کوئی بڑی سفارش کروا کر اسے رعایتی پاس کروایا ہے اور اسی بنیاد پر وہ بمبئی میڈیکل اکیڈمی میں آیا تھا۔ جلتن سنگھ اپنے بستر پر رات گئے تک لمبی تان کر سوتا رہتا جبکہ میں ستقر رام کے ساتھ مل کر پڑھائی کرتے رہتے تھے۔

جلتن سنگھ کا معمول تھا کہ وہ اپنی کلاسیں کم لیتا تھا اور اپنا زیادہ تر وقت ہاسٹل کے کمرے میں سونے میں گزارتا تھا اور ہم یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ سوتے ہوئے کچھ بڑبڑاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ وہ کسی سے ہمکلام ہو اور بعض دفعہ وہ اپنے ہونٹ اس طرح چباتا جیسے کہ وہ کچھ کھا رہا ہو اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کے چہرے پر ایک نیا Impression ہوتا تھا۔

ستقر رام نے ایک دن مجھے اشارتاً کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جلتن سنگھ پر کوئی اوپری اثر ہوگیا ہے۔''

''یار یہ اس طرح پوستیوں کی طرح پڑا اپنی تعلیم سے لاپرواہ رہا تو اس کا یہ تعلیمی سال ضائع ہوجائے گا۔ ہمیں اس بے وقوف کے بارے میں کچھ سوچنا اور عملی طور پر کچھ کرنا چاہئے۔'' میں نے ستقر رام کو یہ تجویز دی تو اس نے کہا کہ ''کل صبح ہم اس کے بارے میں اکیڈمی کے وائس ڈین مسٹر کمار یادو سے بات کریں گے۔''

صبح ہم دونوں ڈین مسٹر کمار یادو سے ملے۔ انہوں نے ہماری بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا ''آپ دونوں صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ یہ جلتن سنگھ کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ ڈاکٹر بنے یا نہ بنے وہ اگر ڈاکٹر نہ بھی بنا تو اس کا باپ اس پوزیشن میں ہے کہ وہ اسے اتنا روپیہ پیسہ دے گا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ باآسانی اعلیٰ طرز پر اپنی زندگی گزار سکتا ہے اصل مسئلہ تم غریب خاندان سے تعلق رکھنے والے بچوں کا ہے جن کا سارا دارومدار MBBS کی ڈگری پر ہے۔'' ہم دونوں اس جواب سے مایوس ہوکر واپس آگئے۔

دوپہر کو مجھے ستقر رام نے یہ عجیب بات بتلائی کہ ''جلتن سنگھ کے منہ سے اس طرح بدبو آرہی ہے جیسے کہ کسی گٹر کے اندر سے فضلات کے سڑنے سے آتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس نے کوئی انتہائی گندی چیز کھائی ہے یا اس نے بطور نشہ کوئی انتہائی غلیظ بدبودار مشروب استعمال کرلیا ہے۔''

میں بہانے سے اس کے قریب گیا تو اس کے منہ سے واقعی انتہائی ناقابل برداشت بدبو آرہی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔ ''یار یہ تو نے کون سی ایسی بدبودار چیز کھائی یا پی ہے۔ جس سے پورے کمرے کا ماحول انتہائی بدبودار ہوگیا ہے۔؟''

اس نے میرے اس سوال پر جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اس کا جواب رات کو دوں گا۔''

''ابھی کیوں نہیں۔؟'' ستقر رام نے اپنے منہ سے یہ جملہ نکالا ہی تھا کہ اس نے ایک جھڑکی دیتے ہوئے کہا۔ ''تو نے اگر آئندہ میرے ذاتی معاملے میں مداخلت کی تو یاد رکھ میں تجھے اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے ذریعے اس میڈیکل اکیڈمی سے آؤٹ کروا دوں گا۔''

ستقر رام ڈر گیا۔ اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ شام کو اس نے ڈین سے اس مسئلہ پر شکایت کرکے ستقر رام کا روم تبدیل کروا دیا۔ اور ستقر رام کی جگہ کمرے میں کوئی نیا لڑکا نہیں آیا۔

دراصل ان دنوں میڈیکل اکیڈمی میں فرسٹ ٹرم کے امتحانات شروع تھے۔ انتظامیہ اپنی جگہ مصروف

تھی تو اسٹوڈنٹس کو اس ٹرم میں کامیابی کی فکر تھی۔ اب میں اپنے کمرہ میں جلتن سنگھ کے ساتھ اکیلا تھا میں دلی طور پر خوف زدہ تھا۔ میں نے بھی دلی طور پر تہیہ کرلیا تھا کہ میں ٹرم کے امتحانات کے بعد اس کمرے سے چھٹکارا حاصل کرلوں گا۔

ایک رات گئے میں اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا کہ جلتن سنگھ نے انتہائی گہری نیند میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے چھوڑ دو میں نے جانا ہے۔ میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا رک تو سہی میری بات تو سن۔"

میں نے اپنی کتاب جلدی سے چھوڑی اور اس کی جانب لپکا میں نے اس کے پسینہ بھرے چہرے کو اچھی طرح تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا جلتن سنگھ گھبراؤ نہیں تم خواب دیکھ رہے ہو۔ آنکھیں کھولو۔ میں تمہارے قریب ہوں فہیم گل۔"

اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور یکدم مجھ سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ اس کے منہ سے کسی تازہ سیب کی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے اسے کسی معصوم بچے کی طرح چمکار کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یار ایزی ہو جاؤ لگتا ہے تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے، جس کی وجہ سے تم ڈر گئے ہو۔" مجھ سے پانی مانگا میں نے اسے پانی دیا۔ اس کے بعد وہ بڑے اطمینان سے میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "اس سے پہلے کہ تو مجھ سے مزید کچھ سوال کرے اور میں تجھے اس کا جواب دوں تو فی الحال میرا پہلے ایک کام کر۔"

"میں نے اس سے پوچھا کیسا کام۔؟"

اس نے کہا۔ "تو کسی طرح یا کسی طریقہ سے سندرام کو میرے پاس بلا کر لا۔"

"نہیں یار اس وقت رات کے تقریباً ڈیڑھ بج رہے ہیں اس وقت شاید وہ سو رہا ہو۔ کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ وہ صبح جلدی اٹھ کر پڑھتا ہے۔"

"نہیں تو ابھی جا۔" وہ بولا۔

"نہیں! میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس کے پاس اس وقت جانا مناسب نہیں ہے۔ ابھی چند گھنٹے صبر کرلے میں اسے بلا لاؤں گا اور دوسری بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ تجھ سے وہ ملنے نہ آئے۔ کیونکہ وہ تجھ سے بہت ڈرا ہوا ہے۔"

میں اسے اپنے تئیں منع کرتا رہا۔ لیکن وہ اس بات پر بضد رہا کہ میں اس کے نئے کمرے سے اسے بلا کر لاؤں۔

بہر حال اس کے پرزور اصرار پر میں بڑی ہمت کرکے سندرام کے نئے کمرے میں گیا میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو خوش قسمتی سے اس کا ایک ساتھی ابھی تک اسٹڈی کررہا تھا۔ اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "کیا بات ہے۔؟"

میں نے اس سے جھوٹ بولا۔ "یار وہ دراصل اس سے پیٹ درد کی ایک پھکی لینی ہے۔"

"اچھا میں اسے اٹھاتا ہوں۔" اس کے ساتھی نے سندرام کو اٹھا کر کہا۔ "فہیم گل کو پیٹ درد کی پھکی چاہئے۔" اور وہ اٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور اسے جلتن سنگھ کا پیغام پہنچایا۔ سندرام میرے خلاف توقع ڈرنے کی بجائے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "یار وہ جو بھی کچھ ہے وہ ہے تو ہمارا ہاسٹل کا روم میٹ ساتھی اور کلاس فیلو۔ چلو میرے ساتھ میں اس کی بات سنتا ہوں۔"

ہم دونوں جب جلتن کے پاس پہنچے تو جلتن سنگھ نے باقاعدہ پیر پکڑ کر سندرام سے معافی مانگی اور کہا۔ "وہ دراصل میں تم دونوں کو کیسے کھل کر بتلاؤں کہ میں آج کل کس بڑی مصیبت کا شکار ہوں۔"

"کیسی مصیبت۔؟" سندرام نے اس سے بڑے ملائم انداز میں پوچھا۔

اس نے اپنی کہانی شروع کرتے ہوئے بتلایا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں امرتسر کے ایک انگریزی اسکول کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔

وہاں ایک دن میری ملاقات ایک بنگالی اسٹوڈنٹ رام پال سے ہوئی اس نے مجھے بتلایا کہ ''اس کے قبضہ میں ایک ایسا جن دوست ہے جو اس کی دلی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔'' اس کے بعد ایک روز میں نے رام پال سے کہا۔ ''یار مجھے بھی کبھی اپنے دوست سے ملواؤ۔''

اس نے کہا۔ ''تو میرے ساتھ جی ٹی روڈ سے ملحقہ جنگل میں چل وہاں تجھے میں اپنے دوست سے ملواؤں گا۔'' اور میں اس کے ساتھ جنگل میں پہنچا تو وہاں اس نے مجھے ایک ایسے شخص سے ملایا جس کا قد عام آدمی سے بہت طویل تھا اور وہ عام آدمیوں کی طرح باتیں کرتے کرتے کوے کی طرح کائیں کائیں کرنے لگتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ آپ کبھی کائیں کائیں کی آوازیں کیوں نکالتے ہیں۔''

اس نے ہنستے ہوئے رام پال سے کہا۔ ''اپنے دوست کو بتلاؤ کہ میری حقیقت کیا ہے۔''

''ارے جلتن سنگھ میں تمہیں یہ بتلانا بھول گیا ہوں کہ ان کا تعلق غیر مرد انسانی مخلوق سے ہے اور ان کی نسل کا تعلق نصف حیوانی اور نصف انسانی ہے۔ حیوانی سے مرد اکوے کی مشابہت۔''

پھر رام پال نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں اگر میری غیر موجودگی میں اس سے آکر ملنا ہو تو تم اسے اپنے دل میں یاد کرو۔ تمہیں اس کی آہستہ آہستہ پہلے ہلکی بدبو محسوس ہوگی اور پھر تھوڑی دیر بعد یہ ایک کوے کی صورت میں تبدیل ہو کر تمہارے سامنے آئے گا۔ اور پھر تم اس کے ساتھ کچھ دور جانا اور جب تم انسانی دنیا سے کسی ویرانے میں آ جاؤ گے تو یہ کوا پھر اپنی اصل شکل یعنی انسانی روپ میں سامنے آ جائے گا۔''

بقول جلتن سنگھ میں نے اس سے دوستی کر لی۔

رام پال کچھ عرصہ تو ہمارے ساتھ رہا لیکن بعد میں وہ میٹرک کی تعلیم کو درمیان میں چھوڑ کر اپنے علاقہ بنگال میں چلا گیا۔ اس غیر انسانی مخلوق (جن) نے مجھے خوب عیاشی کروائی مثلاً اس نے مجھے خوب کھلایا، پلایا، عیاشی کروائی وہ مجھے کہتا تھا کہ اسے مجھ سے بہت لگاؤ ہو گیا ہے۔ اس جن نے مزید کہا۔ ''تو بے شک اسکول میں پڑھا نہ کر میں تجھے اپنی طاقت سے پاس کراؤں گا۔'' اور اس نے ایسا ہی کیا۔

نیز اس نے بتلایا کہ اس کے باپ کا نام کشل سنگھ ہے۔ اس کے باپ کی توجہ اس کی تعلیم کی طرف تو ہے، لیکن اسے اتنی توفیق نہیں ہے کہ وہ اس کے دیگر معاملات پر دھیان دے۔

جلتن سنگھ نے روتے ہوئے ہم دونوں سے بولا۔ ''یار میں اپنے اس جن دوست سے اب جان چھڑانا چاہتا ہوں وہ اب مجھے بہت تنگ کرنے لگا ہے۔''

سفر رام نے اس سے پوچھا۔ ''وہ تمہیں اب کس طرح سے تنگ کرتا ہے۔؟''

''میرا وہ جن دوست مجھے نہ صرف الٹی سیدھی کراہیت والی چیزیں کھلانے پر مجبور کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ مجھے ایسی ایسی جگہوں پر لے جاتا ہے جہاں جانے سے مجھے نفرت ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تو اب اس مخلوق سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''ہاں میں واقعی اس جن کو دوست بنا کر پچھتا رہا ہوں۔'' جلتن سنگھ افسردہ لہجے میں بولا۔

پھر وہ بولا۔ ''اگر تم دونوں کو مجھ سے رتی برابر بھی ہمدردی ہے تو گرو کے واسطے میری اس سلسلہ میں مدد کرو۔''

''اچھا تو پریشان نہ ہو۔ ہم تیرے لئے کچھ اوپائے کرتے ہیں۔'' سفر رام نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں پھر اپنی پڑھائی میں مگن ہو گیا۔ لیکن اس نے ساری رات جاگتے اور سہمے ہوئے انداز میں گزاری۔ فجر کی نماز سے کچھ دیر پہلے اس نے عجیب وغریب آوازیں نکالنی شروع کر دی تھی۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے مجھے بری طرح دبوچ کر دبانا شروع کر دیا۔ ''فہیم مجھے اس جن سے بچالے۔''

میں اس سے اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ہاں میں تیرے لئے کچھ کرتا ہوں تو مجھے چھوڑ تو سہی۔'' میں نے بڑی مشکل سے اپنا پورا زور لگا کر اس کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑایا۔ وہ میرے پیچھے مجھے پکڑنے کے لئے بڑی تیزی سے میری جانب بڑھا لیکن میں نے بڑی چابکدستی سے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

میں گھبرا کر سید حاذین صاحب کے کمرے میں گیا تو انہوں نے پریشان ہو کر مجھ سے پوچھا۔ ''کیا مسئلہ ہے۔؟'' میں نے ان کو جلتن سنگھ کی پراسرار صورتحال بتائی تو انہوں نے کہا۔

''بیٹا تم اپنے ٹرم ٹیسٹ کی تیاری کرو اور میں سردست اس ناگفتہ صورتحال کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اور انہوں نے فوری طور پر ہاسٹل کے دو مضبوط چوکیداروں کو بلا کر کہا کہ ''متعلقہ ہاسٹل میں جا کر جلتن سنگھ کو قابو کر کے ہاسٹل کے اوپری منزل کے گودام میں بند کردو۔''

پرنسپل کے حکم کے مطابق ہاسٹل کے دونوں چوکیداروں نے جلتن سنگھ کو بڑی مشکل سے قابو کرنے کے بعد رسیوں سے جکڑ کر ہاسٹل کے گودام میں بند کردیا۔

پرنسپل نے مجھے کہا۔ ''تم آج ہونے والے انتہائی ضروری ٹرم کا پیپر دو۔ دوپہر کو اس پاگل کے مسئلہ پر غور کریں گے۔''

ہم اسٹوڈنٹس کمرہ امتحان میں پیپر دے رہے تھے کہ اسی دوران باہر سے آوازیں آنا شروع ہوگئیں کہ ''پاگل جلتن سنگھ بابا نذیر کو زخمی کر کے کہیں بھاگ گیا ہے اسے پکڑو۔'' میں نے اپنا پرچہ ادھورا چھوڑا اور کمرہ امتحان سے اسے دیکھنے کے لئے باہر نکلا تو مجھے نگران امتحان پروفیسر دھمن نے کہا۔

''بے وقوف لڑکے تمہیں معلوم نہیں کہ تم ایک پاگل کی خاطر اپنے انتہائی ضروری امتحان کو ادھورا چھوڑ رہے ہو۔'' اس نے انتہائی سختی سے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اپنا پرچہ دو۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں سر! میں اب اپنا مزید پرچہ حل نہیں کروں گا۔ مجھے جلتن سنگھ کے بارے میں ڈر ہے کہ وہ اپنے آپ کو کہیں غلط جگہ جا کر نقصان نہ پہنچالے۔''

پروفیسر دھمن نے مجھے غصے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں ایک بار پھر حکم دیتا ہوں کہ تم اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اپنا پرچہ حل کرو۔''

میں نے پروفیسر کی سیکنڈ وارننگ بھی نہ سنی۔ اور فوری طور پر جلتن سنگھ کو پکڑنے کے لئے بھاگا۔ راستے میں مجھے ایک چوکیدار نے پکڑتے ہوئے کہا۔'' وہ بہت دور جا چکا ہے۔''

اسی دوران اکیڈمی کا ایک سینئر پروفیسر جو ہمیں میڈیسن کا مضمون پڑھاتا تھا آ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھے تین چار تھپڑ مارے اور انتہائی بارعب آواز میں بولا۔

''تم فوری طور پر اپنا پرچہ حل کرو۔'' بہرحال میں نے اس کی بات سنی اور دوبارہ کمرہ امتحان میں جا کر اپنا پرچہ حل کرنے لگا۔ لیکن میرا دھیان جلتن سنگھ کی جانب لگا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد جب پرچہ ختم ہوا تو پرنسپل نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس پاگل کی خاطر اپنا پرچہ کیوں چھوڑا اور پروفیسر دھمن سے بدتمیزی کیوں کی۔؟''

انکوائری کا حکم صادر فرمادیا۔ اب جلتن سنگھ نہ جانے کہاں بھاگ چکا تھا۔ پرنسپل نے فوری طور پر اکیڈمی کے اسٹوڈنٹس کو اسے ڈھونڈنے کے لئے ادھر ادھر دوڑایا لیکن وہ تلاش بسیار کے بعد ناکام واپس آ گئے۔

پرنسپل نے مجھے اپنے آفس میں بلا کر مجھ سے کئی سوالات کئے۔ میں نے صاف صاف اس کی پراسرار حرکات کے بارے میں بتلا دیا جو وہ کرتا تھا۔

دن کے چار بجے پرنسپل نے متعلقہ پولیس اسٹیشن میں اس کے فرار کی اطلاع دے دی۔

پرنسپل کے کمرے میں تھوڑی دیر کے بعد متعلقہ علاقے کا تھانیدار اور چند پولیس اہلکار آگئے۔ تھانیدار سوتم لعل نے پرنسپل کو مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر اس واقعہ کی اطلاع اس کے والد کو امرتسر پہنچائیں۔

پرنسپل دراصل جلتن سنگھ کے والد کو اس کے بھاگنے کی اطلاع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا والد اپنے علاقے کا ایک نامی گرامی بدمعاش قسم کا سیاست دان تھا۔ پرنسپل کی ہر ممکن یہ کوشش تھی کہ اس کے والد خود کسی نہ کسی طریقہ سے جلتن سنگھ کو تلاش کریں۔

خیر پرنسپل نے شام چھ بجے جلتن سنگھ کے والد کو امرتسر اس واقعہ کے بارے میں تار بھیج دیا۔

اس دوران جلتن سنگھ کی تلاش کا سلسلہ دوسرے روز شام تک جاری رہا۔ جلتن سنگھ کے والد کشل سنگھ نے آتے ہی پرنسپل پر برستے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم مجھے ہر حال میں میرا بیٹا جلتن چاہئے۔ میرا بیٹا تمہارے ہاسٹل سے تمہارے مقررہ کردہ چوکیداروں کی کسٹڈی سے بھاگا ہے لہٰذا تم ہی اس کی گمشدگی کے ذمہ دار ہو۔''

پرنسپل نے پورا یقین دلانے کی کوشش کی کہ واقعات وشواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جلتن سنگھ کسی جادوئی عمل کے منفی ردعمل کا شکار ہو کر متاثر ہوا ہے۔

کشل سنگھ نے انتہائی غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ کر پرنسپل کو آنکھیں دکھانے لگا۔ ''مجھے یہ کہانی نہ سناؤ کہ میرا بیٹا کسی جادوئی عمل کا شکار ہوا ہے، بلکہ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جلتن سنگھ تمہارے ہاسٹل اور چوکیداروں کے پہرے میں سے بھاگا ہے اور مجھے تو شک ہے کہ تم لوگوں نے اس پر کوئی تشدد کیا ہوگا۔''

''نہیں کشل صاحب آپ ایسا غلط سوچ رہے ہیں۔'' پرنسپل نے کہا۔

''اوئے اپنی باتیں بند کرو اور میرے بیٹے کو حاضر کرو ورنہ یاد رکھو میں تم سمیت تمہاری اس اکیڈمی کو جلا کر بھسم کردوں گا۔''

''کشل صاحب ایسی سخت بات نہ کریں۔ یہ پرنسپل کی اپنی اکیڈمی نہیں ہے، یہ سرکاری ادارہ ہے۔'' تھانیدار نے یہ جملہ کہا تو کشل سنگھ کے ساتھ آیا ایک بدمعاش اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھا تو کشل سنگھ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

''کلی سنگھ تو ابھی رک جا۔ دیکھ میں ان کے ساتھ ابھی کرتا کیا ہوں۔''

ادھر آ اوئے تیغ سنگھ (اس کے ساتھ آئے ایک بدمعاش کا نام)

''جی سردار جی۔''

''اوئے تو ذرا کلیام سنگھ منقا کے پاس جا اور اسے میرا پیغام دے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ میڈیکل اکیڈمی پہنچے۔''

کلیام سنگھ منقا دراصل اس زمانہ میں ایک خطرناک ڈاکو گروپ کا سربراہ تھا جس سے اس زمانہ کی پولیس بھی ڈرتی تھی۔

تھانیدار سوتم لعل نے جب کلیام سنگھ منقا کا نام سنا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے اثرات نمایاں ہوئے۔ اس نے اس بار بڑی عاجزی سے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کشل سنگھ کو مخاطب کیا۔

''سردار جی۔ آپ منتقاجی کی حد تک نہ جائیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو حالات میں بہتری آجائے گی۔''

''اچھا، اچھا اب یہ بتلا۔ اب کیا کرنا ہے۔'' کشل سنگھ نے اپنے غصے کو شانت کرتے ہوئے کہا۔

پرنسپل نے کشل سنگھ کا ذہن تبدیل کرنے کی خاطر جلتن سنگھ کے فرار ہونے کا سارا مدعا میرے اور سنگرام پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''دراصل جلتن سنگھ ان دونوں کا روم میٹ تھا۔'' اب اس کی توجہ ہماری طرف ہوگئی۔

''ادھر آؤ بیٹے۔'' کشل سنگھ نے مجھے نرم لہجے میں متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ میں ڈرتے ڈرتے اس کے

پاس گیا اور میں نے جب اس کے غصے سے بھری سرخ شکل دیکھی تو مجھے اسے دیکھ کر مزید خوف آیا۔

"ہاں بیٹا بتاؤ۔ جلتن سنگھ نے تمہیں کیا کیا بتایا تھا اور وہ کیا کیا حرکات کرتا تھا۔؟"

میں نے آہستگی اور سہمے ہوئے انداز میں بتایا جتنا کہ میں نے اس سے سنا اور دیکھا تھا۔

کشل سنگھ نے پرنسپل سے پوچھا۔ "تم نے بھاگتے ہوئے جلتن سنگھ کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔؟"

پرنسپل نے جواب دیا۔ "سردار صاحب اس وقت اکیڈمی میں اسٹوڈنٹس کے فرسٹ ٹرم کے امتحان ہو رہے تھے۔ اسے روکنا میرے بس میں نہ تھا۔"

پرنسپل کی بات کاٹتے ہوئے ایک چوکیدار درمیان میں بولا۔

"کشل صاحب! جلتن سنگھ کو پکڑنے کے لئے فہیم گل نے ہمت کی تھی لیکن اسے پکڑنے کے لئے پروفیسر دھمن نے روکا تھا۔"

"کدھر ہے پروفیسر دھمن میں ذرا اس کے دانت کھٹے کروں۔" کشل سنگھ نے انتہائی غصے میں اپنی مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے کہا۔

"جی وہ اسٹوڈنٹس کے حل شدہ پرچے ایجوکیشن ہیڈ آفس لے کر گئے ہیں۔"

وہاں موجود ایک بدمعاش نے انتہائی بدتمیزی سے کہا۔

"اوئے مجھے ذرا یہ بتلا کہ کسی انسانی جان کو بچانا زیادہ ضروری تھا یا اسٹوڈنٹس کے پرچے۔"

"جی...... دونوں۔" پرنسپل نے کہا۔

"اچھا مسئلہ کو میں بعد میں اپنے طریقہ سے حل کروں گا فی الحال مجھے اپنے پتر جلتن سنگھ کی فکر ہے۔"

کشل سنگھ کے ساتھ آئے ہوئے ایک بدمعاش نے وہاں موجود لوگوں کی توجہ میرے بیان کی روشنی میں اس نقطہ کی طرف دلوائی کہ جلتن سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا کوئے کی آواز نکالنے والا جن دوست اسے اکثر جنگلات کی جانب لے جاتا تھا۔ لہٰذا اس نے مشورہ دیا کہ یہاں سے ہٹ کر آگے جا کر جہاں جنگلات شروع ہوتے ہیں اسے وہاں تلاش کرنا چاہئے۔"

اس بدمعاش کے مشورہ کے پیش نظر پرنسپل کے کمرے میں موجود اسٹوڈنٹس، پولیس اور بعد میں آئے ہوئے کلیام سنگھ کے ساتھیوں کی دس ٹیمیں بنائی گئیں۔ ہر ٹیم میں دس افراد شامل تھے۔

کشل سنگھ نے اپنے ساتھ مجھے رکھا۔ اب یہاں مسئلہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں بمبئی کی حدود ستر ستر میل کے درمیان تھی اور وہاں کچھ شہری علاقہ اور کچھ جنگلات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ مجموعی طور پر ان جنگلات کا رقبہ پچپن میل پر محیط تھا ان جنگلات میں جلتن سنگھ کو تلاش کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ خیر باہمی مشورے سے یہ طے ہوا کہ اسے سات ٹیمیں جنگلات میں اور تین شہری علاقہ میں تلاش کریں گی۔

تھانیدار، دو سپاہی مجھے اور ستر رام کو کشل سنگھ نے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ دراصل ستر رام اور مجھ سے بار بار جلتن سنگھ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے۔

پہلے روز رات کے وقت تمام ٹیمیں ناکام واپس آ گئیں کیونکہ جلتن سنگھ نہ ملا۔ اب یہ فیصلہ ہوا کہ اگلے روز مزید ٹیم کو تشکیل دے کر بمبئی شہر کی حدود کے باہر جلتن کو تلاش کیا جائے گا۔

اسی دوران کشل سنگھ نے آرمی ڈاگ سینٹر کے اسپیشل سونگھنے والے کتے منگوا لئے تھے ان کتوں کو جلتن سنگھ کی چپلیں، کپڑوں کو سونگھوایا گیا۔ ان کتوں کے ساتھ ملٹری کا ایک صوبیدار بھی آیا تھا۔

دوسرے روز ایک ٹیم جس کا نمبر 9 تھا۔ وہ بمبئی شہر کی مخصوص حدود سے کچھ میل دور ڈونڈا کے جنگلات میں گئی۔

کتوں کے نگران صوبیدار نے سونگھنے والے اسپیشل کتوں کی رسیوں کو کھول دیا تو وہ بڑی تیزی سے

جنگلات کے اندر گھس گئے۔

دراصل ڈونڈا کے جنگلات اس زمانہ میں کچھ میل کے احاطے پر خودرو، دیوہیکل جھاڑیوں، کیکر کے طویل درختوں پر پھیلا ہوا تھا اور اس کے اندر خونخوار جنگلی جانور اور زہریلے سانپ وغیرہ موجود تھے۔

سونگھنے والے کتوں کو ڈونڈا جنگل کے اندر گھسے ہوئے دو گھنٹے ہوگئے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے صوبیدار نے ساری ٹیم کو تنبیہ کی تھی کہ وہ اس جنگل میں پیدل آگے نہ بڑھیں، اس نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ ''میرے کتے بے شک رات کو جنگل سے لوٹیں گے لیکن مجھے پوری امید ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ مثبت پیش رفت کے ساتھ باہر آئیں گے۔''

ادھر کٹھل سنگھ نے غصے کے عالم میں اس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔ ''دفع کر اپنے کتوں کو ہمیں جنگل کے اندر آگے بڑھنے دے۔'' صوبیدار نے جھٹکا دے کر کٹھل سنگھ کے ہاتھوں سے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''سردار جی ہوش کریں آگے جنگل نہیں بلکہ موت کی وادی ہے۔ میں ایسا نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس ٹیم کے کسی رکن کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ جنگل کے اندر مزید پیش قدمی کرے۔

''تو صرف بکواس کر رہا ہے میرے ساتھ۔''

''چل اوئے منجو۔ لکھو اپنے بندوں کو لے کر جنگل کے اندر چل۔'' کٹھل سنگھ نے کہا۔

''یہ آپ اپنے اور اپنے بندوں کو موت کے منہ میں لے کر جا رہے ہیں۔ بھگوان کے واسطے آپ کچھ وقت یہاں انتظار کرلیں میرے کتے کچھ نہ کچھ مثبت پیش رفت کے ساتھ آرہے ہوں گے۔'' صوبیدار بولا۔

مجھے تو تو خود کتا لگتا ہے۔ وہاں موجود منقا سنگھ کے بدمعاشوں نے صوبیدار کی ایک نہ سنی وہ اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے، سوٹے اور تلواریں پکڑ کر جنگل کی حدود کے اندر گھس گئے۔

''میں اب بھی آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ کٹھل صاحب رک جائیں۔'' صوبیدار نے کہا مگر ان لوگوں نے اس کی بات نہ سنی۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ کٹھل سنگھ نے زبردستی مجھے اور سنگر رام اور تھانیدار سوتم لعل کو اپنے ساتھ رکھا تھا اندر جنگل میں حالیہ برسات کی وجہ سے شدید کیچڑ اور دلدل پھیلا ہوا تھا ہم لوگ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔

''سردار جی کدھر سے آگے بڑھیں یہاں تو ہر طرف دلدل ہی دلدل پھیلی ہوئی ہے۔''

''مجھے نہیں پتہ..... کہاں سے تم نے آگے بڑھنا ہے بس ایسے تیسے آگے بڑھتے رہو۔'' کٹھل سنگھ نے کہا۔

''سردار جی جیسا آپ کا حکم۔'' ہم لوگ بڑی احتیاط سے، آگے چل رہے تھے کہ اچانک ہمارے پیچھے سے ایک زوردار چیخ کی آواز آئی۔

''اوہ میں مر گیا۔''

''پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔ دیکھو گے تو مرو گے۔''

''اوہو.....! سوتم لعل صاحب دلدل میں دھنس رہے ہیں۔''

''کٹھل صاحب بھگوان کے لئے مجھے بچالو۔ میرا جسم نیچے دھنستا جا رہا ہے۔''

میں خوش قسمتی سے اس وقت خشک جگہ پر موجود تھا۔ میں بھاگ کر اس کے قریب گیا اور دلدلی زمین میں دھنستے ہوئے تھانیدار سوتم لعل سے کہا۔ ''آپ مجھے اپنی پینٹ کی بیٹی کھول کر اس کا ایک سرا میری جانب پھینکیں۔'' سوتم لعل نے سیکنڈوں میں اپنی پینٹ کی بیٹی کھول کر اس کا ایک سرا میری جانب پھینکا۔ اس کا وزن مجھ سے کہیں زیادہ بھاری تھا۔ میں نے اپنے تئیں خوب زور لگایا لیکن میں اسے اپنی طرف کھینچ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اس کو دلدل سے باہر نکالنے کے لئے مدد کے لئے پکارا۔

''فہیم گل تو اسے چھوڑ اور ہمارے ساتھ آ۔ اسے کچھ نہ ہوگا۔''

کٹھل سنگھ بڑے غصیلے انداز میں چلایا۔

میں نے چار پانچ دفعہ اسے دلدل کے جنگل

سے باہر نکالنے کے لئے دوسروں کو پکارا تو منقا گروپ کے ایک غنڈے کو تھوڑا سا ترس آیا اس نے ایک بڑی سوٹی توڑ کر اس کی جانب اچھال کر کہا۔ ''ایک ہاتھ سے تو اس سوٹی کو پکڑ اور میں اسے کھینچتا ہوں۔''

ہم دونوں نے سر توڑ کوشش سے تھانیدار سوم لعل کو دلدل سے باہر نکالا۔ وہ واپس جانے لگا تو کشل سنگھ نے اس کو دھاڑتے ہوئے کہا۔

''کہاں دفع ہو رہا ہے۔؟''

''سردار صاحب مجھے اپنی زندگی عزیز ہے۔ صوبیدار صحیح کہتا تھا کہ آگے جنگل نہیں بلکہ موت کی وادی ہے۔''

''تو نے اگر مصیبت کے وقت اس اندھے جنگل میں اکیلا چھوڑا تو یقین کر میں تجھے گولی مروا دوں گا۔''

''مروا دیں مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' تھانیدار نے انتہائی غصہ کے عالم میں جملہ کہا تو کشل سنگھ نے اپنے نیفے میں اڑسا ہوا پستول نکالا اور ایک فائر اس کی جانب داغ دیا تو بے چارہ تھانیدار ٹانگ پر گولی لگنے کے بعد زمین پر گر گیا۔

''چلو آگے بڑھو۔ اسے اٹھانے کی ضرورت نہیں اسے یہی مرنے دو۔'' کشل سنگھ کے اس اقدام سے ٹیم کے سارے اراکین سہم گئے۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے دو سونگھنے والے کتے بڑی برق رفتاری سے ہمارے سامنے سے گزرے ان کتوں میں سے ایک کے منہ میں ایک بڑا سا کوا دبا ہوا تھا۔ جبکہ دوسرے کتے کے منہ میں ایک نیلے رنگ کا کپڑا تھا۔ وہ تیزی سے جنگل کی حدود سے باہر چلے گئے۔

کشل سنگھ نے کتوں کی اس حالت میں واپسی دیکھی تو اس نے اپنا وطیرہ بدلتے ہوئے ساری ٹیم کو کہا۔ ''واپس چلو۔''

''سردار جی ہم بہت آگے آ گئے ہیں۔''

''تم میں سے آدھے بندے جنگل میں آگے بڑھیں اور آدھے میرے ساتھ واپس صوبیدار کے پاس چلیں۔'' کشل سنگھ نے کہا۔

دلی طور پر ساری ٹیم واپس جنگل سے جانا چاہتی تھی مگر کشل سنگھ نے چند افراد کو چن کر آگے بڑھنے کا کہا۔

شکر ہے، اس نے مجھے واپسی کا اشارہ کیا تھا۔

ہم جب دوبارہ واپس صوبیدار کے پاس گئے تو اس نے طنزیہ طور پر کچھ چبھتے جملے کشل سنگھ کو بھی سنائے۔

''اچھا یہ بتا تیرے کتے کیا کہتے ہیں۔؟'' کشل سنگھ نے پوچھا۔

''سردار جی! آپ خود دیکھ لیں ایک کتے نے اپنے منہ میں مردار کوے کو پکڑا ہوا ہے اور دوسرے کتے نے یہ نیلے رنگ کا کپڑا پکڑا ہوا ہے۔ جو دیکھنے میں کسی شلوار کا ہے اور شلوار میں خون بھی لگا ہوا ہے۔''

میں نے اس نیلے پھٹے کپڑے کے ٹکڑے کو پہچانتے ہوئے کہا۔

''ارے اس رنگ کی شلوار تو جلتن سنگھ نے صبح پہنی ہوئی تھی۔''

صوبیدار نے اپنا مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے سردار جی! جلتن سنگھ اسی جنگل کی حدود میں کہیں ہے، لیکن کس پوزیشن میں ہے اس کا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''اچھا اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔؟'' کشل سنگھ نے پوچھا۔

''سردار جی! میرے ابھی دو کتے جنگل کے اندر ہی ہیں۔ مجھے تھوڑی دیر ان کا انتظار کرنا ہے اور مجھے امید ہے وہ دونوں کتے ان دونوں کتوں کے پیچھے آ رہے ہوں گے۔'' صوبیدار بولا۔

''ابھی اور ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔'' کشل سنگھ نے پرزور انداز میں جیسے چلاتے ہوئے کہا۔

صوبیدار اس کے اور قریب آیا اور بولا۔ ''سردار جی! مجھے آپ کی پریشانی کا احساس ہے۔ لیکن

ہمیں آپ کے پتر جلتن سنگھ کو بڑی پلاننگ سے تلاش کرنا ہوگا۔ جہاں، آپ نے اتنا صبر کیا ہے تو مجھے تھوڑا وقت اور دے دیں۔"

اور پھر تقریباً دس منٹ بعد ایک کتا شدید زخمی لڑکھڑاتا ہوا جنگل سے نمودار ہوا۔ اس کے جسم پر کوؤں کے ٹھونگوں کے سینکڑوں نشان نمایاں تھے۔ کتے کا منہ ہونٹوں کی جانب سے کسی درندے نما جانور نے نوچا ہوا تھا۔

"سردار جی۔ اب میں صحیح نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کا پتر کس لوکیشن پر ہوگا۔ لیکن میں آپ کو اب بھی یہ بات صاف طور پر بتلا دوں کہ آپ کا پتر اس جنگل کی جس لوکیشن میں ہوگا وہ لامحالہ شدید کرب میں درندوں کے نرغے میں ہے۔"

"اچھا اپنی بکواس بند کر اور یہ بتلا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔؟"

کنھل سنگھ نے، انتہائی پریشانی میں اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

صوبیدار نے کہا۔ "سردار جی! کم از کم 10 افراد پر مشتمل ٹیم سامنے نبل کے راستے سے اور 10 افراد پر مشتمل ٹیم سائیڈ سے جنگل کے اندر بھیجنی چاہئے اور اسی طرح ایک بیک پارٹی نورال کے علاقہ سے جنگل کے اندر جائے۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔"

"سردار جی! بھگوان کے واسطے مجھے اس معاملہ کو اپنے طور پر ڈیل کرنے دیں۔ اگر آپ نے اس گتھی کو سلجھانا ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔"

ایک بدمعاش نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں صوبیدار صاحب یہ معاملہ آپ اپنے طور پر نمٹائیں۔ آپ جلدی سے تین ٹیمیں تشکیل دیں اور فاٹافٹ جنگل کی جانب پیش قدمی کریں۔"

اس بار بھی کنھل سنگھ نے مجھے اپنی ٹیم میں رکھا جس نے نبل کے راستے جنگل کے اندر جانا تھا۔

نبل کی سائیڈ سے جنگل کا راستہ کچھ کم دلدلی اور بہتر تھا، لیکن وہاں پر بھی جگہ جگہ کھڈوں وغیرہ میں پانی کھڑا تھا۔ ہماری ٹیم کے بندے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ڈنڈوں، کلہاڑیوں کی مدد سے راستے میں آئے سرکنڈوں جھاڑیوں اور چھوٹے درختوں کو کاٹ کر راستہ بناتے آگے بڑھنے لگے۔

تقریباً دو گھنٹے تک ہماری ٹیم بڑی احتیاط سے دھیمی چال چلتے ہوئے جنگل میں آگے بڑھتی رہی ابھی تک ہمیں کامیابی نہ ملی تھی۔ ایک جگہ آ کر ہم لوگوں نے یہ بات محسوس کی کہ آسمان پر لاتعداد کوّے جھنڈ کی صورت میں جنگل کی سیدھ میں آگے بڑھ رہے تھے۔

صوبیدار نے پوری ٹیم سے کہا کہ "وہ ان کوؤں کی طرف چلیں۔"

مزید تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک مقام پر آ کر ہماری ٹیم یہ منظر دیکھ کر ٹھٹھر گئی۔ منظر یہ تھا کہ جلتن سنگھ ایک خالی جگہ پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے اردگرد سینکڑوں کوے منڈلا رہے تھے اور اس سے ذرا دور سونگھنے والا ایک کتا کوؤں کو بھگانے کے لئے مسلسل زوردار آواز میں بھونک رہا تھا۔

کنھل سنگھ نے زوردار آواز کے ساتھ چلاتے ہوئے کہا۔ "ان کوؤں پر فائر کرو۔"

"ایسا نہ کرنا۔" صوبیدار نے اپنے حلق کی آخری حد تک زور سے چلاتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہ کرنا اور میری بات سن لو۔

ہمیں ان کوؤں کے قریب ہو کر ہوائی فائر کرنا چاہئے۔ ہرگز سیدھا فائر نہ کرنا اگر ہم نے ایسا کیا تو ہوسکتا ہے کہ یہ کوے اس بچے کو ناتلافی نقصان پہنچادیں۔"

صوبیدار کی ہدایت پر عمل کیا گیا۔ کوؤں نے شاید ہمیں دیکھ لیا تھا انہوں نے اشتعال میں آ کر ہمارے سروں پر ٹھونگیں مارنا شروع کردیں۔

"ہاں اب ان پر چھرے والے کارتوسوں سے کھلا فائر کرو اور اس کے ساتھ برق رفتاری سے جلتن سنگھ کی جانب بڑھو۔" صوبیدار بولا۔

اس عمل سے یہ فائدہ ہوا کہ جو کوے ہم پر حملہ کر رہے تھے ان کی بڑی تعداد بھاگ کھڑی ہوئی۔ لیکن چند ڈھیٹ کوے ابھی تک جنونی انداز میں ہم پر حملہ کر رہے تھے لیکن ان کی تعداد محدود تھی۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ فوجی انداز میں پیش قدمی کرتے ہوئے جب جلتن سنگھ کے قریب پہنچے تو وہ نڈھال قریب مرگ پڑا ہوا تھا۔ اسے فوری طور پر پانی پلایا گیا جو کتا کوؤں سے الجھ کر انہیں جلتن سنگھ کے قریب سے دور بھگانے کی کوشش کر رہا تھا وہ صوبیدار کے قریب ہانپتے ہوئے آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''ہوائی فائر کرو، جلدی فائر کرو۔'' صوبیدار مسلسل چلاتا رہا اب آسمان کوؤں سے صاف ہو گیا تھا۔ ''چلو جلتن سنگھ کو کندھے پر اٹھا کر جلد از جلد جنگل کی حدود سے باہر نکلو۔'' صوبیدار چلا کر بولا۔

نیم مرگ جلتن سنگھ کو ایک بدمعاش نے اپنے کندھے پر اٹھا لیا تو جلتن سنگھ نے نیم مردہ آواز میں کہا۔ ''وہ سامنے درخت پر بیٹھے کوئے کو مار دو۔ وہ کوا جن ہے وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''رکو اوئے رکو۔'' کشل سنگھ نے ساری ٹیم کو روکتے ہوئے کہا۔

''جلتن سنگھ کی بات کو غور سے سنو۔'' جلتن سنگھ کے لبوں کے قریب جب کان کئے گئے تو اس نے بڑی آہستگی سے کہا۔ ''وہ سامنے سفیدے کے درخت پر جو بڑا کالا کوا بیٹھا ہے۔ اسے کسی طرح مار دو وہی میری مصیبت کا اصل کارن ہے۔''

ہم سب نے اس طرف غور سے دیکھا تو واقعی سفیدے کے درخت پر ایک طویل قد کا بڑا سا ہٹا کٹا کوا خاموشی سے بیٹھا تھا۔

''ہے کوئی صحیح نشانہ باز جو اس شیطانی کوے کو نشانہ بنائے۔'' کشل سنگھ بولا۔

''ہاں سردار جی! میں ہوں۔'' منقا گروپ کا ایک بدمعاش بڑے دعوئی سے کہا اور آگے بڑھا۔

''دیکھ اگر تو نے میرے پتر کے اس دشمن کو مار دیا تو میں تجھے دو مربعہ زرعی زمین دوں گا اور ہاں اگر تو نے چوک کی تو یاد رکھ میں تجھے یہیں گولی مار دوں گا۔'' کشل سنگھ بولا۔

''سردار جی! بھگوان نے چاہا تو میں اپنے دعویٰ پر کھرا نکلوں گا۔'' بدمعاش بولا۔

اور پھر اس بدمعاش کو T-13 کارتوس والی نئی گن تھمائی گئی جس پر قیمتی دوربین لگی ہوئی تھی۔ بدمعاش نے چند لمحے میں کوے کو نشانہ پر لیا اس کی آنکھ بند تھی، دوسری آنکھ دوربین پر اور انگلی ٹریگر پر تھی، اس وقت ماحول پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ بدمعاش نے اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے درخت پر بیٹھے کوئے کو ایک ہی فائر سے نیچے زمین پر گرا دیا اس کے بعد اس نے اپنی تسلی کے لئے دوسرا فائر بھی مارا جس سے کوے کا جسم ادھڑ کر رہ گیا۔

دراصل وہ کوا جن اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ شاید وہ اپنے دیگر ساتھی کوؤں کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھی اسے تنہا چھوڑ کر بھاگ چکے تھے اور وہ اس بے خیالی میں گولیوں کا نشانہ بن گیا اور جلتن سنگھ کی جان اس سے چھوٹ گئی۔

جلتن سنگھ کو اس کے والد نے بمبئی شہر کے سب سے مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا۔ وہاں اس کا علاج دو ماہ تک ہوتا رہا۔

کشل سنگھ نے زخمی تھانیدار کو اس زمانہ میں دس ہزار، صوبیدار کو پانچ ہزار روپے انعام کے دیئے اور مجھے دو ہزار روپے نقد کے علاوہ میرے میڈیکل تعلیم کا تمام خرچہ برداشت کیا۔

جلتن سنگھ نے اپنی صحت یابی کے فوراً بعد اپنی میڈیکل کی تعلیم کو جاری رکھا۔

بقول راوی۔ ''میں تو ڈاکٹر بن کر 1947ء میں پاکستان آ گیا جبکہ جلتن سنگھ کے بارے میں یہ پتا چلا کہ وہ آنکھوں کا بڑا سرجن ڈاکٹر بنا تھا۔''

حویلی کاراز

سیدہ عطیہ زاہرہ۔ لاہور

کشادہ کمرے میں گھر والے بیٹھے تھے اور عقل کو حیران کرتا انوکھا واقعہ رونما ہوا، ایک سیاہ ناگ کمرے میں داخل ہوا اور بین کی آواز پر جھومنے لگا، بین کی آواز نے اسے مست کردیا اور پھر ایک ناقابل یقین واقعہ سامنے آیا۔

ایک حسینہ کی ضد اور ہٹ دھرمی جس نے اس کی زندگی اجیرن کردی۔ خوف میں ڈوبی کہانی

علی احسن یورپ کی ماڈرن زندگی سے بری طرح اکتا گئے تھے۔ پورے اٹھارہ سال سے انہوں نے وطن کا رخ نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں وطن سے نفرت تھی۔ بلکہ وہ اپنے چھوٹے بھائی اکبر علی سے ناراض ہوگئے تھے۔ خود اکبر علی کئی بار ان سے ملنے کے لئے آچکے تھے۔ اور بظاہر یہ رنجش دور ہوگئی تھی۔

لیکن اکبر علی کی بار بار کی دعوت کے باوجود علی احسن وطن واپس نہیں آئے، بس کچھ کاروباری مصروفیات کچھ لاپرواہی اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ دل کھٹا ہوگیا تھا۔ وطن آنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ وطن میں ان کا کوئی نہیں تھا۔ بہن بھائی چچا اور دوسرے نزدیکی عزیز، سب ہی کوشش کر چکے تھے، کہ احسن وطن آجائیں، اور سب کے ساتھ مل کر رہیں، لیکن ان کی ان کوششوں کو احسن ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ بیوی کے رشتے دار بھی تھے۔

لیکن سعدیہ خاتون ان شوہر پرست عورتوں میں تھیں۔ جن کی مثال دی جاتی ہے۔ شوہر کا رخ دیکھ کر انہوں نے بھولے سے بھی نہ کہا تھا کہ وہ اپنے عزیزوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے عزیز کبھی ان سے ملنے آجاتے تھے۔ اور احسن بیوی کے رشتہ داروں کی راہ میں بھی آنکھیں بچھا دیتے تھے۔ سعدیہ کے عزیز اتنے مالدار نہ تھے کہ جلد جلد ان سے ملنے آتے رہتے! کبھی کبھی سعدیہ خاتون کے دل میں ہوک اٹھتی تھی، لیکن کیا مجال کہ شوہر کو احساس بھی ہوجائے۔

نوریا دو سال کی تھی، جب وہ اپنے وطن سے یہاں آئے تھے۔ اور اب نوریا ماشاء اللہ بیس سال کی ہوچکی تھی۔ بے حد ذہین، شوخ اور پڑھنے لکھنے میں تیز تھی وہ یورپ کی پروردہ تھی اور یہی ماحول اس نے اپنایا ہوا تھا۔ جبکہ علی احسن کا گھرانہ ان کے شہر کے گنے چنے شریف لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ سعدیہ بیگم کو بیٹی کی بعض عادتوں پر اعتراض تھا۔ لیکن علی احسن کہتے تھے کہ "جیسا دیس ویسا بھیس" حالانکہ وہ خود بھی اس دیس کے بھیس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نوریا تیز طرار ضرور تھی لیکن خود علی احسن لاکھ کوشش کے باوجود اس کے کردار کی کوئی خامی نہیں تلاش کر سکے تھے، تاہم وہ کبھی کبھی دبی زبان سے بیٹی کو نصیحتیں ضرور کرتے تھے۔ وہ اسے بتاتے تھے کہ "ان کے گھر کی عورتیں کس طرح رہتی ہیں۔ اور ان کے کردار کیا ہیں؟"

تو نوریا کہتی! "لیکن پاپا...... میں ان کی طرح

کس طرح رہ سکتی ہوں...... مجھے کیا معلوم وہ کیا کرتے ہیں؟ پاپا مجھے بھی ان لوگوں کے پاس لے چلئے۔ میں ان عجوبوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'

اور ایسے موقعوں پر علی احسن لاجواب ہو جاتے، بات درست ہی تھی۔ نوریا جس ماحول سے واقف ہی نہ تھی۔ اسے اپنانے کی کوشش کیسے کر سکتی تھی۔

علی احسن کو بیٹی کے رشتے کی فکر بھی تھی۔ یہاں یورپ میں بھی انہیں اچھے رشتے مل سکتے تھے۔ لیکن یہاں کے نوجوان طبقے سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اول تو ان کے وطن کے نوجوان یہاں آتے ہی بدیسی لڑکیوں کے لئے تھے۔ یہاں رہ کر بھی وہ بدیسی لڑکی کو کیسے اپنا سکتے تھے۔

بھلا کہاں یورپ کی رنگین تتلیاں اور مشرق کی پھوہڑ عورتیں! چنانچہ وہ بیٹی کے سلسلے میں پریشان تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے وطن سے انہیں کوئی رشتہ ملے!

پھر جب اکبر علی نے اپنے دوست شمشاد کا تعارف ان سے کرایا تو وہ شمشاد کی خاندانی شرافت اور خاندانی حالات سے بہت متاثر ہوئے۔ اکبر علی شمشاد کے ساتھ یورپ آئے تھے۔ شمشاد کو چھاپے خانے کی کچھ مشینیں خریدنا تھیں۔ پھر اکبر علی نے وطن واپس جا کر علی احسن کے بارے میں شمشاد کے تاثرات لکھے۔

وہ یورپ میں رہنے کے باوجود علی احسن کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اور اس نے اکبر علی سے کہا تھا کہ اگر علی احسن برا نہ محسوس کریں تو وہ اپنے بیٹے منصور کا رشتہ ان کی بیٹی نوریا کے لئے دینا چاہتا تھا۔

اکبر علی شمشاد کی اس خواہش کے ساتھ ساتھ شمشاد کے مفصل حالات لکھے تھے۔ اس نے منصور کے بارے میں بھی تفصیل لکھی تھی۔ جس میں بتایا تھا کہ منصور انتہائی مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین نوجوان ہے۔ باپ کے پورے کاروبار کو اس نے سنبھال رکھا ہے اور خود کو اکبر علی ان لوگوں سے پوری طرح مطمئن ہیں۔

بہرحال اس خط نے احسن کو کافی حد تک متاثر کیا تھا۔ اول تو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا وطن آئے ہوئے، اکبر علی سے جو رنجش تھی وہ اب صرف ایک بہانہ رہ گیا تھا۔

آخر بھائی تھا۔ پھر وہ بوڑھے بھی ہو گئے تھے۔

نوریا کو اپنے خاندان کی ضرورت تھی۔ ورنہ کل کلاں کو آنکھ بند ہو گئی۔ تو وہ اپنے خاندان کے لئے اجنبی بن کر رہ جائے گی۔ چنانچہ احسن سوچ رہے تھے کہ ''انہیں زندگی میں ہی بیٹی کو خاندان سے متعارف کرا دیں۔'' انہیں یورپ کی برہنگی پسند نہیں تھی۔ لیکن اس وقت تک انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جب تک بیٹی جوان نہ ہو گئی۔ اب وہ نوریا کے عجیب وغریب لباسوں سے پریشان ہو گئے تھے۔

وہ خاندان جن کی پرچھائیاں بھی غیر نہ دیکھ پاتے تھے۔ لیکن علی احسن کے پڑوسی تک نوریا کے جسم کے ہر حصے کا ناپ بتا سکتے تھے، اور یہ صورت حال انہیں خاصا متاثر کر رہی تھی، اوپر سے شمشاد کا پیغام! بیٹی کے لئے ایک اچھا رشتہ مل رہا تھا۔ چنانچہ اس بار اپنی لاپرواہیوں کو تھوڑا سا سمیٹ لیا، اور آہستہ آہستہ وطن واپس آ جانے کے انتظامات کرنے لگے۔

پھیلے ہوئے کاروبار کے لئے مناسب منتظم مقرر کئے۔ یہ سب کام آہستہ آہستہ ہو رہے تھے۔ وہ اپنے کاہل پن کا کیا کرتے؟ لیکن اس دن تمام کاہلی دور ہو گئی، جب انہوں نے اپنی بالائی منزل کی کھڑکی سے ایک کار اپنی کوٹھی کے سامنے رکتے دیکھی۔

اس کار سے نوریا اتری۔ اس کے ساتھ ایک مقامی نوجوان بھی تھا۔ نوجوان نے نوریا کے داہنے رخسار پر بوسہ دیا اور ہاتھ ہلاتا ہوا کار میں جا بیٹھا، اور پھر کار آگے بڑھ گئی۔

علی احسن سکتے میں رہ گئے۔ دو تین گھنٹے تو ان کے حواس ہی قابو میں نہ آئے۔ پھر کھانے کی میز پر انہوں نے نوریا سے اس کی کار کے بارے میں پوچھا۔

''خراب ہو گئی تھی پاپا، میں نے ورکشاپ فون کر دیا تھا۔ وہ لے گئے ہوں گے۔''

"تم کس طرح واپس آئی؟" انہوں نے برہمی سے پوچھا۔

"جسم چھوڑ گیا تھا۔ میرا دوست ہے، بڑا سوئیٹ لڑکا ہے۔ کبھی آپ کو اس سے ملواؤں گی، نوریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور احسن سوچ میں پڑ گئے۔ "غلطی انہی کی تھی۔ جیسا دیس...... ویسا بھیس!"

لیکن ان کی کاہلی اسی دن دور ہوگئی، اور تیسرے دن انہوں نے اعلان کر دیا، کہ وہ دو دن کے بعد وطن واپس چل رہے ہیں۔ نوریا اس خبر سے بے حد خوش ہوگئی، اور سعدیہ کے بدن میں جیسے کسی نے نئی روح پھونک دی ہو۔ اپنے بچھڑوں سے ملنے کی خوشی ان کا ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

علی احسن اس سے اتنے بدحواس ہوگئے تھے کہ ٹھیک تیسرے دن انہوں نے یورپ چھوڑ دیا!

☆......☆......☆

پورے اٹھارہ برس کے بعد وہ وطن کی سرزمین پر اترے۔ ان کا دل عجیب سے جذبے سے سرشار تھا۔ وطن کی محبت پوری قوت سے امڈ آئی تھی اور انہیں اپنے شہر کا ذرہ ذرہ پیارا لگ رہا تھا۔ انہوں نے کسی کو اپنی آمد کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ ایک دم جو گھر پہنچے تو سب بھونچکے رہ گئے، اور پھر تو خاندان بھر میں کہرام مچ گیا۔ پورے خاندان نے حملہ کر دیا، اور اکبر علی کی کوٹھی میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی! ہفتوں یہ طوفان برپا رہا! سعدیہ خاتون کے غریب لیکن باوقار عزیز بھی ان سے ملنے آئے تھے۔ خود وہ بھی ابھی کہیں نہ جا سکی تھیں۔

اور نوریا...... وہ تو سب کے لئے کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اس کے ہم عمر لڑکے اور لڑکیاں تو اس پر فدا تھے۔ اس کی باتیں ان سب کے لئے عجیب تھیں۔ اور وہ نوریا کے لئے تماشا! بہرحال وہ ان میں بہت خوش تھی۔ علی احسن کو احساس تھا کہ انہوں نے بیوی کو پورے اٹھارہ سال اس کے عزیزوں سے دور رکھا ہے۔ اس لئے انہوں نے سعدیہ کو آزادی دے دی تھی کہ وہ جب تک چاہے، اور جہاں چاہے، رہے۔

نوریا البتہ ددھیال والوں کے ہاتھوں میں رہی!

اس طرح تین ماہ گزر گئے، اکبر علی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود علی احسن نے شہر میں ایک خوب صورت کوٹھی خرید لی۔ اپنے مزاج کی وجہ سے مستقل اکبر علی کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ کوٹھی خریدنے کے بعد انہوں نے کاروبار کی طرف توجہ دی۔

اکبر علی نے جائیداد کی تفصیل اور حسابات پیش کر دیئے۔ فرمانبردار بھائی نے ان اٹھارہ سال کا ایک ایک پیسے کا حساب صاف رکھا تھا۔ جس سے علی احسن بہت متاثر ہوئے۔

"تم میرے بیٹے ہو اکبر علی، مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر وہی جائیدادوں کے بارے میں بات ہونے لگی۔ اور اس میں جمال پور کا ذکر آیا۔

"ارے...... ہاں جمال پور کی حویلی کا کیا کیا؟ کیا اسے منہدم کرا دیا؟" علی احسن نے پوچھا۔

"میں آپ کی اجازت کے بغیر یہ گستاخی کیسے کر سکتا تھا بھائی صاحب؟" اکبر علی نے جواب دیا۔

"اوہو تو گویا وہ پراسرار حویلی اسی طرح قائم ہے مگر اس کا کیا کیا جائے؟ طویل عرصہ سے بے کار پڑی ہے؟"

"ایک بار میں نے سوچا تھا بھائی صاحب، کہ اسے تڑوا کر گیسٹ ہاؤس بنوا دیا جائے گا۔ خوبصورت علاقہ ہے۔ کبھی کبھی وہاں چلے جایا کریں گے؟"

"عمدہ خیال تھا۔ مگر......؟"

خاندان بھر کے بزرگوں نے اس خیال کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا کہ "اسے نہ چھیڑا جائے۔ وہ ہماری پشتی جاگیر ہے۔ نہ جانے ہمارے خاندان کے کتنے راز اس میں دفن ہیں، اور میں بہرحال اس سے اختلاف نہ کر سکا۔"

"ہاں بھئی یہ درست ہے۔ بہرحال پڑا رہنے دو، ارے ہاں...... اس سانپ کا کیا حال ہے؟ کیا وہ

اب بھی وہاں موجود ہے؟"

"دس سال سے حویلی بند پڑی ہے۔ کوئی وہاں گیا ہی نہیں، ویسے دس سال پہلے رحمو خان نے اسے دیکھا تھا۔"

"وہ بھی عجوبہ ہے۔ مشرق میں ان پراسرار روایات کے علاوہ کیا رکھا ہے؟"

"کون سی پراسرار روایات پاپا؟"

نوریہ نے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مختلف روایات، کیا تم نے عجیب باتیں نہیں محسوس کیں نوریا؟"

علی احسن مسکراتے ہوئے بولے۔ بیٹی کی کایا پلٹ سے وہ بے حد خوش تھے۔ یہاں کے ماحول نے اس کی شخصیت ہی بدل دی تھی۔ تمام نیم عریاں لباس صندوقوں میں بند ہوگئے تھے۔ اور اب نوریا غرارہ سوٹ، شلوار قمیض اور بعض اوقات چوڑی دار پائجامے میں نظر آتی تھی۔ اور ان لباسوں نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

"بہت سی عجیب باتیں پاپا! یہ ملک تو بہت حسین ہے، بہت شاندار میرے بہن بھائی بہت اچھے ہیں۔ مجھے افسوس ہے، کہ میں اب تک یہاں کیوں نہیں آئی!"

"خوب یہ خوشی کی بات ہے، کہ تمہیں اپنا وطن پسند آیا ورنہ صرف چند ماہ غیر ملک میں رہ کر آنے والے اپنے ملک کی ایک ایک چیز پر اس طرح ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ جیسے ان کا خمیر ہی یورپ کی مٹی سے اٹھا ہو۔"

"آپ کون سی روایات کا ذکر کر رہے تھے پاپا؟" نوریا بھی اسی بات پر آ گئی۔

"یہاں ایک علاقہ ہے جمال پور، ہماری جاگیر ہے، وہاں ایک حویلی ہے، ہماری چار پشتیں ہماری اس حویلی میں رہی ہیں، اور اب تین پشتوں سے وہ حویلی بند ہے۔ صدہا سال پرانی حویلی ہے، لیکن فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے آج بھی اس کی دیواریں اس طرح قائم ہیں۔ جس طرح ہم نے اور ہمارے والد اور دادا نے اپنے بچپن میں دیکھی تھیں۔"

"ونڈر فل پاپا! میں نے یہاں کی دوسری عمارتیں بھی دیکھی ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ صدیوں پہلے یہ عمارتیں کس طرح بنائی گئی ہوں گی۔ جبکہ اس وقت جدید سہولتیں نہیں تھیں۔ پاپا کیا میں اس حویلی کو دیکھ سکتی ہوں؟"

"ایں...... کیا حرج ہے بیٹے؟ کیوں اکبر علی؟"

"ہاں حرج تو کوئی نہیں ہے، لیکن...... آپ مذاق اڑائیں گے بھائی جان، دراصل کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ آسیب زدہ ہوگئی ہے۔"

"آسیب کیا ہوتا ہے انکل؟" نوریا نے معصومیت سے پوچھا اور اکبر علی ہنسنے لگے۔

بہر حال نوریا سر ہوگئی کہ وہ اس حویلی کو ضرور دیکھے گی اور اکبر علی نے وعدہ کرلیا کہ وہ وہاں ضروری انتظامات کرانے کے بعد اسے بھیج دیں گے۔" ایک درجن ملازمین حویلی کی صفائی کے لئے بھیج دیئے اور پھر ایک ہفتے کے بعد نوریا اپنی چند عزیز لڑکیوں اور ملازموں کے ساتھ حویلی کی طرف چل پڑی۔ سفر کے لئے جیپوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ساتھ میں صرف بوڑھے اور پرانے ملازم تھے۔ یہاں کے ماحول میں لڑکیوں اور لڑکوں کو آزادانہ ملنے کی اجازت نہ تھی اس لئے نوریا کے ساتھ صرف لڑکیاں ہی تھیں۔

حویلی درحقیقت ایک عجوبہ تھی۔ اس کا اصل رنگ غائب ہوگیا تھا اور دیواریں اندر اور باہر سے سیل اور کائی کی وجہ سے سیاہ ہوگئی تھیں۔ لیکن اب بھی انہیں دیکھ کر ان کی مضبوطی کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ نوریا کو یہ پراسرار اور ویران حویلی بے حد پسند آئی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کے ایک ایک حصے کو دیکھتی پھری۔ حالانکہ دوسری لڑکیاں یہاں کے ماحول سے قدرے خوف زدہ تھیں۔ لیکن نوریا کے لئے یہ ماحول بے حد دلکش تھا۔ وہ یہاں آ کر بہت خوش تھی۔

حویلی کے ایک کمرے میں جو سب سے مضبوط

تھا ان لڑکیوں کے لئے سونے وغیرہ کا بندوبست کردیا گیا تھا۔ ملازم اس سے ملحق دوسرے کمرے میں تھے۔ دن تو تفریحات اور حویلی کی سیر میں گزر گیا۔ لیکن رات کا منظر بے حد خوفناک تھا۔ آخری راتوں کا چاند تھا۔ حویلی تاریکی میں بھوتوں کا مسکن نظر آتی تھی۔ لڑکیاں جبکہ اپنے بستروں میں گھسی ہوئی تھیں۔ ''کیا یورپ میں بھوت نہیں ہوتے نویرا؟'' ایک لڑکی نے پوچھا۔

''چپ رہو نغمہ، خدا کے لئے! اس پراسرار اور وحشت خیز ماحول میں تمہیں بھوتوں کی باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھا!'' دوسری لڑکی نے، خوفزدہ آواز میں کہا۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ بھوت وہاں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بھی وہاں کے انسانوں کی طرح ماڈرن ہوتے ہیں۔ وہ شراب خانوں میں شراب پیتے ہیں۔ نائٹ کلبوں میں رقص کرتے ہیں اور ریس کورس میں ریس کھیلتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ شراب کے پیسے نہیں دیتے، رقص کرتی ہوئی لڑکیاں ان کی کمر میں ہاتھ ڈالنے میں ناکام رہتی ہیں اور ریس کورس میں ان کا گھوڑا ضرور اول آتا ہے۔'' نویرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خدا کی پناہ تم کتنے اطمینان سے ان کا ذکر کررہی ہو کیا تمہیں ان سے خوف نہیں محسوس ہوتا؟'' دوسری لڑکی نے پوچھا۔

''نہیں...... بالکل نہیں، یہاں کے بھوت کیسے ہوتے ہیں؟''

''ارے نہ پوچھو، یہ لمبے لمبے دانت، خوفناک سرخ آنکھیں، ننگ دھڑنگ بے ہنگم جسم، بڑے بڑے ہاتھ جن کے ناخن اتنے لمبے لمبے ہوتے ہیں؟'' کہ نغمہ نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

''نغمہ کی بچی خاموش نہیں رہے گی۔'' دوسری لڑکی خوف سے چیخی اور نغمہ ہنسنے لگی۔ لیکن نویرا کو ان باتوں سے بڑی دلچسپی محسوس ہورہی تھی۔ اٹھ کر نغمہ کے پاس پہنچی اور بولی۔ ''ڈیئر نغمہ، پلیز، مجھے بھوت دکھا لاؤ۔''

''ارے باپ رے، یہ ٹیڑھا معاملہ ہے۔'' نغمہ بوکھلا کر بولی۔

''کیا یہاں حویلی میں بھوت رہتے ہیں؟'' نویرا نے پوچھا۔

''کہلاتی تو یہ آسیب زدہ ہے۔''

''اوہ...... ہاں انکل بھی کہہ رہے تھے۔ تو بھوت کو آسیب بھی کہتے ہیں۔ اب تو میں بھوت ضرور دیکھوں گی۔'' نویرا ضد کرنے لگی۔

''ارے نویرا، ہوش میں آؤ، یہاں کے بھوت یورپین بھوتوں کی طرح شریف اور خوش اخلاق نہیں ہوتے، کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گی؟'' نغمہ نے کہا۔

''اب دکھا کر لاؤ نا، بڑی ڈینگیں مار رہی تھیں۔'' دوسری لڑکی نے کہا۔

''چلو پھر تم بھی چلو۔'' نغمہ نے کہا اور نویرا ضد کرنے لگی۔

''ہاں...... آؤ سب چلتے ہیں۔''

''تم لوگ کیسی دوست ہو؟ مجھے بھوت تک نہیں دکھا سکتیں۔'' نویرا نے روٹھتے ہوئے کہا۔ لیکن لڑکیاں دروازے سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں۔ سب سٹ گئیں۔ اور پھر نویرا ہی جھلا کر بولی۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ نہ جاؤ، تم لوگ میں خود دیکھ آتی ہوں۔'' اور وہ بستر سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی۔

''ارے نویرا، خدا کے لئے باز آجاؤ، کسی مصیبت میں نہ پڑو۔'' نغمہ نے اسے سمجھایا۔ ''پڑنے دو۔ میں بھوت ضرور دیکھوں گی۔'' نویرا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولی۔ اور لڑکیاں بھی اپنے بستر سے باہر نکل آئیں، انہوں نے چیخ چیخ کر ملازموں کو آواز دی، اور ملازم دوڑتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے، اس چیخ و پکار سے سب بدحواس ہوگئے تھے، حویلی کا پراسرار ماحول ان پر بھی اثر انداز تھا۔

''کیا ہوا بیٹا؟ کیا بات ہے؟'' بوڑھے ملازم نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بابا...... اس نویرا کی بچی کو سمجھاؤ، بھوت دیکھنے جارہی ہے۔''

''کیا دیکھنے؟'' بوڑھا ملازم متحیرانہ انداز میں بولا۔

''بھوت دیکھنے، بس بھوتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ پیچھے پڑ گئی کہ بھوت دیکھے گی، ہم سے ضد کر رہی تھی کہ ہم بھی چلیں، لیکن جب ہم تیار نہ ہوئیں، تو اکیلی جانے کے لئے تیار ہو گئی۔''

''ارے نہیں نویرا بٹیا بھوت یہاں نہیں، لیکن سانپ ضرور ہیں اور پھر حویلی کا بوڑھا سانپ تو مشہور ہے، پشتوں سے اس کی کہانی چلی آ رہی ہے، ہمارے دادوں پردادوں نے بھی اسے یہاں دیکھا ہے، اور آج جب ہم حویلی صاف کر رہے تھے تو ہم نے اس کے جسم کی لکیریں دیکھی ہیں۔ بے شمار لکیریں، اب نہ معلوم کہ وہ ایک سانپ کی ہیں یا بہت سے سانپوں کی؟ رات میں نکلنا خطرناک ہے بٹی! رات کو سانپ خوراک کی تلاش میں نکلتے ہیں۔''

''سانپ، کیا کھاتے ہیں بابا؟'' نویرا نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یہ تو معلوم نہیں بٹی، لیکن بٹی۔
وہ ڈس ضرور لیتے ہیں۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''مجھے سانپ ہی دکھا دیں بابا!''

''نہیں، نویرا بٹیا! رات میں سانپ بہت خطرناک ہوتا ہے، خدا کے لئے بچیو! اس معصوم لڑکی سے ایسی گفتگو نہ کرو جو ہم سب کے لئے مصیبت بن جائے۔'' بوڑھے نے کہا اور بمشکل سمجھا بجھا کر نویرا کو واپس کمرے میں پہنچا آیا۔ نویرا روٹھی ہوئی سی لیٹ گئی اور لڑکیاں اسے مناتی رہیں، بالآخر وہ سو گئی، اور لڑکیاں بھی ایک ایک کر کے سو گئیں۔

''کیوں نا خاموشی سے باہر چل کر بھوت دیکھے جائیں۔'' اس نے سوچا، اور یہ خیال جڑ پکڑ گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ سے جسم پر اوڑھی ہوئی چادر سرکائی اور کھڑی ہو گئی۔ شب خوابی کا لبادہ پہنا اور سلیپر پہن کر وہ چوروں کی طرح دروازے کے نزدیک پہنچی اور اسے کھول کر باہر نکل آئی۔

چاند نکل آیا تھا، روپہلی چاندنی نے حویلی کے ایک ایک منظر کو اجاگر کر دیا تھا اور چاندنی میں ڈوبی ہوئی پرسکوت حویلی عجیب پرسحر منظر پیش کر رہی تھی۔ نویرا کو یہ منظر بے حد حسین لگا، اور وہ بے اختیار آگے بڑھتی چلی گئی۔

ٹوٹی دیواریں، ان کے درمیان اگ آنے والی جھاڑیاں عبور کرتی ہوئی وہ حویلی کے عقبی حصے کی طرف نکل آئی۔ جو ویران پڑا تھا۔ بہت سے پھلوں کے درخت تھے۔ جن میں بیشتر دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے سوکھ گئے تھے۔ ان کے نیچے زمین پر خودرو گھاس بہت لمبی ہو گئی تھی۔ وہ ہر چیز سے بے پرواہ اس گھاس میں سے گزرنے لگی۔ اسے بھوتوں کی تلاش تھی، لیکن ابھی تک ایک بھی بھوت نظر نہیں آیا تھا اور اب اسے مایوسی ہونے لگی تھی۔ ''نہ جانے بھوت کہاں چلے گئے؟'' اس نے سوچا۔ اور گھاس سے نکل آئی۔

اب اس کا رخ حویلی کی آخری ٹوٹی دیوار کی طرف تھا جہاں گھاس زیادہ لمبی نہیں تھی۔ ابھی وہ دیوار سے کچھ دور تھی کہ اسے کوئی چمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ نہ جانے کیا شے تھی؟ شاید کوئی ہیرا! وہ ہیرے کی طرح ہی چمک رہی تھی۔

نویرا کو ہیرے بہت پسند تھے۔ اس نے سوچا

وہ تقریباً تین گز لمبا سیاہ رنگ کا سانپ تھا۔ جس کے سر پر لمبے لمبے بال اگے ہوئے تھے۔ اس کا فاصلہ نوریا سے چند فٹ سے زیادہ نہ تھا اور اس سے قبل کہ نوریا وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی، سانپ نے زبردست پھنکار ماری، اور اس کی پنڈلی پر منہ مار دیا۔

نوریا نے ایک سسکاری لے کر اپنی پنڈلی پکڑلی اور بیٹھتی چلی گئی، اس کے پورے جسم میں جیسے انگارے بھر گئے تھے۔ بے پناہ تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن حلق کی نالی گویا بند ہوگئی تھی۔ زمین پر بیٹھی وہ چند سیکنڈ جھومتی رہی، اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیل گئی۔ وہ بے جان سی ہو کر زمین پر گر گئی۔

سانپ اپنے دشمن سے نمٹ کر تیزی سے آگے بڑھا، اور چمکنے والی چیز کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اپنا منہ کھولا اور چمکدار چیز کو نگل گیا۔ اب وہ پرسکون نظر آرہا تھا۔ اس کا غصہ فرد ہو گیا تھا۔ اپنا منکا نگل لینے کے بعد وہ دوبارہ اپنے دشمن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے دشمن کے جسم کو محسوس کیا اور اس پر چڑھ گیا۔ شاید وہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا دشمن عورت ہے۔ اس کے بعد وہ اس پر سے اتر آیا، اور اس سے کئی قدم دور لیٹ گیا۔ اب وہ زمین پر سیدھا پڑا تھا۔

سانپ کو چت لیٹے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ لیکن وہ خوفناک سانپ زمین پر چت لیٹا تھا اور چاندنی میں اس کا کوڑیالہ جسم چمک رہا تھا۔ اچانک اس کے جسم کا حجم بڑھنے لگا، اس کی لمبائی کم ہوتی جارہی تھی اور جسم موٹا ہو رہا تھا۔ کوڑیالے نقوش بھی مدہم پڑنے لگے۔ اور صرف چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کی جگہ ایک انسان چت لیٹا ہوا تھا۔

ادھیڑ عمر کا مرد، جس کے چہرے سے شیطنیت ٹپکتی تھی، لیکن وہ اندھا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو گہرے غار تھے۔ جس نے اس کے چہرے کو اور خوفناک کر دیا تھا۔ چند ساعت وہ گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ پھر اس کا منہ کھلا اور اس میں سے ایک زبان باہر نکل آئی۔ ہاتھ بھر لمبی زبان، لیکن یہ صرف محاورہ نہ تھا، بلکہ اس کی زبان ہاتھ سے مشابہ تھی۔ جس کی پانچ انگلیاں تھیں۔ اس نے لیٹے لیٹے چہرہ آگے بڑھایا، اور اس زبان سے نوریا کے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ گردن، سینہ، پیٹ اور پھر رانوں سے گزر کر اس کے ہاتھ نما زبان نوریا کی پنڈلی کے اس زخم پر پہنچ گئی جو اس کے کاٹنے سے پیدا ہوا تھا۔ وہ اس زخم کو محسوس کرتا رہا اور پھر وہ کھسک کر اپنا چہرہ نوریا کے جسم پر لے گیا۔ زبان اندر چلی گئی اور اس نے اپنے ہونٹ نوریا کی پنڈلی کے زخم پر رکھ دیئے۔

وہ دوسرے لمحے اس زخم کو چوس رہا تھا۔ چاندنی میں نوریا کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں میں تیزی سے پھیلتی ہوئی نیلاہٹ رک گئی اور پھر وہ نیلاہٹ کم پڑتی گئی، یہاں تک کہ اس کا رنگ پہلے کی طرح صاف ہو گیا۔

نوریا کی سانس کی آمد و رفت درست ہونے لگی اور بدشکل شخص اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ نوریا کے جسم پر اپنے دونوں ہاتھ پھیر کر اس کا سانس محسوس کر رہا تھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے نوریا کے بے ہوش جسم کو اٹھایا اور ٹوٹی دیوار کے پیچھے پہنچ گیا۔ یہاں بھی لمبی لمبی گھاس موجود تھی۔ اس نے بہ آہستگی اسے گھاس پر لٹا دیا اور پرہوس انداز سے اسے دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

نوریا دنیا و مافیہا سے بے خبر، اپنی متاع نسوانیت کے لٹنے سے بے خبر آسمان کے نیچے پڑی تھی۔ اس معصوم کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ عورت کی زندگی میں پہلا مرد کس طرح آتا ہے۔ اس کی زندگی میں پہلا مرد آیا اور چلا گیا۔ نوریا کی آنکھ کھلی تو دن کا اجالا پن واضح ہو گیا۔ چہچہاتے پرندے آسمان میں پرواز کرتے ہوئے صبح کی آمد کا اعلان کر رہے تھے اس کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے، پورے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے تھوک نگلنے کی کوشش کی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ جسم کی ساری نمی خشک ہو گئی ہو۔ حلق چرچرا کر رہ گیا اور اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اسے اپنی اس حالت پر

سخت حیرت ہوئی اور وہ کہنیوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی، اٹھتے ہوئے اسے عجیب سا احساس ہوا۔ ایک عجیب اور شرمناک احساس......

اور وہ حیرت وخوف سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا ہوا؟ یہ سب کیا ہوا؟ کس نے اس کے ساتھ دھوکا کیا؟ وہ ظالم تھا؟ کہاں چلا گیا؟'' لیکن ان سوالات کے اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ویران حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی، اس نے قرب وجوار کے ماحول کو دیکھا۔ اور اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔ وہ بھوتوں کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ اسے بھوت نہیں ملے تھے۔ پھر وہ چمکدار چیز، اور اس کے بعد سانپ، ایک بار پھر وہ خوف سے اچھل پڑی، اور ہمت کر کے کھڑی ہوگئی، اسے سخت تکلیف محسوس ہو رہی تھی، ایسی تکلیف جس کا وہ کسی سے ذکر بھی نہیں کر سکتی تھی، وہ لڑکھڑاتے قدموں سے واپس چل دی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کمرے میں داخل ہوگئی، جہاں دوسری لڑکیاں اب بھی بے خبر سو رہی تھیں، وہ شب خوابی کا لبادہ اتار کر بستر میں آ لیٹی۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ حلق میں بدستور کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ اور چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اسے دلی رنج تھا۔ ''وہ کون کمینہ مرد تھا جس نے اس کی عصمت چرالی تھی۔ وہ کون تھا؟'' اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے۔

یورپ کے آزاد ماحول میں اس نے باپ کی نصیحتوں کو گرہ میں باندھ کر رکھا تھا۔ اس نے ہر اس دوست کو بری طرح ڈانٹ دیا تھا جس نے دوستی کی حدود کو عبور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ذہن میں اپنی زندگی کے ساتھی کے لئے آئیڈیل [illegible]

سلوک کیا؟''

لڑکیاں ایک ایک کر کے جاگ اٹھیں۔ لیکن اس نے آنکھیں بند رکھیں۔ ملازم ناشتے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے تھے۔ کافی دیر کے بعد لڑکیوں نے اسے جگایا۔ اس کا دل اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا، لیکن وہ اٹھ گئی۔ لڑکیوں نے اس کا چہرہ دیکھا، تو حیران رہ گئیں۔ ''ارے کیا بات ہے نویرا، تمہارا چہرہ زرد ہو رہا ہے۔'' نغمہ نے پوچھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، واپس چلو! اس نے مضمحل لہجے میں کہا اور لڑکیاں پریشان ہوگئیں۔

ناشتہ بھی الٹا سیدھا کیا گیا، اور پھر وہ سب واپس چل پڑے، یہاں خوش خوش آئے تھے، لیکن اب فکرمند واپس ہو رہے تھے۔ راستے میں نویرا کو شدید بخار ہوگیا، شہر پہنچے تو سب نویرا کی بیماری کا سن کر پریشان ہوگئے، علی اکبر کے فیملی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اور اس نے انجکشن دے کر دوائیں لکھ دیں۔ اس نے صرف موسمی اثرات بتائے تھے۔ ''بوڑھیاں کہنے لگیں۔ کہ وہ پہلے ہی منع کر رہی تھیں کہ حویلی آسیب زدہ ہے، خواہ مخواہ بچیوں کو وہاں بھیج دیا۔''

خود علی احسن سخت پریشان تھے، تین دن تک وہ سخت بخار میں مبتلا رہی اور پھر ٹھیک ہوتی گئی، اس کا پھول کی طرح شگفتہ چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ ہنستی ہوئی آنکھوں میں غم کے سائے لہرانے لگے تھے۔

سب کا خیال تھا کہ وقتی بیماری کا نتیجہ ہے لیکن اس بات سے تو نویرا ہی واقف تھی۔ بڑی بوڑھیوں نے جھاڑ پھونک بھی کرائی تھی۔ لیکن بے سود، نویرا جسمانی طور پر صحت مند ہوگئی۔ لیکن اس کے ہونٹوں کی ہنسی واپس نہ آسکی۔ پہلے وہ ہر وقت لڑکیوں [illegible]

جاننے کی کوشش کی، لیکن زیادہ سوال و جواب پر نویرا جھنجھلا اٹھتی اور باہر نکل جاتی، خود علی احسن سخت پریشان تھے، آخر فیصلہ کیا گیا کہ فوری طور پر نویرا کی شادی کردی جائے، اور علی احسن نے اپنے اس خیال کا اظہار علی اکبر پر کردیا۔

''اگر حکم ہو تو میں شمشاد سے بات کروں؟'' اکبر علی نے پوچھا۔

''ہاں اکبر علی، تم اس کا برا بھلا خود سوچ سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں یہ کام جس قدر جلد ہو بہتر ہے؟''

''بہتر ہے بھائی جان، فکر نہ کریں۔'' اکبر علی نے کہا۔ اور پھر اس نے شمشاد سے بات کی، شمشاد کی تو دلی خواہش تھی اس نے منصور سے ذکر کیا منصور بھی اس حسن بے مثال کو دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے خاندانی حالات سے بھی بے حد متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے بھی آمادگی کا اظہار کردیا۔

اب صرف نویرا سے پوچھنا باقی تھا۔ چنانچہ سعدیہ خاتون نے یہ فرض براہ راست اپنے ذمہ لے لیا۔ انہوں نے نویرا سے پہلے منصور کے بارے میں گفتگو کی اور اسے بتایا کہ ''اس کا رشتہ منصور سے کیا جارہا ہے۔ اسے اعتراض تو نہیں ہے۔''

نویرا نے نہ اقرار کیا، نہ انکار ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ گئی۔ ''تمہاری خاموشی کو میں اقرار بھی سمجھ سکتی ہوں۔ بیٹی اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو مجھے اس وقت بتادو۔''

''جو چاہیں کریں می، میں کچھ نہیں کہہ سکتی!'' اس نے غم انگیز لہجے میں کہا۔ اور سعدیہ خاتون خاموش ہوگئیں۔ پھر گھر میں شادی کی دھوم دھام شروع ہوگئی۔ سب لوگ نویرا کی خاموشی کو بھول کر اپنی اپنی خوشیوں میں مصروف ہوگئے۔

علی احسن معمولی آدمی نہ تھے۔ شادی شایان شان سے کرنا چاہتے تھے۔ نویرا کی رشتہ دار لڑکیاں اسے چھیڑتیں، اس سے مذاق کرتیں، لیکن کوئی بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب منصور دولہا بن کر آیا۔ اور نویرا کو بیاہ کر لے گیا۔ دلہن بنی نویرا قیامت لگ رہی تھی۔ لیکن اس کا سوگوار چہرہ نہ جانے کون کون سی کہانیاں سنا رہا تھا۔ نویرا کو حجلہ عروسی میں پہنچادیا گیا اور منصور آرزوؤں اور مسرتوں کے طوفان میں گھرا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس نے دھڑکتے دل سے نویرا کا گھونگھٹ اٹھایا، اور اس پر قربان ہوگیا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر اس کی شریک زندگی اس کے سامنے تھی۔ اس کا سینہ مسرت سے پھٹا جارہا تھا۔ اس نے نویرا کو خود میں سمیٹ لیا، اور پھر......

جذبات میں ڈوبے ہوئے منصور کی بھیانک چیخ نے اس کے حواس معطل کردیئے۔ منصور اس سے علیحدہ ہوگیا۔ وہ ماہئی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اور وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم ہوا کہ کیا ہوگیا؟ وہ دروازہ بھی نہیں کھول سکی، اور پھر جب دروازہ توڑنے والوں نے اسے جھنجھوڑا تو وہ بے ہوش ہوکر گر گئی۔ اسے معلوم نہ ہوسکا کہ کیا ہوگیا؟

قیامت صغریٰ کے گزرنے کا اسے کوئی احساس نہ ہوا، اسے ہوش آیا تو اسپتال کے سفید بستر پر پڑی تھی۔ کافی دیر تک اس کا ذہن گم رہا اور پھر خیالات واپس آنے لگے، اس نے اپنی موجودہ حالت کے بارے میں سوچا اور پھر یاد کرنے لگی کہ اسے کیا ہوا تھا؟ وہ کیوں بے ہوش ہوئی تھی۔ کافی غور وخوض کے بعد اسے منصور یاد آیا، اور اس کے ساتھ ہی دوسری تمام باتیں بھی، اور وہ بے اختیار اچھل پڑی، اس نے سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

ایک آرام کرسی پر ایک نرس بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ ''نرس......!'' اس نے کمزور آواز میں پکارا اور نرس اچھل پڑی۔ وہ جلدی سے رسالہ رکھ کر اس کے پاس آگئی، اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''کیسی طبیعت ہے اب؟''

''ٹھیک ہوں، میرے گھر والوں میں سے کوئی ہے؟''

''ابھی چند منٹ قبل وہ لوگ گئے ہیں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک تھی بمشکل انہیں روانہ کیا ہے۔ ویسے تمہارے دو ملازم موجود ہیں۔''

''وہ...... وہ...... منصور صاحب آئے تھے؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''منصور صاحب! نرس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھل گئے۔ ''تمہارے شوہر ناں؟''

''ہاں!'' وہ بھی آئے تھے۔ اب چلے گئے ہیں۔'' نرس نے کہا اور دوسری طرف مڑ کر ایک شیشی سے کوئی شربت جیسی چیز نکالنے لگی۔ گلاس میں ڈال کر اس نے پانی ملایا اور پھر سہارا دے کر اسے اٹھایا اور شربت پلا دیا۔ پھر بولی۔ ''آرام سے سو جاؤ۔ تمہارے گھر والے شام کو آئیں گے۔''

''شربت، شاید کوئی خواب آور دوا تھی اس لئے وہ پھر سو گئی۔ اور دوسری بار جب وہ جاگی، تو اس کی والدہ سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کی نظروں نے منصور کو تلاش کیا، لیکن وہ نظر نہیں آیا۔

سعدیہ خاتون کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ایک خوفناک سناٹا ان کے چہرے پر تھا۔ لیکن وہ بھی اس قدر حواس میں نہیں تھی کہ ان کے تاثرات کو پہچان سکتی۔

ایک ہفتہ اسپتال میں رہنے کے بعد اسے چھٹی مل گئی اور پھر جس دن وہ گھر پہنچی اس دن ایک پولیس آفیسر اپنے ایک ماتحت اور احسن کے ساتھ اس سے ملنے آیا۔

''یہ میرے دوست ہیں بیٹی۔'' علی احسن نے پولیس آفیسر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارا بیان لیں گے؟''

''

کاوشش کے آثار پھیل گئے۔ ان کی مدد پولیس آفیسر نے کی۔ ''تمہاری سہاگ رات کو وہ تمہارے پاس آئے۔ اور پھر گھر والوں نے ان کی چیخ سنی۔ انہوں نے دروازہ پیٹا، لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا اور جب وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے، تو منصور دم توڑ چکے تھے، تم بھی بے ہوش ہو گئی، کیا تم ہمیں وہ حالات بتا سکتی ہو بیٹی جن کے تحت منصور کا انتقال ہوا تھا؟''

لیکن...... وہ کیا بتا سکتی تھی؟ اسے تو سکتہ ہو گیا تھا۔ منصور مر گئے، شادی کی پہلی رات شوہر مر گیا اور وہ زندہ تھی۔

ہفتوں اسے ہوش نہ رہا! وہ پاگل ہو گئی تھی۔ بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔ بال نوچتی تھی۔ علی احسن پر وطن آتے ہی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ بہت زیادہ گھبرا گئے تھے۔ لیکن مشیت ایزدی کے آگے......

یہ سب کچھ تو مقدر میں لکھا تھا۔ دولت مند آدمی تھے۔ اس لئے پولیس وغیرہ کے سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہوئے، اکبر علی نے بات برابر کر دی تھی۔ ویسے شمشاد کے گھرانے سے پوری طرح قطع تعلق ہو گیا تھا۔ شمشاد نوریا کو اپنے بیٹے کا قاتل سمجھتا تھا۔ حالانکہ منصور کی موت آج تک ڈاکٹروں کے لئے بھی معمہ تھی۔ وہ خود بھی معلوم نہیں کر سکے تھے کہ اس کی موت کی وجہ کیا ہوئی۔

کچھ ڈاکٹروں نے دبی زبان سے نوریا کا ڈاکٹری معائنہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، لیکن نوریا کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی کہ ڈاکٹر اپنی مرضی سے کچھ کرتے!

شمشاد نے اکبر علی سے پرانے تعلقات کا لحاظ

دور ہوا، تو اس کی دوسری شادی کے بارے میں سوچیں گے، آخر جوان لڑکی پوری زندگی تو اس طرح نہیں گزار سکتی تھی۔

لیکن ایک دن انہیں اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا! نوریا کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ یہاں تو معمولی معمولی بات پر ڈاکٹر آتے تھے۔ ایک بوڑھے اور تجربہ کار ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ اور پھر علی احسن کو بتایا کہ نوریا حاملہ ہے۔ یہ خبر علی احسن پر بجلی بن کر گری تھی۔ منصور اپنی نشانی نوریا کو سونپ گیا تھا اور اب نوریا آسانی سے شادی کے بندھن میں نہیں بندھ سکتی تھی۔ انہوں نے سعدیہ خاتون کو بھی یہ بات بتائی، اور وہ بے چاری بھی سر پکڑ کر رہ گئیں۔ نوریا کو بھی یہ بات معلوم ہوئی اور اس کا دل دہل گیا۔ تمام اس کو منصور سے منسوب کر رہے تھے۔ لیکن وہ کیا کرتی، وہ خود بھی تو اس ظالم کو نہیں جانتی تھی۔ جس نے رات کی تاریکی میں اسے لوٹ لیا تھا۔ اور اپنی منحوس نشانی اسے دے گیا تھا۔

☆......☆......☆

پھر نوریا کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ بچی کو دیکھ کر اس کی تمام نفرت زائل ہوگئی۔ وہ تو اس کے جگر کا ٹکڑا تھی۔ حسین اور معصوم کلی کی طرح، خاندان بھر میں بچی کے حسن کی شہرت ہوگئی۔ شمشاد کے گھر والے بھی خود کو باز نہ رکھ سکے، ان کے خیال میں یہ ان کے بیٹے کی نشانی تھی۔ چنانچہ وہ بچی کو دیکھنے آئے۔ اس کے لئے بہت کچھ لائے۔

بچی پرورش پانے لگی۔ علی حسن نے ایک آدھ بار دبی زبان سے نوریا سے بات کی، وہ اس کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن نوریا نے کہہ دیا کہ ”اگر آئندہ اس سے اس موضوع پر بات کی گئی تو وہ خودکشی کرلے گی۔“ اور اس کے بعد علی احسن خاموش ہوگئے۔ انہوں نے پھر کبھی یہ تذکرہ نہیں چھیڑا۔

نوریا نے خود کو بچی کے لئے وقف کردیا۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ رات کو نوریا بچی کے ساتھ سو رہی تھی۔ گہری نیند نجانے کیوں اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا ہاتھ بچی پر جا پڑا لیکن کوئی بجلی سی چیز اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکل گئی۔ یہ لجلجی چیز بچی کے جسم کا کوئی حصہ تو نہیں ہوسکتا تھا، اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر اس کی دلخراش چیخ نے دور دور تک سوتے ہوئے لوگوں کو جگادیا!

نوریا نے بچی کے سرہانے بیٹھے ہوئے سانپ پر زوردار ہاتھ مارا، اور وہ پٹ سے نیچے جاگرا، اور دوسرے لمحے نوریا نے بچی کو سینے سے لگالیا، گھر والے جب اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو نوریا بلک بلک کر روتے ہوئے بچی کے جسم کو ٹٹول رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ بچی کو سانپ نے ڈسا تو نہیں ہے۔ لیکن بچی محفوظ تھی۔

نوریا نے روتے ہوئے گھر والوں کو بتایا کہ ”اس نے بچی کے سرہانے ایک سانپ کو کنڈلی مارے بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔“ تو گھر والے بھی بوکھلا گئے۔ بھلا اس صاف ستھری حویلی میں، سانپ کا کہاں گزر؟ تاہم گھر کے ملازموں کی ایک ٹیم نے گھر کا ایک ایک کونا چھان مارا، لیکن سانپ ہوتا تو ملتا! اسے نوریا کا وہم سمجھا گیا، لیکن نوریا بتاتی تھی کہ اس نے پورے ہوش وحواس میں سانپ کو دوسری طرف پھینکا ہے۔

گھر والے خاموش ہوگئے۔ لیکن سعدیہ بیگم کو نوریا کے بیان پر یقین آگیا۔ لیکن اب ان کے سامنے دوسری صورتحال تھی۔ نوریا خاندان کی کسی تقریب میں شریک نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ سب چاہتے تھے وہ گھلے ملے۔ لیکن نوریا کا دل بجھا ہوا تھا۔

بہرحال ایک دن تنزہ نے اسے مجبور کردیا کہ وہ خاندان کی ایک لڑکی کی منگنی کی رسم میں شریک ہو، نوریا نے بچی کا بہانہ کیا تو سعدیہ بیگم نے کہا۔ وہ سب کام چھوڑ کر بچی کو سنبھالیں گی۔ اور نوریا مجبوراً تیار ہوگئی۔

سعدیہ خاتون نے بچی کی ذمہ داری لی تھی۔ اس لئے انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی اسے تنہا نہ چھوڑا۔ اس وقت رات کے تقریباً نو بجے تھے۔ نوریا ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ بچی جھولے میں لیٹی ہوئی تھی۔

... اپنے ... پان بنا رہی تھیں۔ اچانک ان کی نگاہ جھولے پر پڑی۔ بچی قلقاریاں لگا رہی تھی۔

اچانک ان کی نگاہ جھولے پر پڑی تھی۔ لیکن اس کے ننھے، ننھے ہاتھوں میں جو چیز تھی اسے دیکھ کر سعدیہ خاتون کے اوسان خطا ہوگئے، ایک سیاہ چمکدار سانپ تھا۔ جو بچی کے قریب کنڈلی مارے بیٹھا تھا، اور بچی اس کے پھن اور اس کے جسم کے دوسرے حصوں سے کھیل رہی تھی۔

سروتا سعدیہ بیگم کے ہاتھ سے گر گیا! ''وہ ہائے میری بچی۔'' کہہ کر دل تھام کر رہ گئیں۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ سانپ پر حملہ کرتیں، ملازموں کو آواز دینے کی کوشش کی لیکن خوف کی وجہ سے آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سانپ کو دیکھتی رہیں۔

بچی سانپ سے کھیلتی رہی اور سانپ بھی اس سے انکھیلیاں کرتا رہا، پھر باہر نوریا کی آواز سنائی دی۔ وہ سعدیہ خاتون کو آواز دے رہی تھی۔ سانپ نے کنڈلی کھولی اور جھولے سے نیچے اتر گیا۔ پھر وہ رینگتا ہوا ایک نالی کے ذریعے باہر نکل گیا۔

سعدیہ خاتون کو پھر بھی نیچے اترنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور نوریا ہی اندر آ گئی۔ سانپ کے چلے جانے سے بچی رونے لگی۔ نوریا نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اور بچی خاموش ہوگئی۔ لیکن ماں کی حالت دیکھ کر نوریا حیران رہ گئی۔ ''کیا ہوا؟ کیا ہو گیا امی جان؟'' اس نے پوچھا۔

''لیکن سعدیہ بیگم ہوش و حواس میں کب تھیں۔ پھر جب ان کے اوسان درست ہوئے تو انہوں نے ماجرا بیان کیا۔ ''نجانے یہ کیا اسرار ہے امی جان؟ میری زندگی میں نہ جانے یہ سانپ کہاں سے آ گئے۔'' نوریا روتے ہوئے بولی اور کافی دن تک وہ سانپ ... کہ ...

سیدھے لوگوں کو دے دی لیکن کوئی کچھ نہ بتا سکا اور وقت کا چکر چلتا رہا!

☆......☆......☆

ماہ زیب چھ سال کی ہوگئی۔ وہ اسکول جانے لگی۔ انتہائی متین اور سنجیدہ فطرت لڑکی تھی۔ بہت کم بولتی تھی۔ بولتی تو انتہائی جامع بات کرتی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تقدس تھا۔ آنکھوں میں انتہائی عجیب کشش تھی۔ کوئی بھی اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے اسکول کی استانیاں تک ذہنی طور پر اس سے خوفزدہ رہتی تھیں۔ لیکن وہ بے حد نرم گفتار اور خوش اخلاق تھی۔

نوریا کی وہ بے پناہ عزت کرتی تھی۔ وہ آج تک نوریا کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔

ایک شام بادل گھرے ہوئے تھے۔ گھر کے سب لوگ ایک ہال میں جمع تھے۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ موسم کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بارش ہونے لگی۔ اور موسم بے حد نشیلا ہوگیا۔ ماہ زیب بھی ایک آرام کرسی پر دراز کھڑکی سے باہر ٹپکتی ہوئی بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً ریڈیو سے بین کی آواز نشر ہونے لگی کوئی ماہر فنکار بین بجا رہا تھا۔ انتہائی سریلی اور مدھر آواز تھی۔ ماہ زیب چونک کر ریڈیو کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کا سحر بڑھ گیا تھا، اور اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔

بین بجتی رہی، اب ماہ زیب باقاعدہ جھومنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں باقاعدہ بند ہونے لگی تھیں۔ ابھی کسی نے خاص طور پر اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی ...

ہوگئیں اور ماہ زیب نے آنکھیں کھول دیں، چند لحات وہ حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھتی رہی اور پھر ایک دم سنبھل گئی۔ اس کے چہرے کی شگفتگی بحال ہونے لگی۔

علی احسن کی نگاہ اس پر جا پڑی۔ ''ارے، کیا بات ہے ماہ زیب بیٹے؟ کیا تمہیں نیند آرہی ہے'' انہوں نے پوچھا۔ اور ماہ زیب نے چونک کر آنکھیں جیسے پھاڑ دیں۔ پھر وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

ماہ زیب بیس برس کی ہوگئی، اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ اور پراسرار ہوگئی تھی۔ وہ اب بھی اتنی ہی سنجیدہ اور پروقار تھی۔ اس کی آنکھوں کی کشش بے پناہ ہوگئی تھی۔ اس کے کالج کے لڑکے اور لڑکیاں اس سے بری طرح مرعوب تھے۔ جبکہ بذات خود اس کی ذات میں بے پناہ انکساری تھی۔ لیکن ایک بات اس میں خاص طور سے پیدا ہوگئی تھی۔ مہینے میں ایک ہفتے کی رات وہ گھر سے باہر گزارتی تھی۔ یہ بات تقریباً تین سال سے بلاناغہ ہو رہی تھی۔

پہلی بار جب وہ اپنی کار لے کر نکلی تھی، تو نوریا نے اس سے پوچھا کہ ''وہ کہاں جارہی ہے؟''

تو اس نے جواب دیا۔ ''آپ کو مجھ پر اعتبار ہے امی؟''

''ہاں......''

''میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔'' نوریا نے اس کی آنکھوں سے نظریں بچاتے ہوئے کہا۔

''میری التجا ہے امی، آئندہ آپ اس بارے میں نہ پوچھیں، یا پھر آپ کو یہ کہنا ہوگا کہ آپ میرے کردار کو کمزور سمجھتی ہیں۔''

اور نوریا کبھی یہ بات نہ کہہ پائی۔ اس کے بعد ہر ماہ کے آخری ہفتے نوریا کار لے کر نکل جاتی، اور جب واپس آتی تو بہت خوش و خرم ہوتی۔

علی احسن نے اپنے ذرائع سے یہ بات معلوم کی کہ وہ ہفتے کی رات کو کسی سہیلی کے ہاں نہیں جاتی، یہ وہ نہ معلوم کرسکے کہ وہ کہاں جاتی ہے اور یہ سلسلہ بدستور جاری تھا۔

پھر ماہ زیب میں ایک اور تبدیلی آئی، اسے بین بجانے کا شوق چرایا۔ وراس نے نوریا سے کہا کہ ''وہ کسی ماہر بین کار سے بین بجانا سیکھنا چاہتی ہے۔'' اس کے اس شوق کو بھی حیرت سے دیکھا گیا۔ لیکن بہرحال اس کا شوق پورا کردیا گیا، اور ماہ زیب بین بجانا سیکھنے لگی۔ خود بین کار بھی اس کی صلاحیتوں پر حیران تھا۔ چند ہی ماہ میں ماہ زیب اس کام سے فارغ ہوگئی۔ اور اب اکثر رات کی خاموشیوں میں کبھی اس کے کمرے سے بین کی آواز بلند ہونے لگتی اور یہ آواز ایسی پرفسوں ہوتی کہ گھر کے دوسرے لوگ بھی ساکت رہ جاتے!

ایک شام ہفتے کا دن تھا، اور ماہ زیب گھر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ علی احسن، نوریا اور سعدیہ خاتون کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سردی سخت تھی۔ اور آتش دان میں کوئلے سلگ رہے تھے کہ علی احسن نے کہا۔ ''اتنی سخت سردی ہے نہ جانے ماہ زیب کہاں ہوگی؟''

''میں بہت دن سے ایک بات سوچ رہی ہوں اس لئے نہیں کہہ سکی کہ نوریا تم کو بری نہ لگے۔'' سعدیہ خاتون نے کہا۔

''کیا بات ہے اماں کہیے!'' نوریا نے حیرت سے کہا۔

''ماہ زیب ماشا اللہ جوان ہوچکی ہے۔ ہم جانتے ہیں۔ وہ بے حد نیک ہے، باوقار ہے، اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کا کردار چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ لیکن وہ جوان ہے۔ اسے گھر کی زینت بننا ہے اس لئے اس کا یوں غائب رہنا، کسی طور مناسب نہیں ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہے، وہ کہاں جاتی ہے، ایسی شکل میں لوگ انگشت نمائی کرسکتے ہیں، میں چاہتی ہوں نوریا کہ ماہ زیب کی شادی کردی جائے۔'' اور نوریا کو اپنی جوانی کا تجربہ یاد آگیا۔ وہ ہیجانی انداز میں کھڑی ہوگئی۔

''ہاں امی...... اس کی شادی کردینی چاہئے فوراً!

ہے چاہیے۔ پاپا آپ اس کے لئے رشتہ تلاش کریں۔ میں فوراً اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس سے معلوم تو کرلو بیٹی؟"

"میں معلوم کرلوں گی۔ آپ انتظام کریں۔ وہ مجھ سے سرتابی نہیں کرسکتی، بس آپ اس کے لئے رشتہ تلاش کریں۔"

"انشاءاللہ ماہ زیب جیسی لڑکی کے لئے بے شمار رشتے مل جائیں گے۔" دوسرے دن حسب معمول ماہ زیب ہشاش بشاش واپس آئی، ماں سے بے حد محبت کرتی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد نوریا میز سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "ماہ زیب! میرے کمرے میں آؤ، میں انتظار کررہی ہوں۔" اور ماہ زیب حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ نوریا نے اس سے پہلے کبھی اس لہجے میں گفتگو نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نوریا کے کمرے میں پہنچ گئی اور ماں کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں تمہاری شادی کرنے کا فیصلہ کرچکی ہوں۔" نوریا نے کہا۔ یہ سن کر ماہ زیب چونک پڑی۔

"لیکن امی اس کی ضرورت ابھی کیوں پیش آگئی؟"

"یہ میں جانتی ہوں۔ کیا تم مجھ سے انحراف کرو گی؟" نوریا نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں امی لیکن...... لیکن......؟" ماہ زیب پریشانی سے بولی۔

"صرف میری بات کا جواب دو تمہیں اعتراض ہے؟"

"مگر میری بات تو سنیں امی......!"

"تم ... میری ..."

نوریا دانت بھینچ کر بولی۔ "تمہیں میری بات ماننی ہوگی۔ میں بہت جلد تمہارا رشتہ طے کردوں گی۔ تمہیں صرف یہ رعایت دی جاتی ہے کہ اگر تمہارے ذہن میں کوئی ہے تو اس کے بارے میں مجھے بتادو۔"

"میرے ذہن میں جو کوئی ہے آپ اس سے میری شادی نہیں کرسکتیں۔ اس لئے آپ کا جو دل چاہے کریں۔ میں آپ کو انتباہ کرچکی ہوں۔"

نوریا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں کسی انتباہ کی پرواہ نہیں کرتی، تمہیں میری مرضی کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔" نوریا کے ذہن میں تو لاوا کھول رہا تھا وہ پرانی حویلی کی داستان نہیں دہرانا چاہتی تھی۔

"میں نے آج تک آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کی ہے امی!" اس بار ماہ زیب کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ نوریا نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ ماہ زیب مسکرارہی تھی۔ ایک انتہائی عجیب اور پراسرار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔

"مجھے اجازت ہے امی؟" اس نے نرم اور شیریں لہجے میں پوچھا۔ اور نوریا نے سر ہلادیا۔ وہ ماہ زیب کی پراسرار مسکراہٹ میں الجھ گئی تھی اور پھر اس رات ماہ زیب کے کمرے سے تقریباً آدھی رات تک بین کی آواز سنائی دیتی رہی، لیکن حسب معمول اس کے معمولات میں کسی نے دخل نہ دیا۔

☆......☆......☆

علی احسن کا گھرانہ اب بھی اتنا ہی مقبول تھا۔

...

سے ملنے کی آزادانہ اجازت تھی۔ اور وہ اکثر بیشتر ملنے کے مواقع نکال لیتا تھا۔

لیکن ماہ زیب اس سے عام انسانوں والا سلوک کرتی، اس کی نظروں میں ناصر رضا نے کبھی اپنے لئے کسی قسم کے جذبات نہیں دیکھے، اور روکھائی سے وہ بہت متاثر ہوگیا۔

گھر والے شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس نے ان تیاریوں میں دخل تو نہ دیا، لیکن ایک دن اس نے ماہ زیب کو یونیورسٹی سے نکلتے ہوئے جالیا۔ ''میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، ماہ زیب ..... کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے سکتی ہیں؟''

''چلئے!'' ماہ زیب نے کہا، اور وہ ایک چھوٹے سے لیکن خوب صورت کافی ہاؤس میں آبیٹھے۔ ''آپ کو علم ہے مس ماہ زیب، کہ مجھے آپ کے لئے منتخب کرلیا گیا ہے؟ آپ کو دیکھنے کے بعد میں آپ کو پسند کرنے لگا ہوں، لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ میری طرف ملتفت نہیں ہیں۔ میں زندگی کے طویل فاصلے طے کرنے کے لئے ذہنی ہم آہنگی کا قائل ہوں، کسی کو مجبور کرنا میری فطرت نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے پسند نہیں کرتیں تو میں وضع داری سے آپ کے راستے سے ہٹ جاؤں گا، اور ایک اچھے دوست کی طرح آپ کو اپنی راہ متعین کرنے کا موقع دوں گا، کیا آپ میرے سوال کا جواب دینا پسند کریں گی؟''

''آپ نے مجھ سے یہ سوال کرکے اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کا خیال درست ہے۔ میری شادی زبردستی کی جارہی ہے۔ براہ کرام فوراً اس شادی سے انکار کردیں، میرے ضدی گھر والوں کو تو کچھ نہ ہوگا، لیکن آپ کے گھرانے کو ایک زبردست المیہ برداشت کرنا پڑے گا۔''

''میں نہیں سمجھ سکا؟'' ناصر رضا نے حیرت سے کہا۔

''براہ کرم اس سے زیادہ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کریں۔ آپ کو آپ کے سوال کا جواب مل گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے مس ماہ زیب، شکریہ!'' ناصر ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا، اور پھر اس نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ اس نے شادی سے انکار کردیا تھا۔ علی احسن بے حد چراغ پا ہوئے، خود ناصر کے گھر والوں نے اس کی زندگی تلخ کردی، لیکن اس نے کسی کو کچھ نہ بتایا اور صاف کہہ دیا، کہ وہ شادی نہیں کرے گا!

ناصر تو ماہ زیب کے راستے سے ہٹ گیا لیکن ناصر کی طرح معین فراخ دل نہ تھا۔ وہ تو ماہ زیب کو دیکھتے ہی مرمٹا تھا۔ ماہ زیب نے اس سے بھی ملاقات کرکے اسے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن معین انجینئر تھا، مشینوں سے کھیلنے والا، اسے بھی مشین سے زیادہ سمجھنے پر تیار نہ ہوا، اور معین کے ساتھ ماہ زیب کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی، ماہ زیب کے اہل خاندان بارات کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن وقت گزر گیا۔ بارات نہ آئی۔ پھر معین کے چاچا کا فون آیا۔ انہوں نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بتایا کہ معین ایک حادثے کا شکار ہوکر دنیا سے رخصت ہوگیا۔

معین کو سانپ نے ڈسا تھا۔ ڈاکٹروں نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔

کافی دن تک گھر میں خاموشی رہی، تقریباً تین ماہ کے بعد پھر ماہ زیب کے لئے ایک رشتہ آیا۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ گھر والے جو پہلے واقعے سے دل گرفتہ تھے اور سوچ رہے تھے کہ شاید اب ماہ زیب کے لئے کوئی رشتہ نہیں آئے گا۔ اس رشتے سے بہت خوش ہوئے۔

بہرحال رشتہ طے ہوگیا۔ ماہ زیب پراسرار طور پر خاموش تھی، اور پھر وہ دن بھی قریب آگیا۔ جب منگنی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ علی احسن خوشی خوشی تمام کاموں میں مصروف تھے۔ ان کے دوسرے رشتہ داروں نے بھی ان کی ہر کام میں مدد کی تھی۔ اب سب اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ''کیا ہماری بیٹی بھی اس رشتے سے خوش ہے؟''

علی احسن کے بہنوئی نے براہ راست ماہ زیب سے سوال کیا، اور وہ چونک کر نہیں دیکھنے لگی؟ اور پھر ماہ

زیب کی آواز نے سب پر سکتہ طاری کر دیا۔

''میں اس رشتہ سے خوش نہیں ہوں، میں ای کو بتا چکی ہوں کہ میں نے زندگی کا ساتھی منتخب کر لیا ہے، لیکن ضد کی جا رہی ہے کہ میں اس کے بارے میں بتاؤں، میں جانتی ہوں کہ آپ لوگ اس کی شخصیت کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس لئے میرے لب خاموش ہی رہنے دیجئے، آپ انسانی زندگیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں، میں بے قصور ہوں، اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں بتا دوں کہ معین کی موت کی ذمہ داری صرف آپ لوگوں کے سر پر ہے۔ اور اب اس لڑکے کی زندگی بھی آپ لوگوں کی وجہ سے ضائع ہوگی۔''

تمام لوگ ہُقر کے بت بن گئے تھے۔ ماہ زیب خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی، علی احسن کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور وہ ایک ایک کی شکل دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔ ''کیا کہہ گئی ہے یہ لڑکی؟ یہ کیسا انکشاف کیا ہے اس نے؟ کیا راز ہے؟ الٰہی یہ کیا راز ہے؟ مجھے بتاؤ نویرا، یہ کیا راز ہے؟''

''لیکن نویرا کچھ نہ بتا سکی، وہ حیرت سے بت بن گئی تھی۔

''ہمیں خود اس راز کا پتہ چلانا پڑے گا۔ ہمیں اس کے الفاظ کی حقیقت تلاش کرنا پڑے گی۔ ماہ زیب کی زندگی سانپوں سے اس قدر قریب کیوں ہے؟ اور وہ قدم قدم پر ہمیں سانپوں سے قریب نظر آتی ہے، کیا آپ بھول گئیں؟ بیگم کہ بچپن سے اب تک ہم نے اسے سانپوں سے قریب دیکھا ہے، اس کے سرہانے سے ملنے والا سانپ، جو نویرا نے دیکھا تھا۔ جھولے میں نظر آنے والا سانپ، جو آپ نے خود دیکھا تھا، ماہ زیب کا

ہمارے خاندان پر؟'' علی احسن کی آواز بھرا گئی۔

''اس نے کہا تھا۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی اور اگر ضد کی گئی تو جو کچھ ہوگا، اس کی ذمہ دار آپ ہوں گی۔ اس نے کہا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی ہے۔ آپ اس سے میری شادی نہیں کر سکتیں۔'' نویرا نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''کیا کروں؟ بتاؤ اب میں کیا کروں۔'' میری عزت تو خاک میں مل چکی ہے۔ اب میں اس گرتی ہوئی عزت کو کیسے سنبھالوں؟ کچھ بھی ہو جائے...... کچھ بھی ہو جائے، وہی ہوگا، جو ماہ زیب چاہتی ہے، بالکل وہی ہوگا لیکن اسے بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے؟ جس سے وہ شادی کرنا چاہتی ہے اسے بتانا ہوگا ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں ابھی شادی کی ڈیٹ بڑھا دیتا ہوں۔''

پوری رات گھر بھر کے لوگ نہیں سوئے! علی احسن نے سب کچھ کنٹرول کر لیا تھا۔ لیکن اگلے دن انہوں نے ماہ زیب کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ باقی تمام لوگ بھی موجود تھے۔ سب ماہ زیب کو خشمگیں نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ البتہ ماہ زیب کا چہرہ پرسکون تھا۔ ''تمہیں بتانا ہوگا، تم کسے پسند کرتی ہو؟ میں ایک ہفتہ کے اندر تمہاری شادی کر دینا چاہتا ہوں۔''

''براہ کرام اس سلسلہ میں نہ پوچھیں نانا جان...... میں نہ بتا سکوں گی۔'' اس نے کہا۔

''تجھے بتانا ہوگا، کہ تو کیا گل کھلاتی رہی ہے؟ تو اس گھر کی عزت کو اس طرح نہیں اچھال سکتی...... بول تو ہر ہفتہ کی رات کو کہاں رہتی ہے؟ کیا اپنے عاشق کے

آبائی ہے۔" ماہ زیب نے جواب دیا۔
اور علی احسن منہ پھاڑ کر رہ گئے۔ "کہاں..... کیا مطلب..... وہ..... وہ حویلی تو سنسان پڑی ہے۔ وہاں تو کوئی نہیں رہتا!"
"وہ رہتا ہے، اس کے دوسرے عزیز رہتے ہیں۔ سب رہتے ہیں۔ میں ہفتے کی رات سے اتوار تک وہاں رہتی ہوں۔ وہاں سب ہیں میرا باپ بھی وہیں موجود ہے۔"
"کیا تو پاگل ہوگئی ہے؟" علی احسن حلق پھاڑ کر چیخے۔
"نہیں..... درست کہہ رہی ہوں۔ کیا آپ میرے محبوب سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ضد کررہے ہیں تو میں آج آپ کو اس سے ملا ہی دوں۔" ماہ زیب نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔ پھر بولی۔ "میں ابھی واپس آتی ہوں۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔
اور علی احسن ایک ایک کی شکل دیکھنے لگے۔ سب کے چہرے دھواں ہورہے تھے۔ "کیا سچ مچ یہ لڑکی پاگل ہوگئی ہے؟ پرانی حویلی میں کون رہتا ہے؟ کیا وہ خالی نہیں پڑی ہے؟"
کسی نے جواب نہ دیا، اور چند منٹ کے بعد ماہ زیب واپس آگئی۔ لیکن اسے دیکھ کر سب چونک پڑے۔ اس نے سپیرن کا لباس پہنا ہوا تھا، اس کے ہاتھوں میں دودھ کے دو پیالے تھے۔ گردن میں بین لٹک رہی تھی۔ نیم عریاں لباس میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس نے دونوں پیالے زمین پر رکھ دیئے۔ اور پھر گلے میں پہنا ہوا پھولوں کا ہار پیالوں کے قریب رکھ دیا، اس کے چہرے پر عجیب سی مستی رچی ہوئی تھی۔ پھر اس نے بین اتار کر ہونٹوں سے لگائی، اور چند لمحات کے بعد کمرے میں بین کی آواز گونجنے لگی۔ انتہائی مست کن آواز، جو لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہورہی تھی۔ وہ سب پتھروں کے بت معلوم ہورہے تھے، اور بین کے سر تیز ہوتے جارہے تھے۔ ماہ زیب جھوم جھوم کر بین بجا رہی تھی۔

پھر دروازے سے ایک سیاہ رنگ کا ناگ اندر آگیا۔ اور اس کے گرد کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ ماہ زیب کی آنکھوں کی مستی کچھ اور بڑھ گئی تھی اور بین کے سر طوفانی ہوگئے تھے۔ وہ بین بجاتے ہوئے سانپ کے گرد ناچ رہی تھی۔ اس طرح کافی دیر گزر گئی اور پھر ماہ زیب نے بین بند کردی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بین زمین پر رکھ دی۔
اور علی احسن کی طرف مڑ کر بولی۔ "آپ نے دیکھ لیا۔ میرے محبوب کو نانا جان! یہ میرا محبوب ہے جس سے میں نے جنم جنم کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہے۔ ہم آپ کی دنیا کے انسان نہیں ہیں نانا جان! ہماری حقیقت آپ کو معلوم ہوگئی، اب ہمیں اجازت دیں۔ میں اپنے محبوب اپنے شوہر کے ساتھ جارہی ہوں۔" اور پھر سانپ کے برابر میں ماہ زیب زمین پر لیٹ گئی اور اس کا جسم گھٹنے لگا، اس سے ایک لطیف دھواں سا خارج ہورہا تھا، اور چند لمحات کے بعد وہ ایک چمکدار ناگن بن گئی۔ اس کے بعد دونوں رینگتے ہوئے باہر نکل گئے۔
"ماہ زیب..... میری بچی..... لوٹ آ میری بچی..... لوٹ آ.....!" نوریا پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی سانپوں کے پیچھے دوڑی، لیکن باہر کچھ نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

"ہمیں یہ راز معلوم کرنا ہوگا، پرانی حویلی آسیب زدہ ہے، لیکن..... لیکن یہ سب کچھ کیا ہوگیا؟ ہم برباد ہوگئے سعدیہ..... بتاؤ..... ہم اب کیا کریں؟" احسن پاگلوں کے سے انداز میں کہہ رہے تھے۔
نوریا نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا تھا۔ وہ بار بار ماہ زیب کو آوازیں دیئے لگتی تھی۔
"چلو..... سعدیہ ہم پرانی حویلی چلتے ہیں۔ چلو نوریا کو تیار کرو۔" اور سعدیہ بیگم آنسو بہاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
تھوڑی دیر کے بعد علی احسن کی کار جمال پور جارہی تھی۔ جمال پور کی حویلی اسی طرح ویران تھی۔ وہ تینوں پاگلوں کی طرح پوری حویلی میں مارے مارے

پھرتے رہے، نوریا بار بار ''ماہ زیب...... ماہ زیب'' چلانے لگتی، ماں باپ بڑی مشکل سے اسے سہارا دیئے ہوئے تھے۔

آخر تھک ہار کر وہ حویلی کے ایک کمرے میں آبیٹھے۔ اور علی احسن بولے۔ ''ہم یورپ واپس چلیں گے سعدیہ، ہم راس وطن ہمیں راس نہیں آیا، ہم نے جس دن سے وطن میں قدم رکھا ہے، دکھ اٹھا رہے ہیں، اب ہم مزید دکھ برداشت نہیں کر سکتے۔'' وہ بلکنے لگے۔

اور...... اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور سب چونک پڑے۔ ''کون ہے؟ یہاں اس ویران حویلی میں کون آگیا؟'' علی احسن بولے۔

اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتے دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ جسم نیم برہنہ تھا۔ اور آنکھوں میں غار تھے۔ ''کون ہو تم؟'' علی احسن اس کے مکروہ چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''آپ کی رعایا ہیں سرکار، پشتوں سے آپ کی رعایا ہیں۔ سینکڑوں سال سے یہاں رہ رہے ہیں حضور، میں آپ سے اپنی ایک بھول کی معافی مانگنے آیا ہوں، سرکار! مجھے معاف کر دیں۔'' اندھے نے کہا۔

''مگر تم کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتا!'' علی احسن بولے۔

''اسی حویلی میں رہتا ہوں سرکار! سینکڑوں سال سے اس حویلی میں رہتا ہوں، جانور ہوں، سرکار بس بھول ہوگئی۔ مگر اس میں ساری خطا میری نہیں تھی۔ بیس سال پہلے کی داستان ہے سرکار! صاحبزادی نوریا یہاں آئی تھیں، اپنی سہیلیوں کے ساتھ!

آدھی رات کو جب میں اپنا منکا اگل کر خوراک تلاش کر رہا تھا۔ مجھے اپنے منکے کے پاس آہٹ محسوس ہوئی اور میں جلدی سے اس کی طرف لپکا۔ اندھا ہوں سرکار! یہ نہ دیکھ سکا کہ کون ہے؟ بس میں اسے دشمن سمجھا، اور میں نے اس کی پنڈلی میں ڈس لیا۔ پھر اپنا منکا نگل لینے کے بعد میں نے اپنے دشمن کو محسوس کیا اور یہ معلوم کر کے سرکار کہ وہ کوئی عورت ہے، چاندنی رات تھی سرکار...... میں برداشت نہ کر سکا اور انسان کی جون میں آگیا، اور پھر میں نے صاحبزادی نوریا کا زہر چوس لیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا سرکار...... اس پر میں آج تک شرمندہ ہوں۔ میں نے نمک حرامی کی تھی سرکار! اور ماہ زیب میری ہی اولاد ہے۔

میں سانپ ہوں سرکار، اور سانپ کی اولاد سانپ ہی ہوتی ہے۔ ماہ زیب سانپ تھی۔ لیکن انسانی روپ میں پیدا ہوئی تھی۔ اس میں سانپ بن جانے کی شکتی موجود تھی۔ جب اسے پتہ چلا کہ وہ میری بیٹی ہے تو اسے مجھ سے محبت ہوگئی۔ وہ ہفتہ کی رات کو میرے پاس آتی رہی۔ یہیں اسے ہماری برادری کے ایک نوجوان سانپ سے محبت ہوگئی اور ان دونوں نے آپس میں شادی کرلی۔ میری اجازت سے سرکار۔ آپ جب چاہیں گے وہ آپ کے پاس انسانی روپ میں پہنچ جائیں گے۔''

شیطان صورت بوڑھے نے کہا اور پھر دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ ''ماہ زیب بیٹی اور مہتاب...... آؤ...... اندر آجاؤ'' اور ماہ زیب ایک خوب صورت نوجوان کے ساتھ اندر آگئی۔ نوجوان بہت حسین تھا۔ ماہ زیب اور نوجوان، نوریا، سعدیہ خاتون اور علی احسن کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ وہ تینوں انسان اس حیرت کدہ میں بت بن گئے تھے۔

علی احسن اور سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بیٹی اتنا عرصہ ایک دکھ چھپاتی رہی تھی۔ اور وہ انجان تھے۔

نوریا کو یوں لگ رہا تھا جیسے کہ وہ آج دوبارہ عریاں کی گئی ہے۔ وہاں موجود جانوروں اور انسانوں میں بیس سال کا طویل عرصہ حائل تھا۔ وہ سب سر جھکائے کھڑے تھے۔

پرانی حویلی کی ویرانی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ سب کچھ واضح لیکن ناقابل یقین تھا۔

موت کا سایہ

راحل بخاری۔محبوب شاہ

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پورے گاؤں پر مسلط تھا کہ اتنے میں ایک سایہ نمودار ہوا اور ایک سمت بڑھنے لگا تھوڑی دور جا کر ایک گھر کے سامنے رک گیا اور پھر دیوار سے پار ہو کر کمرے میں لیٹی خوبرو حسینہ پر نظریں مرکوز کردیں اور پھر……

ایک روح کی محبت کی انمٹ کہانی…… جسے پڑھنے والے اپنے ذہن سے کبھی محو نہ کرسکیں گے

رات گہری اندھیری تھی۔ آسمان پہ بادلوں کا بسیرا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی کو بھی بادل چھپائے ہوئے تھے۔ گھروں کے ہیولے تاریکی میں عفریتوں کی مانند دکھتے تھے۔ گاؤں سے کچھ دور گھنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا، جھنڈ جو کہ تقریباً ایک ایکڑ پر محیط تھا۔ وہاں جنگلی کیکر اور دیگر درخت تھے۔ اس جھنڈ سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ اس کا لبادہ اس وقت سیاہ لگ رہا تھا۔ وہ تیز مگر محتاط انداز میں چلتا ہوا گاؤں کی طرف رواں دواں تھا۔ گاؤں میں پہنچتے ہی وہ ایک گھر میں داخل ہوگیا۔ دروازہ اس کی راہ میں حائل نہ ہوسکا، ایسا لگتا تھا کہ وہ لکڑی کا ٹھوس دروازہ نہیں، بلکہ ہوا کا جھونکا ہو۔ سایہ اندر جا کر برآمدے میں کھڑا ہوگیا۔ کمرے میں روشنی تھی جبکہ برآمدہ نیم روشن تھا۔

سایہ یکلخت کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس بار بھی دروازہ نامی کوئی شے اس کی راہ میں حائل نہ ہوسکی تھی۔ بیڈ پہ محوخواب ایک نوعمر لڑکی تھی۔ سائے نے اپنے ہاتھ اس کی گردن پہ جمادیئے۔

لڑکی تڑپی...... بری طرح تڑپی......''آخر جان آسانی سے تو نہیں نکلا کرتی نا!'' اس لڑکی نے بھی زندہ رہنے کے لئے بہت ہاتھ پیر مارے وہ ابھی زندہ رہنا چاہتی تھی، مرنا نہ چاہتی تھی۔ ورنہ ہر انسان خود کو فرعون سمجھتا ہے اور......

خیر لڑکی کی جان بہت مشکل سے نکلی مگر نکل گئی۔ اس کے گلابی چہرے پہ موت کی زردی چھا گئی اور آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔ سایہ نے جب اس کی موت کا یقین کرلیا تو ایک جھٹکے سے واپس پلٹ گیا۔ اب کی بار اس کی چال میں فاتحانہ پن در آیا تھا۔

رسم سجدہ بھی اٹھادی ہم نے
عظمت عشق بڑھادی ہم نے
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگادی ہم نے
ایک ہی بس میں تھی تدبیر ہمارے
وہ بھی تقدیر کے پہلو میں سلادی ہم نے
اک اک پھول بہت یاد آیا
شاخ گل جب وہ جلادی ہم نے
شہر جاں راکھ سے آباد ہوا
آگ جب دل کی بجھادی ہم نے
آج پھر وہ بہت یاد آیا
آج پھر اس کو دعا دی ہم نے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹادی ہم نے؟
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے......؟

وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ سورج کی درماندہ کرنیں درختوں کی شاخوں سے، چھن چھن کر اس کے وجود پر دھبوں کی صورت بکھری تھیں۔ اس کی گہری، بھوری آنکھیں سامنے ایک بہت موٹے کیکر کے تنے کو گھور رہی تھیں۔ اس کی نظروں کی گرمی تھی یا کوئی اور بات کہ تنے میں شگاف سا پڑ گیا۔ اس شگاف میں سے دھواں اٹھنے لگا۔ سفید دھواں...... اس دھویں نے فضا کو گھٹن یا حبس عطا کرنے کے بجائے ایک عجیب مگر مسحور کن مہک عطا کی تھی۔ ایک ایسی مہک جو روح تک کو مہکا ڈالے...... اس کے قدم میکانکی انداز میں اس درخت کی طرف اٹھنے لگے...... وہ مشینی انداز میں چل رہا تھا۔

درخت کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اگ آئے...... اس نے دلیاں ہاتھ شگاف میں ڈال دیا۔ اس کے چہرے پہ حیرت یا تجسس کا شائبہ تک نہ تھا۔ گویا اسے بخوبی علم ہو کہ کیا ہونے والا ہے...... اسے واقعی بخوبی علم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ باہر نکالا...... اس کے ہاتھ میں موجود شے کو دیکھ کر سارے کے سارے درخت تھرا اٹھے۔ ان کا کلیجہ دہل گیا اور دل ہول گیا تھا وہ اس شے کو ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ اس کا پورا جسم ہی لرز رہا تھا۔ اور بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ دکھ، اذیت، درد، تکلیف، کرب، غم، پچھتاوا اور فراق رقم تھا...... اور ان میں سے کوئی ایک شے ہی ہمیں لاحق ہو، تو بھی رلاتی ضرور ہے۔ اور اس کے پاس تو وہ سب چیزیں ''یکجا'' تھیں۔ اس کا رونا تو بنتا ہی تھا۔ اس نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اس شے کو محبت اور عقیدت سے آنکھوں سے لگایا اور...... رونے لگا۔

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ اس کا دکھ لامتناہی ہے۔ اس کا نقصان ناقابل تلافی ہے...... اور ایسا ہی تھا۔ ایسا ہی تو تھا...... اس کا دکھ لامتناہی تھا۔ اور اس کا نقصان ناقابل تلافی تھا......

وہ رو رہا تھا۔ کیونکہ وہ رونے کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اور جن کے پاس رونے کے علاوہ اور کچھ کر نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ روتا ہی رہتا ہے۔ اس کو پھر یہی بات ہمیشہ رلاتی ہے کہ اس کے پاس آنسوؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا۔ ایسے لوگ پھر یا تو دوسروں کے آنسو پونچھتے ہیں کہ ہم رو رہے ہیں، کم از کم دوسرے تو خوش رہیں۔ یا پھر یہ سوچ کر دوسروں کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر دیتے ہیں کہ ہم رو رہے ہیں تو دوسرے کیوں خوش رہیں۔ ان کو بھی رونا

چاہئے۔ سب کو رونا چاہئے۔

اس کا شمار بھی آخرالذکر میں ہوتا تھا۔ اگر وہ رویا تھا تو تو...... پھر کسی اور کو بھی کوئی حق نہ تھا کہ وہ زندہ رہے اور خوش رہے...... اگر اس کی زندگی برباد ہوئی تھی تو پھر سبھی کو برباد ہونا چاہئے اوروں کو بھی آباد اور خوش رہنے کا حق کیوں؟ آخر کیوں؟ وہ اٹھا...... ہاتھ میں موجود شے کو اس نے اس احتیاط سے واپس شگاف میں رکھا کہ گویا ذرا سی ٹھیس بھی اسے ریزہ ریزہ کردے گی۔

اس کے ہاتھ باہر نکالتے ہی شگاف مل گیا۔ جیسے یہ جگہ تو ہمیشہ سے پر تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں دہکنے لگی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اور "رات" کا انتظار کرنے لگا۔ وہ رات جو اس کی خوشیوں کو کھا گئی تھی۔ وہ رات اب دھیرے دھیرے سب کو کھائے گی۔ ہاں ضرور کھائے گی۔ اس نے ایک عزم سے سوچا۔ اس کے ارادوں میں پختگی تھی، ہٹیلی عزم...... پہاڑوں کی سی پختگی......!!!

☆......☆......☆

شام دھیرے دھیرے رخصت ہورہی تھی۔ اس کے وجود میں تاریکی کے نیزے اترتے جاتے تھے۔ اس کا سرمئی وجود نیزوں کے زخموں سے سیاہ ہونے لگا تھا اور پھر شام ساری کی ساری سیاہ ہوگئی۔ اس نے رات کا سیاہ لباس پہن لیا تھا۔ آج آسمان پہ بادل نہیں تھے۔ آسمان ستاروں سے سجا، روشن تھا مگر اس کی سجاوٹ میں ابھی ایک کمی تھی اور وہ کمی چاند کی تھی۔ چاند ابھی کہیں چھپا ہوا تھا۔

سارہ نے آنکھیں میچ کر ایک گہری سانس اپنے اندر اتاری، وہ اپنے ابا کو کھانا دے آئی تھی اور اب چائے بنانے کے ارادے سے کچن میں جارہی تھی۔ اس کا ارادہ صبح کے لئے کھیر بنانے کا بھی تھا۔ ابا کھیر شوق سے کھاتے تھے۔

سارہ نے دنیا میں خون کا ایک ہی رشتہ دیکھا تھا۔ صرف ابا ہی تھے۔ امی اسے پیدا کرتے ہی چل بسی تھیں اور کوئی رشتے دار نہ ہونے کے باعث پچھلے کچھ عرصے سے ابا بہت بیمار رہنے لگے تھے اور اس کے لئے فکرمند بھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کردیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے ایک دوست کے توسط سے آئے رشتے کو تقریباً سلکیٹ بھی کرلیا تھا۔ لڑکا علی شیر اچھا سلجھا اور تعلیم یافتہ تھا۔ اس کی اپنی زمین تھی۔ اور وہ خود ہی کاشت کرتا تھا۔ اچھی خاصی آمدن تھی۔ گھر میں صرف ماں ہی تھی۔ ایک بہن تھی جو کہ شادی شدہ تھی۔ رشتہ تقریباً فائنل تھا۔

سارہ چائے کے لئے کپ نکالنے لگی تھی کہ کھٹکے پہ اس نے مڑکر دیکھا اور اس کی گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ آنے والے نے اس کی چیخ کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا اور اس کی مزاحمت کی پرواہ کئے بغیر اس وقت تک دبائے رکھا، جب تک اس کی سانس دم نہ توڑ گئی۔ پھر...... وہ اطمینان سے پلٹا اور باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

ہوا بھی تیز تھی اور پار بھی اترنا تھا
سفر بھی ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں کرنا تھا
وہ کون لوگ تھے، ان کا پتہ تو کرنا تھا
ہمارے لہو میں نہا کر جنہیں نکھرنا تھا
مقدر ایک ہی لمحے کی بادشاہی تھی
پھر اس کے بعد نہ جینا تھا، نہ مرنا تھا
عجب عذاب تھی ہذب و شعور کی ساعت
خطا بھی کرنی تھی، انجام سے بھی ڈرنا تھا
نگاہ نے وہی دیکھا، جو دیکھنا چاہا
کمال دید تو آنکھوں پہ دھرنا تھا
پسند مجھ کو نہ تھے ٹوٹتے ہوئے تارے
میں سوگیا، مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا
یہ تم نے انگلیاں کیسے فگار کرلیں اپنی؟
مجھے تو خیر لکیروں میں رنگ بھرنا تھا
یہ کیا......؟ کہ لوٹ بھی آئے سراب دیکھ کے لوگ
تشنگی وہ تھی، کہ پاتال تک اترنا تھا
تمام عمر کی تشنہ تھی نہ ڈھونڈ سکی
اسی جلتے ہوئے صحرا میں ایک جھرنا تھا
ہزار سال سے عالم فراق میں ہوں......
ٹھہر گیا ہے وہ لمحہ، جسے گزرنا تھا......
وہی درخت ہیں، اور وہی منظر......
بکھر گئی ہے جو خوشبو، اسے بکھرنا تھا

شہروز عالم ایک ڈاکٹر تھا۔ ایک نوجوان ڈاکٹر...... اس کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔ باپ عالم بخت رئیس تھے۔ جدی پشتی رئیس...... شہروز بچپن ہی سے باہر یعنی شہروں میں رہا تھا۔ اور اب ڈاکٹری کی سند لے کر لوٹا تھا۔ ہاسپٹل میں تو نہیں مگر ایک کلینک اس نے بنالیا تھا۔ ہاسپٹل بنانے کا اس کا ارادہ تھا، مگر کچھ ارادے صرف ارادے ہی رہ جاتے ہیں۔ اس کو فراست ملی تو سوچوں پر ایک چاند چہرہ دستک دینے لگا۔ صوفیہ اس کی کزن تھی۔ اور منگیتر بھی، اس کی منگنی اس کی پسند سے ہوئی تھی۔ وہ فطرتاً حسن پرست تھا اور حسن صفیہ کے پاس بہت تھا۔ اسے کچھ عرصے سے صوفیہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگنے لگی تھی۔ اور کچھ دن تک اس کا شادی کا ارادہ تھا۔ وہ خوش تھا۔ وہ باہر نکلا اور اسی وقت اس پہ ایک سایہ جھپٹا، شہروز چیخ بھی نہ سکا۔ اگلے ہی منٹ میں ڈاکٹر شہروز عالم کسی بھی ڈاکٹر کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ سایہ مطمئن سا پلٹ گیا۔

☆......☆......☆

سعید آفندی ایک حساس نوجوان تھا۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے چھوٹا زید تھا اور اس کے بعد ثانیہ اور تانیہ تھیں۔ ابا بیمار رہتے تھے۔ یوں سعید کو اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ کر گھر سنبھالنا پڑا۔ ابا کی کریانے کی دکان تھی جو اب ایک جنرل اسٹور بن چکی تھی۔ اس نے شروع ہی سے سب گھر والوں کا بہت خیال رکھا تھا۔ کسی کی ذرا سی تکلیف بھی اسے اداس کر دیتی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے گاؤں میں ایک آفت نازل ہوئی تھی۔ کئی لوگ موت کا شکار ہو گئے تھے۔

اکثر لوگوں نے ایک سائے کو دیکھا تھا۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ "وہ سایہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتا ہے۔"

سعید کو یہ بات بہت دکھ دیتی تھی کہ بے گناہ لوگ مر رہے ہیں۔ اس نے اپنے ایک دوست شیراز کے توسط سے ایک عامل سے رابطہ کیا۔ "یہ عمل تم کو کسی جنگل وغیرہ میں کرنا ہے۔ تم کو بڑا ڈرایا جائے گا مگر تم نے کسی بھی حال میں دائرے سے باہر نہیں آنا ہے۔ سایہ جب آجائے گا تو آگے اس کا فیصلہ خود ہی کر لینا کہ اگر وہ واپس جاتا ہے تو ٹھیک، ورنہ پھر اس عمل کو گیارہ بار دہرا کر اس پر پھونک مارنا۔ وہ جل جائے گا......" سعید نے عامل کی بات غور سے سنی تھی اور اب وہ تیار تھا عمل کرنے کو...... اسے رات کا انتظار کرنا تھا۔

☆......☆......☆

رات ہو چکی تھی۔ چلتے چلتے درختوں کے جھنڈ تک وہ پہنچ گیا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا ڈر پیدا ہونے لگا۔ جیسے کچھ برا ہو جائے گا۔ لیکن عمل تو اس کو پورا کرنا ہی تھا۔ اس نے حصار کھینچا اور بیٹھ کر عمل شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اندھیرا جیسے غائب ہو گیا۔ اب وہ ہر شے کو واضح دیکھ سکتا تھا۔ جیسے دن ہو، زمین سامنے سے پھٹی اور اس میں سے ایک ڈھانچہ برآمد ہوا۔ وہ ڈھانچہ سعید کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈھانچے کے چلنے سے کھڑ کھڑاہٹ ہو رہی تھی۔ ہڈیاں کڑک رہی تھیں۔ اس ڈھانچے نے ایک درخت کو انگلی سے اشارہ کیا اور درخت زمین پر آگرا۔ اس کی جڑیں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ پھر اس کے اشارے پہ سارے درخت ہی گرنے لگے۔ درختوں کا ایک انبار سا لگ گیا۔

صرف ایک ہی درخت بچا تھا۔ جس کے نیچے سعید بیٹھا عمل پڑھ رہا تھا۔ ڈھانچے نے اس درخت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ درخت بھی گرنے لگا۔ تو سعید کا دل پھٹنے لگا۔ موت اس کے سر پہ تھی۔ اگر وہ اسی طرح بیٹھا رہتا تو موت یقینی تھی۔

"لیکن یہ نظر کا فریب بھی تو ہو سکتا ہے۔" اس نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو درخت اپنی اصلی حالت میں صحیح سلامت کھڑے تھے۔ اب اس کی کچھ ہمت بندھی۔ پھر اس کو بہت ڈرایا گیا۔ وہ ڈرتا تو رہا۔ مگر حصار سے باہر نکلنے کی حماقت نہ کی۔ پھر اس نے ایک سائے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اب عمل میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔

سایہ اس کے پاس آ کر رک گیا...... "یہ عمل بند کر دو۔ میں تمہیں دولت سے مالا مال کر دوں گا۔" یہ سن کر سعید چپ رہا۔ عمل اب ختم ہونے والا تھا، اس سائے نے اسے بہت لالچ دیئے اور آخر میں دھمکیوں پر اتر آیا۔ مگر سعید برابر عمل میں مصروف رہا۔

عمل ختم ہوتے ہی سعید نے سائے کو مخاطب کیا۔
"تم بے گناہ لوگوں کو کیوں مار رہے ہو؟"
اس سایہ نے جواب میں پہلے تو سعید کو یوں گھورا کہ سعید کی روح تک ٹھٹھر گئی۔ پھر بولا تو اس کی آواز میں دکھ تھا۔ "میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ سعید آفندی؟" سائے نے اب جسمانی شکل اختیار کر لی تو اسے دیکھ کر سعید چونک گیا۔ سعید سے سایہ اور سعید اس سے واقف تھا۔ "ظہیر تم؟"
"ہاں! میں...... میں نے بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ پھر مجھے کیوں برباد کیا گیا؟ مجھے اب سب کو ختم، سب کو برباد کر کے ہی سکون ملے گا۔"
"لیکن ظہیر! تم نے تو ملک جہانزیب کی بہن کو اغوا کیا تھا ناں؟"
"میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا تھا۔ زبیدہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔" وہ ماضی میں کھو گیا۔

☆......☆......☆
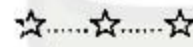
کچھ نہ مانگوں گا، جو اس بات کو پورا کر دے
جو نہیں میرا الٰہی! اسے میرا کر دے
عمر بھر تیرے خیالوں میں یونہی کھویا رہوں
تجھ کو بھولوں تو یہ قدرت مجھے اندھا کر دے!

زبیدہ کو اس نے پہلی بار اس کی اپنی حویلی میں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت گلی سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر چھت پہ کھڑی زبیدہ پر پڑ گئی۔ وہ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ لہٰذا اکثر اوقات زبیدہ چھت پر موجود ہوتی تھی۔ محبت کے جادو نے اثر کیا اور زبیدہ بھی اس کی طرف متوجہ ہونے لگی۔
ایک دن ملک جہانزیب نے ان کو بات کرتے دیکھ لیا اور ایک مربوط پلان بنایا۔ جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔
دراصل وہ زبیدہ کی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے جائیداد میں سے حصہ دینا پڑے گا۔
ظہیر کو دیکھ کر ان کو ایک آئیڈیا سوجھا۔ جس پر انہوں نے اگلے ہی دن عمل کر ڈالا۔ زبیدہ اس شام ظہیر سے آخری بار ملی تھی۔ اس نے ظہیر کو بتایا کہ "بھائی جہانزیب اس سے ملنا چاہتے ہیں۔" زبیدہ بہت خوش لگ رہی تھی، اس نے ظہیر کو سفید گلاب کا ایک پھول بھی دیا۔
اس کے بعد جب ظہیر، ملک جہانزیب کی حویلی میں گیا تو اس پر تشدد کیا گیا۔
اگلی صبح اس پر الزام لگا دیا گیا کہ اس نے زبیدہ کو اغوا کر لیا ہے۔ چند دن اسے اذیتیں دینے کے بعد اسے سر عام مار دیا گیا۔ چھپ چھپا کر زبیدہ کو بھی مارا جا چکا تھا۔
ظہیر کی روح اس ناانصافی کو قبول نہ کر سکی۔ اور بدلہ لینے پر تل گئی۔ وہ ہر اس شخص کو مارنے لگا جس نے ظہیر کو غلط سمجھا تھا۔ ان ہی میں ڈاکٹر شہروز، سارہ اور دیگر لوگ بھی۔
"تو تم واپس نہیں جاؤ گے؟" سعید نے پوچھا۔
"جا رہا ہوں۔ میرا کام ویسے بھی ختم ہو گیا ہے۔ میں نے ملک جہانزیب اور اس کے تمام ملازمین کو، جو اس ظلم میں شامل تھے، مار دیا ہے۔ جنہوں نے مجھ سے زندگی چھینی ان کو بھی کوئی حق نہیں زندہ رہنے کا۔" وہ یہ کہہ کر پلٹ گیا۔ وہ جا کر ایک درخت کے تنے کو گھورتا رہا۔ درخت کے تنے میں سے دھواں اٹھنے لگا اور پھر ایک شگاف پڑ گیا۔ اس نے شگاف میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز باہر نکالی۔ وہ ایک خشک پھول تھا۔ سفید گلاب اس نے پھول کو عقیدت سے چوما۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

بیٹھ کر سایۂ گل میں ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

"چلتا ہوں۔ تم اطمینان رکھو۔ اب سب کو پتہ چل چکا ہے، کہ وہ سایہ میں تھا۔ مرنے سے پہلے جہانزیب نے سب کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ اب کوئی سایہ نہیں آئے گا گاؤں والوں کو تنگ کرنے، میں جا رہا ہوں۔ زبیدہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔" وہ پھول سمیت غائب ہو گیا۔
اور سعید بھی اٹھ کر گھر کی طرف چل دیا۔ سایہ اب ختم ہو گیا تھا۔ لیکن سعید کا دل سائے کی کہانی سن کر دکھی ہو گیا تھا۔

☠

عشق ناگن

قسط نمبر: 17

ایم الیاس

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کھلنے میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

پھر دونوں محبت بھری باتیں کرنے لگے۔

ان محبت بھری باتوں نے انہیں ایک ایسے نئے جذبے سے آشنا اور سرشار کردیا تھا کہ جس سے وہ محروم تھے۔ کبھی جذبات کی افراتفری نے انہیں ایسا کیف وسرور ان کی آتماؤں کو نہیں پہنچایا تھا...... جل کماری کی فیاضی سے مہربانی سے اس نے نہیں پایا تھا۔ آکاش نے محسوس کیا تھا کہ عشق جسم سے نہیں آتما سے کی جاتی ہے۔

آخر وہ کب تک محبت بھری باتوں اور عشق کی دیوانگی سے دور رہتے۔ آگ اور تیل کی آمیزش نے بھڑکنے پر مجبور کردیا تھا۔

رات کے آخری پہر جب وہ دونوں پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ تب آکاش نے ہلکی سی آہٹ سنی۔

''یہ کون ہے امرتا رانی......؟'' اس نے چونک کر کروٹ لے کر امرتا رانی کی طرف دیکھا۔

''سنگیتا...... اور کون ہوسکتی ہے؟'' امرتا رانی نے لیٹے لیٹے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''یہ بے چاری نہ جانے کب اور کتنی دیر سے یہاں چھپی ہماری باتیں نہ صرف سن رہی بلکہ ہماری حرکات دیکھتی رہی ہے اور سرد آہیں بھر رہی ہے۔''

''سنگیت جان!...... کہاں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتی ہو؟'' آکاش نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''میرے من کے دیوتا......! میں تمہاری پجارن ہوں......'' سنگیت کہنے لگی۔ ''میں کیسے آپ دونوں کے بیچ دیوار بن جاتی...... آپ کی محبت میں دخل دیتی...... میں تو امرتا رانی کے چرنوں کی دھول ہوں...... ان کی دیا ہے جو انہوں نے مجھ پر کی ہے۔ میں اسے کیسے بھول جاؤں؟''

''آجاؤ اندر......!'' امرتا مسکرا کے بولی۔ ''میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی...... میرے دل میں تمہارے لئے کتنی محبت اور وسعت ہے تم جانتی ہو...... جب میں نے پہلی بار تمہارے جھونپڑے میں جس میں تم اکیلی تھیں کیا اپنے دیوتا کو تمہیں پیش نہیں کیا...... یہ تمہارا عشق ہے اور میرا عشق تمہارے لئے میرے دل میں بڑی جگہ رکھتا ہے......

سنگیت......! میں تم سے بھی تو عشق کرتی ہوں...... ویسا ہی عشق جیسے آکاش جی سے کرتی ہوں...... تمہارا بھی دیوتا جی پر ہر طرح کا ادھیکار ہے......''

پھر اس جھونپڑے کی ایک سمت سے سنگیت نمودار ہوئی...... شرماتی، لجاتی اور بل کھاتی ہوئی اور پھر

یہ نسوانی پیکر اس سے بڑے جذباتی انداز سے لپٹ گیا۔

سنگیت نے اس کے پاس آ کر اس کے چرنوں میں خود کو سمو دیا۔ تو آکاش نے جھک کر اس کی بانہیں پکڑ کے اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پھر سنگیت نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ لیکن آکاش کے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو بولنے نہیں دیا۔ چند لمحوں کے بعد اسے سینے سے لگایا تو وہ آکاش کے سینے میں جذب ہونے لگی۔

پھر آکاش نے محسوس کیا کہ انسانوں کی نسل کی ایک نہایت حسین وجمیل دوشیزہ کتنے ہی جذبے سے اس کے سینے سے لگی کھڑی ہے۔

''کیوں دیوتا جی......!'' سنگیت نے اس کے سینے کے گھنے بالوں میں انگلیاں گھمائیں۔ ''کیا تم بھی امرتا رانی کی طرح مجھ سے پیار کرتے ہو......؟ میں تم سے محبت کرسکتی ہوں نا......؟ امرتا رانی جیسا عشق......''

اس وقت آکاش کو اس کے ہیجانی جذبے میں ایک عجیب سی تسکین اور طمانیت کا احساس ہوا تھا...... ایک ناگن کے نسائی روپ سے رعنائیاں سمیٹنے کے بعد اسے سنگیت کے وجود میں سرور و کیف سمایا ہوا سا لگا تھا۔

''اب تم دونوں محبت سے اور آزادی سے بات کرو......'' امرتا رانی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا باہر کی خبر لیتی آؤں۔''

پھر امرتا رانی ان دونوں پر محبت بھری نگاہ ڈال کر جھونپڑے سے مسکراتی ہوئی نکل گئی۔

امرتا رانی کے باہر جاتے ہی اس نے سنگیت کو گود میں اٹھالیا اور اس کے چہرے پر جھکا تو وہ کسمسائی اور سرخ ہوگئی...... پھر سنگیت اس کی آنکھوں میں ڈوب کر بولی۔ ''میرے دیوتا......! میری جان! میں تم سے پل بھر جدا نہیں رہ سکتی...... تمہاری محبت نے مجھے دیوانہ بنادیا ہے...... تم مجھ سے اتنی محبت تو نہ کرو...... کہیں میں......''

آکاش کے ہونٹوں نے اس کا جملہ پورا ہونے نہیں دیا۔ پھر وہ دونوں محبت کی دنیا میں بہت دور تک چلے گئے۔

جب صبح کا اجالا درختوں کے کنج میں واقع اس جھونپڑے میں پھیلا تو دیا بجھا ہوا تھا۔ دیا جو ساری رات جلتا رہا تھا اب دم توڑ چکا تھا۔ اس کی روشنی میں سنگیت کی محبت بھی تو روشن رہی تھی۔ اسے کب آنکھ لگی خبر نہ ہوسکی تھی پھر اس نے اپنے پہلو پر نگاہ ڈالی تاکہ سنگیت کو نظر بھر کے دیکھے۔ لیکن سنگیت نہیں تھی اس کی جگہ امرتا رانی پڑی سو رہی تھی۔ سنگیت کب گئی اور کس وقت گئی اسے اس بات کی کوئی خبر نہ ہوسکی تھی۔

اس نے امرتا رانی کے رخسار پر بوسہ دیا اور پیار سے اٹھنا چاہا...... عین اس سے جھونپڑے کے باہر مردہ غیر انسانی قہقہہ سنائی دیا۔ اس نے چونک کر اور گردن گھما کے اس سمت دیکھا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ صرف ایک لحظہ کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے دھندی سی چھاگئی۔ جب دھند چھٹی تو دیکھا اور اسے نظروں پر یقین نہ آیا۔ جل منڈل کی ہولناک زندگی سے رہائی پانے کے بعد اس کی وہ مصیبت جس سے اس نے چھٹکارا پایا ہوا تھا اس کے سر پر پھر سے مسلط ہوچکی تھی۔

پگھلی ہوئی آنکھوں والا اس کا موذی دشمن...... اندھا شیوناگ جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

آکاش کے سارے جسم میں خوف و دہشت کی لہر سنسنی بن کر پھیلی تو اس نے بے جان کردیا تھا۔

شیوناگ کا سینہ فتح مندی کے ساتھ تنا ہوا تھا اور سنگیت کسی سہمی ہوئی بے بس چڑیا کی طرح اس کی گرفت میں تھی۔ اس نے بڑی سختی اور بے رحمی کے ساتھ سنگیت کی مرمریں سڈول بانہیں پکڑی ہوئی تھیں۔

''آؤ آکاش جی......!'' اس کے متوجہ ہوتے ہی شیوناگ نے ایک بھیانک قہقہہ مارا اور غیر انسانی آواز میں استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''میری دونوں آنکھیں تو تمہاری بدچلن امرتا رانی نے پگھلائی تھیں...... پر تم بھی اب ایک ہی آنکھ سے کام چلانے پر مجبور ہو...... مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ امرتا رانی مجھ سے ذرا

پہلے جل منڈل پہنچ گئی تھی...... ورنہ جل کماری کے گرگے تمہاری دوسری آنکھ بھی جلتے تیل سے پھوڑ چکے ہوتے......"

آکاش نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اسے خاموشی سے گھورتا رہا تھا۔

پھر آکاش نے جیسے ہی پیال سے اترنے کا ارادہ کیا تھا کہ مکروہ صورت نے اپنی زہریلی زبان سے دوسرا مہلک وار کیا۔ "تمہارا بچہ...... تمہارا خون......تمہاری پتنی کی کوکھ سے کسی جونک کی طرح چمٹا ہوا ہے...... وہ ہمارے ناگ راجہ کی آشاؤں کی اکیلی رکاوٹ ہے......جس روز تمہاری نیلم وہ بچہ جنم دے گی اس کی مانگ سے تمہاری افشاں کھرچ کے اس کی جگہ نئے ستارے جڑ دیئے جائیں گے......وہ بھی کیا چیز ہے......؟ کیا ظالم ہے...... کیا سندر ہے......اس دنیا میں سچی بات تو یہ ہے کہ مردوں میں تو سب سے زیادہ خوب صورت ہے اور لڑکیوں عورتوں میں تیری نیلم...... بھگوان نے اسے اتنا حسین بنایا ہے کہ ناگ راجہ کے من پر اس کا پورا پورا جادو چل چکا ہے......پاگل ہوا ہے......اگر تیری نیلم کی کوکھ میں تیری نشانی نہ ہوتی تو ناگ راجہ کب کا اسے بستر کی زینت بنا کے کھیل رہا ہوتا۔"

شیو ناگ کا لہجہ سخت اٹل اور چیلنج آمیز تھا...... بہت ہی تحقیر لیا ہوا...... واضح اور توہین انگیز......اس نے شاید امرتا رانی کو دیکھا نہیں تھا یا دیکھا تھا تو نظر انداز کر کے اسے للکار رہا تھا۔

"خاموش کتے...... کیا بھونکے جا رہا ہے...... میں تیری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

آکاش قہر وغضب سے دانت پیستا، اس کے ٹکڑے اڑا ڈالنے کے اس کی طرف لپکا۔ کیوں کہ اس کی مکروہ باتیں آکاش کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھیں جس سے اس کی رگوں میں لہو ابلنے لگا۔

امرتا رانی جو بیدار ہو چکی تھی اور ابھی تک خاموشی سے پیال پر دراز تھی۔ جب اس نے آکاش کو شیو ناگ کی طرف جھپٹتے دیکھا تو چیخ کر اسے روکنا چاہا......لیکن وہ رکا نہیں اس لئے کہ شیو ناگ کی زبان سے، اپنی پیاری بیوی نیلم کی شان میں ہرزہ سرائی سن کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ نفرت اور جوش انتقام اس کی کنپٹیاں چٹخنے لگی تھیں۔ اس نے امرتا رانی کی تنبیہ نظر انداز کر دی اور کھولتا ہوا بڑھتا گیا۔

ادھر شیو ناگ شاید اپنے الفاظ کے ذریعے اسے اشتعال دلا کر یہ چاہتا تھا کہ آکاش اس کی طرف حملہ آور ہونے کے لئے بڑھے۔ آکاش کے لپکتے ہی اس نے سنگیت کو بڑی صفائی سے جھونپڑے میں دھکیل دیا اور خود کسی شکاری عقاب کی طرح دونوں بازو پھیلا کے آکاش کی طرف جھپٹ پڑا۔

آکاش نے فوراً ہی پینترا بدل کے اس کے پیٹ پر ضرب لگانی چاہی لیکن اس کی سینہ بختی اس کوشش پر خنداں تھیں۔ اس کے پینترا بدلتے ہی اس کے پیٹ میں گھسے ان موذی سانپوں نے رینگنا اور بل کھانا شروع کر دیا جو جل منڈل میں اگن پوجا کے موقع پر سویوں کی شکل میں حلق کے راستے اس کے پیٹ میں گھسے تھے۔

پھر اس کے وجود میں درد اور اذیت کی شدید لہر ابھری اور وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھامے ایک درد ناک چیخ مار کر زمین پر دوہرا ہو گیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا بدن پسینوں میں ڈوب گیا اور دل کی رفتار یک بیک سست ہونے لگی۔

اس کے پیٹ میں گھسے وہ سانپ اپنی روح فرسا جنبشوں کے ذریعے ایک بار پھر اسے یہ یاد دلا رہے تھے کہ اگن ناگ نے جل منڈل میں پوجا کے موقع پر اس کی یوں ہی جان بخشی نہیں کی گئی تھی......اسے اپنی زندگی کی خاطر ہر قیمت پر کسی کنواری دوشیزہ کے زندہ خون سے اگن ناگ کے پتلے کو اشنان دینا تھا اور اس کے بدن میں گھسے یہ ناگ اس کے پورے جسمانی نظام کو چاٹ کے ایک برس کی مدت پوری ہوتے ہی اسے موت کی آغوش میں دھکیل دیں گے۔

تکلیف اور اذیت کا وہ ایک ایک لمحہ صدیوں طویل ہوا جا رہا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے اب تاریکی کے گنجان دھبے رقص کرنے لگے تھے۔ جن کے رقص میں فرشتہ اجل رقص کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

پھر اندھا شیوناگ بڑے سکون اور اطمینان سے اس کے قریب آیا۔ اندھا ہونے کے باوجود اس نے اپنی کسی پراسرار قوت کے سہارے اسے بے بس زمین پر تڑپتے دیکھا اور ایک شیطانی قہقہہ مار کے اس پر جھکا۔

موت کا ایک دوسرا ہرکارہ اس کے سر پر نازل ہو چکا تھا۔

اس کے جابجا پھولے ہوئے مکروہ چہرے پر انتقام کی ہیبت ناک سرخی چھائی ہوئی تھی..... اس کی پیشانی کی رگیں، جلد پر ابھر آئی تھیں..... اس کے سر پر بالوں کی جگہ اگے ہوئے بے شمار ننھے ننھے اور باریک سانپ اپنی پتلی پتلی زبانیں باہر نکالتے بار بار اس کی جانب لپک رہے تھے۔ جیسے وہ ایک ہی وار میں اسے ٹھکانے لگا دینا چاہتے ہوں۔

وہ اس دل دوز اذیت میں مبتلا زمین پر تڑپ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ ابھی اگن ناگ کی دی ہوئی ایک برس کی مہلت پوری نہیں ہوئی ہے۔ لہٰذا پیٹ میں گھسے ہوئے سانپوں کی وہ تکلیف جلد یا بدیر ختم ہو بھی جائے گی..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ ان کڑے لمحات میں شیوناگ نہایت اطمینان سے اس پر غالب آ جائے گا۔ اس سے آگے اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ معجزاتی طور پر کیا زندہ رہ بھی سکے گا.....؟ یا پھر اس کے ہاتھوں عبرتناک موت مارا جائے گا یا اذیت ناک قید ایک نیا دور اس کا مقدر موت بنے گا.....

وہ بڑے کرب و بے بسی کی سی کیفیت میں زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اور شیوناگ اس کے سر پر آ چکا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ حلقے کی صورت میں اس کی گردن کی جانب بڑھ رہے تھے۔

''شیوناگ.....!'' امرتا رانی غضب ناک آواز میں چیخی۔ ''کمینے..... سن لے..... آکاش جی کو چھونے سے پہلے تجھے مجھ سے یدھ جیتنا ہوگا..... جب تک میری تمام شکتیاں ختم نہیں ہو جاتیں تو انہیں ہاتھ لگا بھی نہیں سکتا.....''

''اچھا..... بڑی اترا رہی ہے..... بڑا زور دکھا رہی ہے..... بڑا اکڑ رہی ہے..... دیکھ تو لے؟''

پھر وہ ایک فلک شگاف قہقہہ مار کے ہنسا اور پھر اس نے فوراً ہی دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔

اس کے پیٹ میں گھسے اور کلبلاتے سانپ اس سے جیسے اس کی جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ ادھر اس تکلیف جاں گسل شدت اور ادھر شیوناگ اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔

سردی کے باوجود اس کا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ اعصاب کی شکستگی نے اسے بالکل ہی بے بس کر کے رکھ دیا تھا اور اسے اپنی نظروں کے سامنے موت ناچتی دکھائی دے رہی تھی۔

اس وقت سنگیت بھی فرش سے اٹھ چکی تھی۔ آکاش نے محسوس کیا کہ شیوناگ اسے گلے سے پکڑ کے فضا میں معلق کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ سفاک دشمن اپنے ارادے میں کامیاب ہوتا امرتا رانی نے ایک زوردار چیخ ماری اور شیوناگ اچھل کر دور جا گرا۔ آکاش کی گردن اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی..... ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی طاقت ور برقی جھٹکے نے اسے فضا میں دور اچھال پھینکا ہو۔

اس وقت جو سنگیت اٹھ کھڑی ہوئی تھی وہ ہراساں سی ہو کے شیوناگ کو دیکھے جا رہی تھی۔

امرتا رانی نے شیوناگ کو زمین سے اٹھنے کی مہلت دیئے بغیر ایک کنکر اس کی جانب تیزی سے اچھال دیا تھا۔

اور پھر شیوناگ نے کریہہ چیخ ماری اور بوکھلایا اور ایک طرف لڑھک گیا..... جیسے کسی نادیدہ چٹان

جیسے بوجھ سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کا چہرہ فق تھا۔

صبح کا دھندلکا تیزی کے ساتھ کہرآلود اجالے میں ڈھلتا جارہا تھا۔

کالی بھوری کی سیاہی مائل زمین پر اس کی زندگی موت کے شکنجے میں سسک رہی تھی۔ ساحل پر سمندر کی سرکش موجوں کا شور ابھر کر ڈوبنے والا شور اور اطمینان اس پر مزید ہیبت طاری کئے دے رہی تھی۔ حالات کی غیر یقینی کے باعث اب اسے جل کماری اور اس کے گرگوں کی یورش کا بھی دھڑکا ہوچلا تھا۔ ادھر اب اس کے معدے کی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی...... اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اگن دیوتا کی دی ہوئی ایک برس کی مہلت بیت چکی ہے اور اس بارسویں کے روپ میں اس کے بدن میں گھسنے والے سانپ اسے اگن ناگ کو کسی کنواری کے خون بھینٹ نہ دینے کی سزا کے طور پر ہلاک کئے بغیر چھین نہ لیں گے۔

اندھا شیوناگ اب زمین سے اٹھ چکا تھا۔ اس کا چہرہ قہر وغضب سے سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس نے ایک بار گہرا سانس لیا اور پھر پوری قوت سے زمین پر پاؤں اس طرح پٹخنے لگا جیسے زمین کو شق کرکے رکھ دے گا۔

اس کے پیروں کی دھمک سے پورے جزیرے کی زمین اس طرح لرزنے لگی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ آکاش نے پہلی بار تو اسے اپنا وہم سمجھا کہ چوں کہ اس کے قدم لڑکھڑائے سے تھے لیکن دوسرے لمحے اسے یقین کرنے کے سوا چارہ نہیں رہا تھا کہ یہ واقعی زلزلہ ہے لیکن جب اس جزیرے پر شدید زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی تو وہ بدحواس اور سراسیمہ سا ہوگیا۔ مگر اسی وقت یہ مسرت آمیز احساس ہوا کہ اس کی تکلیف ختم ہوچکی ہے۔ شاید اس زلزلے نے اس کے پیٹ میں گھسے ہوئے سانپوں کو شاید خوف زدہ کردیا ہوگا۔ ایسی قدرتی آفات تھی کہ موذیوں نے اسے محسوس کرلیا تھا جو ایک عجیب سی بات بھی تھی۔

معاً اس کی ہراساں نگاہیں امرتا رانی پر پڑیں جو خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ وہ خوف زدہ تو نہیں تھی البتہ وہ فکر مند لگتی تھی اور اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ آنکھیں متوحش تھیں جو یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں لیکن شیوناگ کے لائے ہوئے زلزلے سے وہ جگہ بالکل بھی متاثر نہیں تھی جہاں امرتا رانی کھڑی ہوئی تھی۔

پھر اگلے لمحے اس کے کانوں میں سنگیت کی ہذیانی چیخیں سنائی دیں وہ اسے بہت زیادہ دہشت زدہ لگی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا جارہا تھا اور پھر وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی، سینے کے بل گر پڑی۔ زلزلے کے باوجود اس نے سنبھل کے کھڑے ہونے کی بڑی کوشش کی تو اس کے لئے کھڑے رہنا اور ایک قدم چلنا بھی دشوار اور ناممکن لگ رہا تھا...... سنگیت کے پاس پہنچنے کے لئے ایک ہی صورت تھی۔ پھر وہ گیند کی طرح لڑھکتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا اور پھر اس نے سنگیت کے کانپتے بدن کو اپنی بانہوں میں لے لیا تاکہ اس کی دہشت میں کچھ کمی آجائے۔

امرتا رانی نے جو شیوناگ کو حد سے زیادہ ڈینگیں مارتے دیکھا تو وہ لپک کے آکاش کے پاس آئی۔

''آکاش پیارے......! ذرا منکا مجھے دے دو...... یہ پاپی حد سے آگے بڑھ رہا ہے۔''

آکاش نے لحظہ بھر بھی تامل نہیں کیا اور منکہ فوراً ہی گلے سے نکال کے اسے دے دیا۔

''مورکھ...... اب تو باز آجا......!'' امرتا رانی منکہ تھام کے شیوناگ کی طرف دیکھ کر چلائی۔

''تو کیا سمجھتی ہے...... میں ان دونوں کو اس طرح سے ہلکان کروں گا مرجائیں......'' شیوناگ بدستور ناچتے ہوئے بولا۔

امرتا رانی کو منکہ دینے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ یہ مصنوعی جھٹکے اس کے لئے شدید تکلیف کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکے گا۔ سنگیت بھی......

تو یہ لے...... لگتا ہے کہ شاید تو بھی مرجانا چاہتا

ہے...... اور اپنے جیون سے بے زار ہوگیا ہے۔'' امرتا رانی نے غصے کی حالت میں اس کی طرف گیند کی طرح اچھال دیا۔ ''میں دیکھتی ہوں اور دیکھنا تیرا جیون کیسے غارت ہوتا ہے...... تاکہ میں بھی خوشی سے دیوانہ ناچوں...... اور کئی گھڑیاں ناچتی رہوں......''

یہ دیکھ کر آکاش کا دل اچھل کے حلق میں دھڑکنے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ امرتا رانی شاید نفرت اور غصے کے اندھے جنون میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی...... اس نے یہ حرکت کی......! اپنے پیروں پر کلہاڑی مارلی۔ اس منکے کے حصول کے لئے شیوناگ نے اب تک نہ جانے کیا کیا جتن نہیں کئے...... پاپڑ نہیں بیلے...... اس نے اور امرتا رانی نے کیا کچھ نہیں سہا...... امرتا رانی نے منکہ حلوہ کی طرح پیش کردیا...... اس کا یہ فعل سراسر خودکشی کے مترادف نہیں......

یہ دیکھ کر آکاش کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شیوناگ منکے کی طرف لپکنے کے بجائے ذہن پر ناچ اور قہقہے بھول کر زمین پر اوندھا لیٹ گیا...... منکہ کسی پرندہ کی طرح اڑتا ہوا شیوناگ کی کمر پر گرا۔ شیوناگ کو ایسا لگا تھا کہ جیسے اسے نوکیلا اور بھاری پتھر دے مارا ہو۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخیں نکل گئیں۔ جیسے وہ کسی بھاری چٹان کے نیچے دب گیا ہو۔

شیوناگ کی کمر پر ضرب لگا کر منکہ فضا میں پھر بلند ہوا۔ امرتا رانی نے اپنے ہاتھ سے پراسرار سا اشارہ کیا تو منکہ دوبارہ شیوناگ کی پسلیوں پر گرا۔ اب جو شیوناگ چیخیں مارنے لگا جو بڑی اندوہناک تھیں۔ وہ تکلیف سے بلبلاتا زمین سے اٹھا اور لنگڑاتا ہوا ایک طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔

''آکاش......! اس پاپی کو پکڑلو...... اسے زندہ نہ نکلنے دو......'' امرتا رانی بڑے زور سے چیخی۔ لیکن وہ بھونچکا سا کھڑا ہوا تھا اور سنگیت اس کے پاس آکر سہمی ہوئی سی کھڑی ہوگئی تھی۔

''چلو...... آکاش جی...... کہیں یہ کمینہ نکل نہ جائے۔'' امرتا رانی نے اس کے پاس اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ ''میں اس موذی کو تمہارے ہاتھوں سراپ دینا چاہتی ہوں۔''

آکاش ایک دم سے چونک کر اپنی جگہ سے حرکت کی۔ پھر وہ شیوناگ کے تعاقب میں لپکا جو کراہتا اور لنگڑاتا ہوا ایک سمت دوڑ رہا تھا۔ اس کا بدن زخموں سے چور تھا اور زمین اس کے خون سے سرخ ہوئی جارہی تھی۔

وہ زخمی اور ہراساں تھا جب کہ اسے ناگ رانی کی مدد اور حمایت تھی۔ پھر آکاش نے ذرا ہی دیر اس کریہہ ور بھیانک اور مکروہ شخص کو آن کی آن میں جالیا جسے دیکھتے ہی رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔

شیوناگ اپنے قریب آکاش کی آہٹ پاکر پھرتی سے پلٹا۔ اس کے سر پر بالوں کی جگہ اگے ہوئے باریک باریک زندہ سانپ بڑی بے چینی سے کلبلا رہے تھے۔ اس کے چہرے کی جابجا پھولی ہوئی کھال پر پسینے کی موٹی موٹی بوندیں چمک رہی تھیں جو ساحل کی خنک فضا میں خاصی تعجب خیز تھیں...... اس کی گلی ہوئی بینائی سے محروم آنکھوں کے پپوٹے بہت تیزی سے کسی پرندے کے پروں کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اسے یوں غیر متوقع طور پر پلٹتے دیکھ کر وہ قدرے پریشان ہوگیا اور اس کے قدم زمین میں گڑ کے رہ گئے۔

''آج ہی میں یہ جھگڑا ہمیشہ کے لئے نمٹادوں گا۔'' وہ دونوں ہاتھ آکاش کی جانب پھیلا کے غرایا۔ ''کب تک تجھ جیسا پوتر پاپی ناگوں کی جان کا روگ بنا رہے گا۔''

وہ فرار ہوتے ہوئے دشمن کی زبان سے اس قسم کے فقرے سن کر وہ پریشان ہوگیا اور بے اختیار اس کی نگاہیں اپنے عقب میں امرتا رانی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی یہ حماقت اسے خاصی مہنگی پڑی۔ کیوں کہ اس کی ساری توجہ دوسری جانب مبذول ہوتے شیوناگ اچھل کر اس پر آپڑا اور وہ اس کے بوجھ تلے زمین پر جاگرا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی بے معنی چیخوں میں خوف اور

گھبراہٹ نمایاں تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ خوف اور گھبراہٹ ظاہر نہ ہو لیکن ناکام رہا۔

اس کے لئے شیوناگ سے یوں براہ راست زور آزمائی کا یہ پہلا موقع تھا۔

اس سے قبل کبھی بھی اس سے جسمانی ٹکراؤ کی توبت نہیں آئی تھی۔ اس کا بدن برف کی سلوں کی طرح سرد اور پتھر کی طرح ٹھوس تھا اور اس کے پسینے سے عجیب کراہت آمیز بساند پھوٹ رہی تھی۔ جوں ہی اس نے آکاش کو اپنی گرفت میں لیا اس کے سر پر بالوں کی جگہ کلبلاتے ہوئے زندہ سانپوں نے پھنکاریں مار مار کے اس کے چہرے پر اپنے پھن مارے، وہ خوف کراہت اور بوکھلاہٹ کے عالم میں پوری قوت سے تڑپا اور شیوناگ کو اپنے اوپر سے گرا دینے میں کامیاب ہوگیا۔

پھر اس سے قبل کہ اندھا شیوناگ دوبارہ اس پر حملہ کرتا اور سینے پر سوار ہوتا اس کے ہاتھ میں ایک پتھر آ گیا اور پھر اس نے بلا تامل شیوناگ کے سر پر دے مارا۔ وہ چوٹ کھا کے غضب ناک ہوگیا اور غرانے لگا۔ پتھر کے نیچے آ کر کچلے جانے والے سانپ پوری قوت سے پھنکارے اور وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر زمین پر کھڑا ہوگیا۔

اس وقت شیوناگ کی حالت بہت خستہ تھی، اس کی جو کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں ان سے خون بہنے لگا اور اس کی مقدار بہت بھاری تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں بھی بری طرح زخمی ہوگئی تھیں۔ بینائی سے وہ پہلے ہی محروم ہو چکا تھا، اس کی ضرب کے نتیجے میں اس کے سر میں لہولہان ہو رہا تھا۔ چوں کہ اس کے وجود میں شیطانی قوتیں پوشیدہ تھیں اس لئے وہ اس گھمنڈ میں اسے زیر بار کرنے کے لئے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

آکاش نے زمین سے اٹھتے ہی اس کے منہ پر ایک زبردست ٹھوکر رسید کی اور وہ بری طرح چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

اس سے قبل کہ وہ شیوننگ پر اگلا وار کرتا وہ کسی بدروح کی طرح اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا پورا چہرہ اب خون میں جیسے اشنان کر رہا تھا۔ آکاش نے اس کے منہ پر جو ٹھوکر ماری تھی اس نے شیوناگ کی پیشانی میں گہرا گھاؤ سا ڈال دیا تھا۔ اس نے آکاش کے سامنے آتے ہی دونوں ہاتھ سیدھے کئے اور پھر اسے مہلت دیئے بغیر اس سے جونک کی طرح چمٹ گیا۔ اس کے خون میں نہ جانے کیسی بدبو رچی ہوئی تھی کہ وہ اپنی جان کے خوف کے باوجود اس کراہیت کے احساس کو ختم نہ کرسکا۔

''اس سے تیرے پاس منکا نہیں ہے۔'' شیوناگ اس کی گردن کو دبوچتے ہوئے دہاڑا۔ ''اب تو بےبس اور ناکارہ ہو چکا ہے۔ میں اس سنسار کو تیرے بوجھ سے نجات دلا کے ہی دم لوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے تیز اور نوکیلے دانت آکاش کے گلے کے حلقوم پر جما دیئے۔ آکاش کسی ذبح ہوئے ہوئے بکرے کی طرح چیخا اور اس کے پیٹ پے درپے کئی گھٹنوں کی ضرب لگائی...... لیکن اس کے دانت آہستہ آہستہ اس کے نرخرے میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ اس خون آشام دشمن کے عزائم بہت بھیانک تھے اور وہ ہر قیمت پر اس کا کام تمام کر دینے کے درپے تھے۔

اس سے امرتا رانی اور سنگیت...... دونوں ہی دوڑتی ہوئی اس کے قریب آ پہنچیں۔ اس نے ان کی ایک جھلک دیکھی اور پھر اسے حلقوم کو شیوناگ کے تیز دانتوں کی کاٹ سے بچانے کے لئے بدلہ لینا پڑا۔

''آکاش پیارے! اس کے سر کے ناگوں کو مٹھی میں جکڑ لو ورنہ یہ تمہارا خون پی جائے گا......'' امرتا رانی ہیجان آمیز آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ''جلدی کرو۔'' امرتا رانی کی سانسیں الجھ رہی تھیں۔

آکاش نے فوراً ہی شیوناگ کی پسلیوں کو اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر دیا اور چند ثانیوں کی صبر آزما کوشش کے بعد اس کے سر پر اگے ناگوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس کے اس وار کا ردعمل حیرت ناک حد تک بڑا کامیاب رہا تھا۔ شیوناگ کے دانتوں کی گرفت سے اس کا حلقوم فوراً ہی چھٹکارا پا گیا تھا اور اس کے پتھر کی

طرح ٹھوس بدن کا تناؤ نرماہٹ میں تبدیل ہوگیا۔

ان باریک باریک سانپوں کو یوں گرفت میں لینے کا تجربہ بڑا انوکھا تھا۔ اور اسے بے حد دلچسپ بھی لگا۔

انہیں دیکھتے ہی یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سب بہت موذی اور زہریلے سانپ ہیں اور ان کے مقابلے کے دوران میں بھی ان سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس وقت ان میں سے کسی نے اسے نہیں ڈسا...... جب کہ وہ پوری قوت سے اس کی مٹھیوں میں کلبلا رہے تھے تاکہ اس کی بے احتقانہ گرفت سے نجات پاسکیں۔

اب شیوناگ کسی بے ضرر کیچوے کی طرح اس کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بالوں کی جگہ اگے ہوئے سیاہ ناگ اس کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور بری طرح کلبلا رہے تھے اور وہ یہ تماشا دیکھتا ہوا امرتا رانی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا کہ کیا امرتا رانی اسے کوئی نئی ہدایت دے گی؟

امرتا رانی نے ایک پراسرار سا اشارہ فضا میں ہاتھ اٹھا کر کیا تو کسی سمت سے ایک تیز دھار استرا فضا میں لہراتا اور تیرتا اس کے قریب اور سامنے آ کر فضا میں معلق ہوگیا۔ پہلے تو اسے استرا دیکھ کے ایک ان جانا سا خوف ہوا تھا کہ کہیں وہ موذی استرے کو قبضے میں کر کے گردن پر نہ چلا دے...... امرتا رانی نے اسے جیسے دلاسا دیا۔

''گھبراؤ نہیں...... ڈرو نہیں...... اب تم جتنا جلد ہو سکے اس کے سر پر اگے ہوئے ناگوں میں جو اس کی سب سے بڑی شکتی چھپی ہوئی ہے اسے ختم اور تباہ کرنا ہے۔ لہٰذا اب تم اس کا سر مونڈ ڈالو...... اب یہ پوری طرح تمہارے قابو میں آ چکا ہے...... بے بس ہوگیا ہے۔'' امرتا رانی نے پرجوش لہجے میں کہا۔

امرتا رانی کی بات سن کر اس کا حوصلہ بلند ہوا۔ اس نے بڑے سکون اور اطمینان سے اپنے داہنے ہاتھ میں استرا تھاما۔ بائیں ہاتھ میں شیوناگ کے سر والے سانپ بدستور جکڑے ہوئے تھے...... پھر اس نے استرے کی دھار سیدھی رکھی اور پھر اس نے عجلت سے اس کا سر مونڈنا شروع کر دیا وہ اس کے سامنے بے حس و حرکت سر جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے سر پر اگے ہوئے باریک باریک سانپ استرے کی دھار سے کٹ کٹ کر نیچے گرتے جا رہے تھے ان کی دبی دبی آخری پھنکاروں میں شدید بے بسی اور موت کی دہشت سرسرا رہی تھی۔

کالی بھومی کی سرزمین پر اب صبح کا اجالا دھند کی گہری چادر کو چیرتا جا رہا تھا۔ آکاش نے اس قدرتی اجالے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیوناگ کا سر ایک دم سے چٹیل میدان بنا دیا۔ اب اس کی صاف و شفاف سیاہ کھال یسی دکھائی دیتی تھی جیسے اس پر کبھی بال ہی نہ تھا۔ نہ اس کے سر پر بال اگتے ہیں۔

''شیوناگ......! اب تو آکاش جی کے چرنوں میں جھک کے زمین کی خاک چاٹ۔'' امرتا رانی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تو ہار چکا ہے...... ذلیل اور خوار ہو چکا ہے۔ سمجھا۔''

شیوناگ اس سے بے حد مضمحل اور شکست خوردہ نظر آ رہا تھا اور اس کی گرفت سے بھی آزاد ہو چکا تھا اور اگر چاہتا بھی تو کسی بھی سمت فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن شاید وہ یہ بات بہت اچھی طرح جان چکا تھا کہ اب وہ کسی بھی قیمت پر امرتا رانی کی شکتی کا توڑ نہیں کر سکے گا اور اب اس کی کوئی شکتی کسی کام کی نہیں رہی تھی۔

اس لئے وہ اس کے قدموں میں گر پڑا، آکاش نے اس کی گرم اور لجلجی زبان کا لمس اپنے پیروں کی جلد پر محسوس کیا۔ وہ کسی وفادار کتے کی طرح اس کے پیر چاٹنے لگا۔ آکاش نے بڑی کراہیت سی محسوس کی اور اپنے قدم پیچھے ہٹا لئے۔ جیسے آکاش نے اپنے قدم پیچھے ہٹائے وہ اندھوں کی طرح خاک میں اپنا منہ رگڑتا ہوا آگے بڑھا اور دوبارہ بے تابی کے ساتھ اس کے قدم تھام لئے تو پھر ایک بار پھر اس کی زبان پیروں پر پھیلنے لگی۔

''امرتا رانی......! اسے ہٹاؤ...... مجھے بڑی گھن آ رہی ہے۔''

''آکاش نے شیوناگ کی اس حرکت سے عاجز آ کر اور متنفر ہو کر کہا۔ امرتا رانی اس کے پاس ہی کھڑی ہوئی تھی۔

''یہ لو......'' امرتا رانی نے منکہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اسے گلے میں ڈال لو...... پھر یہ شیوناگ کسی کتے کی طرح تمہاری آ گیا کا پالن کرے گا...... اب تمہیں اس موذی سے خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔''

''دور ہٹ جاؤ...... موذی۔'' آکاش نے سب سے پہلے نفرت اور حقارت سے اس کی زخمی پیشانی پر ٹھوکر ماری۔ وہ ہرگز ہرگز قابل رحم نہیں تھا۔ اس نے اس کے سنگیت کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ ناقابل معافی نہ تھی۔ ٹھوکر کھا کر شیوناگ پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے اپنے گلے میں منکہ ڈال لیا۔ شیوناگ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا جو چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ ساتھ ساتھ سر بھی ہلاتا اور جیسے کہتا جا رہا ہو کہ بس بھی کرو۔

اس وقت اس کے ہیبت ناک چہرے پر انتہا درجے کی بے بسی، مایوسی اور شکست خوردگی کی ذلت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا زعم، گھمنڈ، مرعونیت...... سارا قہر اور ساری عیاری کافور ہو چکی تھی۔

''مجھے اس کمینے کی کتنی چنتا تھی، میں بتا نہیں سکتی......'' امرتا رانی نے اس کے پاس آ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اس مکار اور ذلیل کے کارن میرے لئے تمہاری سرکشت بڑی کٹھن ہو گئی تھی۔ مجھے تم سے جدا اور دور رہتے ہوئے ایک خوف سا دل میں دامن گیر ہو جاتا تھا کہ کہیں وہ تمہاری جان نہ لے لے یا پھر معذور اور اپاہج بنا دے لیکن اب وہ انجانا خوف دل سے نکل چکا ہے اور اب میرے ذہن میں ایک خیال سا آ رہا ہے...... ؟ ایک تجویز ہے؟''

''آکاش نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے قریب کر لیا۔ ''کیا خیال اور تجویز ہے؟''

''گو کہ خوف دل کے کونے سے نکل چکا تو ہے لیکن پھر بھی اس کے باوجود کہ اب اس کی تمام شکتیاں نشٹ ہو چکی ہیں، پھر بھی سوچ رہی ہوں کہ اسے زندہ رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پیروں پر کلہاڑی مارنا، اسے کیوں نہ ختم کر دیا جائے...... بولو...... کیا تم بھی یہی چاہو گے؟ یہ آستین مار قسم کا موذی ہے...... اسے کوئی بھی موقع ملے گا تو وہ رتی برابر بھی رحم کھانا تو درکنار پل بھر بھی سانس لینے نہیں دے گا۔''

''یہ خیال اس لئے بھی آ رہا ہے کہ یہ ہمیں دوبارہ مشکلات میں ڈال سکتا ہے۔'' آکاش نے امرتا رانی کے چہرے سے نگاہ ہٹا کے پہلے تو شیوناگ کی طرف دیکھا۔ پھر امرتا رانی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''جانے کیوں مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ میرا خونی دشمن واقعی پل بھر میں بے ضرر ہو چکا ہے۔''

''میں یہ بات اس بنا پر کہہ رہی ہوں کہ اب بھی اس میں کوئی نہ کوئی روپ بہروپ بدلنے کی شکتی باقی ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اس کا سر کچل دیا جائے۔''

''وہ کیسے......؟'' آکاش نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ اب بھی روپ بدلنے کی طاقت رکھتا ہے؟''

''وہ ایسے کہ جس دن بھی اس کے سر پر ناگ بالوں کی طرح اگ آئیں گے یہ پھر سے سابقہ حالت میں آ جائے گا۔'' امرتا رانی نے اسے بتایا۔ ''اس لئے میں اسے کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوں۔''

''تو کیا...... وہ ناگ اس کے سر پر ہی بالوں کی طرح اگتے ہیں؟'' آکاش ششدر سا ہو گیا۔ ''جانے کیوں یقین نہیں آ رہا ہے؟ دل نہیں مان رہا ہے...... تمہیں بھلا جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟''

''ہاں...... بالکل اسی طرح جیسے تمہارے اور انسانوں کے سروں پر بال اگتے ہیں۔'' امرتا رانی نے کہا۔ ''ویسے تم چاہو تو اسے کچھ روز کتے کی حالت میں

رکھ سکتے ہو......''

''اگر وہ پھر سے طاقت ور ہوگیا اور اس کی سابقہ حالت لوٹ آئے گی تو......؟'' آکاش نے خوف وخدشہ ظاہر کیا۔

''تب کی تب دیکھی جائے گی...... تم خوف زدہ اور ہراساں نہ ہو۔'' امرتا رانی نے اسے دلاسا دیا۔

''جیسا تم کہو......'' آکاش نے آمادگی ظاہر کی۔ ''میں وہی کروں گا جو میری جان تمنا کہے گی؟''

پھر امرتا رانی نے شیوناگ کی طرف متوجہ ہوکر اپنی زبان میں دو ایک جملے کہے جو شیوناگ غور سے سنتا رہا۔ اس نے جیسے، اپنی بات ختم کی شیوناگ پر ان کا جیسے جادو کی اثر ہوا۔ وہ زمین پر کسی پھڑ پھڑاتے زخمی پرندے کی طرح لوٹنے لگا۔

آکاش اس کی اس حرکت پر سراسیمہ سا ہوگیا لیکن اس کی یہ پریشانی اور تشویش چند ثانیوں سے زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی۔ آکاش نے جو کچھ دیکھا وہ نہ صرف ناقابل یقین اور تحیر انگیز تھا۔ شیوناگ چند لمحوں تک لوٹ لگانے کے بعد اب لمبے لمبے بالوں والے ایک سیاہ رنگ کے کتے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بھی شیوناگ کی طرح پگھلی ہوئی نظر آتی تھیں، پھر وہ ایک جھٹکے سے زمین سے اٹھ کے اس نے اپنے بدن پر سے دھول جھاڑی اور دم ہلاتا ہوا امرتا رانی کے پاس گیا اور اس کے چرنوں میں لوٹنے لگا۔

سنگیت اپنی جگہ بھونچکی سی کھڑی خوف اور دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ پراسرار، عجیب و غریب اور رگوں میں لہو منجمد کردینے والا بھیانک کھیل دیکھ رہی تھی۔ اس پر سکتہ سا طاری تھا جس نے اسے ساکت وجامد اور بے حس کردیا تھا...... اس کے سینے میں سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور اس نے غیر اختیاری طور پر دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اپنی پراسرار قوتوں سے محروم ہوجانے کے بعد ایسے غیر معمولی واقعات پر سراسیمہ اور ہراساں ہو جاتی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو میری دلبر......!'' آکاش اس کے پاس جاکر مسکرایا۔ ''کیوں خوف زدہ ہو رہی ہو؟''

''میرے آکاش......!'' سنگیت نے اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

جل منڈل کی دھرتی سے چھٹکارا پانے کے بعد اسے نہ صرف پہلی مرتبہ ذہنی سکون اور آکاش کا قرب ملا تھا...... شیوناگ نے جب اس نے جھونپڑے سے باہر قدم رکھا تھا کہ امرتا رانی جو اسے آکاش کے قرب کا موقع دینے کے لئے باہر نکلی تھی اور امرتا رانی کو اس نے آہٹ کرلی تھی...... وہ جیسے ہی نیم اندھیرے میں آئی تو...... دبوچ لیا تھا۔ پھر وہ اسے اس وقت تک دبوچے رکھا تھا جب تک پرکاش بیدار اور امرتا رانی اس موذی کے چنگل سے نجات نہیں دلائی تھی۔

''کیا بات تم کہنا چاہتی ہو جان من!'' پرکاش اس کا بشرہ بھانپ کے بولا۔

''مجھے جس طرح اور جیسے بھی ہو میری زندگی لوٹا دو......'' سنگیت گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں نے تم سے عشق کیا اور جب دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ تم اگن ناگ پر زندہ بچ سکو گے تو میں نے سوچا کہ میں زندہ رہ کر کیا کروں؟ تمہارے بغیر میں اور میری زندگی اور محبت ادھوری اور بیکار ہے...... اب جینا ہے تو کس کے لئے...... اب دنیا میں کون ایسا ہوگا جس سے میں پریم کروں...... اس لئے تمہاری زندگی سے مایوس ہوکر بڑی جلد بازی کی اور ہتھیا کرلی، جس سے میں اپنی تمام شکتیاں کھو بیٹھی ہوں۔ اب نہ تو میری عقل کام کرتی ہے اور نہ ہی ہمت...... مجھ میں حوصلہ بالکل بھی نہیں رہا...... تم اپنی جان امرتا رانی سے کہو کہ وہ ایک بار اور مجھ پر دیا کرے...... میں جنم جنم اس کا احسان مانتی رہوں گی...... ورنہ میری یہ زندگی ایک حیوان سے بھی بدتر ہے...... کاش! میں ہتھیا سے بچ نہ سکتی؟''

آکاش اس کی جذباتی باتیں سنتا رہا اور پھر اس کے ریشمی بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

''تم اپنا دل اس قدر چھوٹا کیوں کررہی ہو...... مجھے دیکھو...... مجھے نیلم کی تلاش میں ایک آنکھ سے محروم

ہونا پڑا...... آنکھیں اور بینائی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے......'' اس نے اپنی بینائی سے متاثرہ آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے باوجود میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور نہ ہی ہراساں ہوں...... میری بدقسمتی خوش بختی میں بدل جائے اور اب بھی نیلم مل جائے میں سمجھوں گا کہ میں نے دنیا کی بہت بڑی دولت اور نعمت پالی ہے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ صبر کرلوں۔''

''میرے آکاش جان! کیا تم اپنی بینائی کے زائل ہونے پر اس قدر دکھی ہو...... یہ صدمہ تمہارے لئے بڑا گہرا اور ناقابل برداشت ہے؟'' امرتا رانی نے اسے محبت بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

''کیا تمہیں اب تک اس غم اور دکھ کا کوئی احساس نہیں ہوا......؟ جبکہ میری جان! میرے عشق اور میرے جذبات کا خیال رکھا اور رکھتی ہوئی چلی آرہی ہو......'' آکاش نے کہا تو اس کے لہجے کی پشت پر ہلکا سا کرب تھا۔ ''تم جانتی ہو کہ آنکھیں ٹھیک ہوں تو حسن اور کشش میں بڑی سندرتا رہتی ہے۔ میرا روپ اس آنکھ میں کیسا تھا...... کون لڑکی عورت ایسی تھی جو مجھے دیکھ کے میرے حصول کے لئے تڑپ نہیں جاتی تھی...... نیلم کو مجھ سے کیسا پریم تھا......! اس لئے بھی کہ وہ میری آنکھوں میں اسے نہ صرف اپنا سہانا مستقبل دکھائی دیتا اور پھر ان میں ڈوب ڈوب کے خود کو فراموش کر بیٹھتی تھی...... اور انہیں بڑی دیوانگی سے چومتی اور کہتی بھی تھی کہ دنیا میں اتنی خوب صورت کسی کی بھی نہیں ہیں...... یہ جادو بھری ہیں...... جب وہ مجھے اس حالت میں دیکھے گی تو اس کے دل پر کیا بیتے گی......؟ کیا وہ یہ صدمہ سہہ سکے گی؟''

''میری جان دیوتا......!'' امرتا رانی نے اس کے پاس آکر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرلیا...... چندلمحوں تک وہ اس کی دونوں آنکھوں کو بے تحاشا چومتی رہی...... پھر کہنے لگی۔ ''بات یہ ہے کہ تمہاری بینائی زائل ہوجانے پر مجھے بھی کس قدر اذیت اور صدمہ ہوا۔ لیکن میں نے اس کے بارے میں اس لئے نہیں کہا کہ تم دکھی ہوجاؤ گے...... مجھ سے کہا...... سنگیت اور کسی بھی فرد سے پوچھ لو کہ تم اس کے باوجود پہلے کی طرح سندر دکھائی دیتے ہو...... ایک آنکھ کے ضائع ہوجانے پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔''

امرتا رانی نے توقف کرکے اس کی آنکھ اور ہونٹوں کو چوما اور کہنے لگی۔

''اس کا اپائے بھی ہوسکتا ہے......'' اس نے بڑے اعتماد سے یقین دلایا۔ ''دل چھوٹا نہ کرو...... مایوس نہ ہو...... نہ صرف آنکھ بلکہ سنگیت کی شکتیاں بھی لوٹ آئیں گی...... پہلے اس کے لئے ہمیں کالی بھوی کے اس جزیرے سے نکلنا ہوگا...... پھر اس کے بعد ہی میں سوچ پاؤں گی۔ تم دونوں نہ تو پریشان ہو اور نہ ہی کسی قسم کی چنتا کرو۔''

''میری رانی......!''

''تم سچ کہہ رہی ہو کہ میری مفلوج آنکھ کی جگہ سابقہ آنکھ بحال ہوجائے گی......''

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں...... ذرا دھیرج سے کام لو...... اتنے جذباتی نہ ہو...... خود کو قابو میں رکھو۔'' آکاش خوشی سے جو پاگل سا ہورہا تھا۔

پھر اس نے چندلمحوں کے بعد سنگیت کو دیکھا جو یہ سن کر سرشاری ہوگئی اور اس کے چہرے پر شادمان اور آنکھوں میں جیسے دیئے جل اٹھے تھے۔ اس نے بے اختیار امرتا رانی کی گردن میں اپنی سڈول، گداز اور عریاں بانہیں حمائل کردیں، پھر وہ اس کے گالوں اور ہونٹوں کو چومنے لگی تو امرتا رانی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

آکاش کے سینے میں ایک آنکھ سے محرومی کا احساس خلش کے خنجر کی طرح پیوست تھا جسے نکالنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اس نعمت سے محروم ہونے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ ایشور نے انسان کو ایسی نعمت سے نوازا ہوا ہے کہ جس کے سامنے دنیا کی ہر نعمت حقیر اور ہیچ ہے۔ وہی تو بیمار کو تندرستی دیتا ہے...... جسمانی معذوری اور محرومی کا عذاب ان کے لئے واقعی

ناقابل برداشت ہوتا ہوگا، جو مکمل طور پر کسی قوت سے محروم ہو جاتے ہوں گے...... پھر بھی اس پر ایشور کی بڑی دیا تھی کہ اس نے اس کی ایک آنکھ کو سلامت رکھا تھا۔

اگر امرتا رانی اس کے لئے تائید غیبی بن کر آخری لمحات میں جل منڈل نہ آتی تو اس وقت وہ شاید اندھا ہی ہو چکا ہوتا...... بالکل اس کتے کی طرح جس کے نجس روپ میں شیو ناگ اس کے اور امرتا رانی کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔

سورج طلوع ہونے کے بعد جب ہواؤں کی خنکی میں طلائی کرنوں کی حرارت سرایت کرنے لگی تو امرتا رانی نے اس سے کہا کہ ہمیں اب کالی بھومی سے چل دینا ہوگا، اب ہمیں یہاں ٹھہرنا بے مقصد ہی ہے۔

پھر اس کی ہدایت پر اس نے اپنی ایک آنکھ بند کر لی۔ سنگیت نے اس بات پر عمل کیا۔ اور پھر سنگیت اور اس نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے۔

پھر آکاش کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کا بدن روئی کے گالوں اور تیز ہواؤں کے دوش پر تیرتے بادلوں کی طرح ہو گیا ہو۔ وہ خود کو فضا میں اٹھتا اور ہلکے پھلکے پرندوں کی طرح پرواز میں محو محسوس کر رہا تھا......

اس نے لمحہ بھر کے لئے سوچا تھا کہ بلندی سے کالی بھومی کا فضائی جائزہ لے جو ایک پراسرار جزیرہ تھا اور یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس قدر بلندی پر پرواز لیکن وہ اس بات کی جسارت نہ کر سکا۔ سنگیت نے بھی جو اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا پرواز کے دوران ان کے جسم ایک دوسرے کا لمس محسوس کرتے اور امرتا رانی کا بھی......

اس لئے وہ صبر سے پرواز کر رہا اور اس بات سے جیسے باخبر تھا کہ اگر اس نے ایک بار اور ذرا سی دیر کے لئے بھی آنکھ کھول کے جائزہ لیا تو امرتا رانی کا وہ فسوں ٹوٹ جائے گا جس کے سہارے فضا کی وسعتوں میں تیر رہا تھا اور اس کے بعد پھر وہ اپنے بوجھ کا توازن برقرار نہ رکھ پاتا اور زمین پر گر جاتا جس کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔

ایک طرف یہ سبک اندامی کا یہ سفر اور سنگیت کا قرب بڑا فرحت انگیز اور اچھوتا تھا۔ اس کے مہکتے بدن نے آکاش کو یہ سفر لطف انگیز کر دیا تھا۔ سنگیت نے گو اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ امرتا رانی نے اسے بھی پابند کیا ہوا تھا کہ سفر کے دوران وہ اپنی آنکھیں بند کئے رکھے۔ لیکن جب سنگیت کا جسم ٹکرایا تو سنگیت نے اسے اندازے سے چوم لیا تھا۔

خاصی دیر تک یہ سفر جاری رہا تھا اور شاید رہتا بھی اگر امرتا رانی کی مسرور کن آواز اس کے کانوں میں کسی سر کی طرح نہ بج اٹھتی۔

''میرے دیوتا آکاش جی......! یہ فضائی سفر ختم ہوا۔ اب تم دونوں اپنی اپنی آنکھیں کھول دو۔''

پھر آکاش نے اپنی اکلوتی آنکھ کھول دی اور اس سے پیشتر اس نے سنگیت کا نرم و نازک ہاتھ چھوڑ دیا۔

پھر اس نے خود کو سون ہاٹ کے اس ویران جنگل میں کھڑے پایا جہاں سے وہ ناگ راجہ کے خوف کے باعث ناگ رانی اور سنگیت کے ہمراہ جل منڈل کے لئے فرار ہوا تھا۔ قریب ہی ترپال کا وہ مضبوط اور خواب ناک ماحول کا خیمہ جوں کا توں موجود تھا جس کی تنہائی اور قرب میں سنگیت کے وجود میں چھپی ہوئی عورت کو پہلی بار دریافت کیا تھا...... سنگیت کی محبت جو بڑی لازوال اور اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک دوشیزہ ایسا ٹوٹ کے عشق بھی کر سکتی ہے۔

آکاش نے اندر داخل ہونے کے بعد اس کا جائزہ لیا، سنگیت اس کے عقب میں امرتا رانی کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

اس کی لمبی لمبی، گھنی اور سیاہ زلفیں اس کے سینے پر مچل رہی تھیں......

آکاش کو ایک دم سے کچھ خیال آیا تو اس نے چونک کے آس پاس نظر ڈالی، اسے وہ اندھا سیاہ کتا کہیں نظر نہ آیا۔

''امرتا رانی......!'' آکاش نے پوچھا۔ ''شیو ناگ کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آ رہا ہے؟''

''میں کیا کروں...... جلدی میں مجھ سے بھول

''لیکن امرتا رانی بھی تم سے کیسا ٹوٹ کر عشق کرتی ہے۔'' سنگیت نے پلکیں جھپکائیں۔

''مجھے اس بات سے انکار نہیں......'' آکاش نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔ ''تم خوب جانتی ہو کہ اس کی چاہت نفس نفس کی تسکین تک محدود ہے...... گو کہ اس کے عشق میں ایک گہرا اور انوکھا جذبہ ہے...... مجھے اندازہ نہ تھا کہ وہ میرے عشق میں اتنی دور چلی جائے گی۔ وہ نہ صرف بڑی ہمدرد اور مخلص بھی ہے اور تم نے اس بات کو محسوس بھی کیا ہوگا...... اور پھر اس کی محبت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے نسل کی کوئی عورت ہے......''

''لیکن تم بھی تو اس سے بے پناہ محبت کرنے لگے ہو......؟'' سنگیت کہنے لگی۔ ''میں نے اس بات کو محسوس کیا ہے اس سے تمہاری محبت محض وقت گزاری نہیں اور نہ اسے کھلونا بنایا...... وہ تمہیں اور تم اسے ہر طرح سے خوش کرتے رہے ہو......''

''یک بات کہوں کہ یہ سچی بات ہے کہ اس کے کارن میں ابھی تک محفوظ ہوں۔'' آکاش کہنے لگا۔ ''حالات نے مجھے اس کے لئے اس قدر قریب کر دیا اور میں اس سے سمجھوتا اور اسے خوش کرنے کے لئے مجبور ہوا کہ وہ کچھ پراسرار قوتیں حاصل ہیں...... جب کہ اس نے مجھے وقتی سکون میں پہنچایا ہے جس کی بدولت مجھے اسے خوش کرنا اور دل بہلانا پڑتا ہے۔ یہی ایک تعلق میرا اس سے ہے۔''

''لیکن تم نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ نیلم کو پانے کے بعد بھی تم امرتا رانی سے کنارہ کش ہو سکو گے؟''

''کیوں نہیں...... وہ میرے لئے ایک بھولا بسرا خواب بن جائے گی...... اسے دل بہلانے کے لئے اپنی نسل ملی اور پھر انسانوں کی آیا اس میں حسین عورت کا بہروپ بھر کے وقت گزاری کے لئے کی کیا ہوگی......؟ تو نہیں اور سہی...... اور نہیں اور سہی......''

سنگیت اس کی بات سن کر ہنس پڑی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... اس لئے کہ وہ گلابی ناگن ہے...... اس کا چہرہ گلابی ہے...... اسے دنیا میں ہر کسی مرد کا، لڑکے کا سہارا مل جائے گا...... لیکن کیا تم اس گلابی بدن ناگن کو بھول سکو گے......؟'' جس نے تمہارے عشق کے جنون میں تمہیں ہر طرح سے سرفراز کیا...... یہ منکہ جو اس کی کبھی ملکیت رہا تھا ایک سنیاسی بابا نے اسے حاصل کر کے تمہیں دے دیا جب کہ کوئی ناگ ناگن اپنا منکہ کسی کو بھی دان نہیں دیتے ہیں...... اس نے اس منکہ کو حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اور پھر یہ منکہ تمہارے چرنوں میں ڈال دیا۔ اس لئے کہ اسے تم سے عشق ہو گیا تھا...... وہ عشق جو آج اب بھی جنون بنا ہوا ہے...... وہ سچ مچ کی سی عورت بن کے تم سے پیار کرتی ہے...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم نیلم پنچھی کے حصول کے لئے تڑپ رہے ہو...... کیا ایسی محبت کرنے والی اور بے پناہ، پرکشش عورت کو دل سے نکال سکو گے......؟ نیلم کو پانے کے بعد اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرو گے......؟ جو وہ تمہاری کمزوری بھی ہے۔''

سنگیت بے ربط اور جذباتی انداز میں بولتی چلی گئی۔

''سنگیت جان......! مجھے اندازہ نہ تھا کہ تم اتنی سندر ہو...... تمہارا دل بھی تمہارے مکھڑے کی طرح خوب صورت ہے...... تم اتنی عظیم اور بلند عورت ہو کوئی اور سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ تصور کر سکتا ہے۔ تم نے تو مجھے بن مول خرید لیا ہے......'' اس نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا...... ''میری زندگی میں تم جیسی عورت کبھی نہیں آئی...... اور نہ آئے گی۔''

جب وہ دونوں اس شاہی خیمہ نما جھونپڑے سے باہر آئے تو شام کا دھندلکا پھیلنے میں قدرے دیر تھی۔ پھر وہ دونوں ان درختوں کی جانب لپک گئے جن پر پکے ہوئے پھل تھے...... انہیں دیکھنے سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں بڑا رس ہے اور وہ لذیذ اور میٹھے ہوں گے۔ یہ پھل آم سے مشابہ تھے، سنگیت کسی گلہری کی طرح ایک درخت پر چڑھ گئی جس کی ہر شاخ پھلوں

سے لدی ہوئی تھی۔ اس نے بہت سارے پھل ایک ایک کر کے آکاش کی طرف پھینکا۔ آکاش انہیں پکڑ کے زمین پر ایک طرف رکھتا گیا اور سنگیت سے بولا کہ بس کرو۔ یہ پھل دو تین دن کے لئے کافی ہیں۔ لیکن وہ نہ مانی اور ایک شاخ کی طرف بڑھی تو اس پر توازن قائم نہ رہ سکا۔ وہ پھسل کر گرنے لگی تو آکاش نے سرعت سے لپک کے اسے اپنی گود میں لے لیا۔

''اگر تمہاری کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی تو......''

آکاش نے پیار بھری خفگی سے اسے ڈانٹا۔

سنگیت نے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر کے شوخی سے جواب دیا۔ ''یہ موقع کہاں ملتا......؟''

تھوڑی دیر تک وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز رہے۔ پھر وہ اس کی گود سے اتر آئی۔ پھر بہت سارے پھل اپنی جھولی میں بھر لئے...... پاس جو جھیل تھی اس میں دھو کر لے آئی۔

وہ دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پھل کھانے لگے۔ سنگیت نے کہا۔

''کیوں آکاش جی......! ان میں رس، لذت اور ذائقہ بالکل آم جیسا نہیں ہے...... یہ شاید یہاں کا آم ہے۔''

''ہاں...... آکاش نے سر ہلا دیا۔ ''اس لئے تو میں نے دس بار، پھل کھا لئے...... اسے چوستے ہی جسم میں کیسی تازگی اور توانائی آ گئی۔ میرا خیال ہے کہ ہم جب تک یہ آم ہوتے اور کھاتے رہیں۔''

''میں یہ پھل کھا کر پھر درختوں پر چڑھ چڑھ کر تیس چالیس پھل توڑ دوں گی۔ دیکھو...... طبیعت سیر ہی نہیں ہو پاتی ہے۔''

آکاش کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ کیوں کہ اس کی نگاہ مخالف سمت اٹھ گئی۔ اس نے اس سمت سے امرتا رانی کو آتے دیکھا۔ لیکن وہ اکیلی نہ تھی۔ مگر اس کے بشرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ جیسے اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہو۔ وہ جو دو تین گھڑیاں غائب تھیں شاید کہیں چلی گئی تھی۔ لمبی مسافت نے اسے بے حد تھکا دیا ہو۔

دوسرے لمحے اس کی وجہ اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کے ہمراہ بڑی بڑی خوب صورت روشن آنکھوں والا ایک کسرتی بدن کا دراز قد مرد تھا۔ وہ سینہ تانے ایسا چل رہا تھا جیسے امرتا رانی اس کی محبوبہ ہو...... یہ دیہاتی جوان مرد تھا جس نے امرتا رانی کی کمر میں بڑی بے تکلفی سے ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ امرتا رانی کی لچکیلی شاخ گل جیسی کمر اس کے بازو کے حلقے میں تھی۔

ان دونوں کی یہ بے تکلفی آکاش کو زہر لگی۔ وہ اندر ہی اندر جل گیا۔ اس کے لئے یہ منظر بڑا ناگوار تھا۔ اس نے امرتا رانی کو صرف اپنی ملکیت سمجھا ہوا تھا۔ یہ بات، اس کے لئے بڑی ناقابل برداشت تھی کہ اس کی نظر کے سامنے کوئی دوسرا مرد امرتا رانی سے اس قدر بے تکلفی سے، پیش آئے۔

''وہ پاجی......! تو اس لڑکی کی کمر سے ہاتھ اٹھا لے......'' آکاش نے نفرت بھرے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''وہ کیوں اور کس لئے......؟'' وہ ڈھیٹ پن سے ہنسا۔ ''میں تیری بات اور حکم نہ مانوں تو......؟ تو کیا بگاڑ لے گا میرا......؟''

''میں جو کہہ رہا ہوں کیا تیری سمجھ میں نہیں آیا......؟'' آکاش نے زمین سے ایک ٹوٹی شاخ اٹھا لی۔ اسے فضا میں لہرائی۔ ''تو نے ہاتھ نہیں ہٹایا تو تیری کھوپڑی پھوڑوں گا...... تو کیا سمجھ رہا ہے خود کو......؟''

''تو ایسا کہہ رہا ہے جیسے یہ تیری جورو ہو......'' وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور اس نے امرتا رانی کو اور قریب کر لیا۔ امرتا رانی کے جوان بدن کے لمس نے اسے دیوانہ کر دیا۔ اس نے آکاش کی دھمکی سن کے پروانہ کی تھی۔

امرتا رانی نے آکاش کے تیور سے اندازہ کر لیا کہ آکاش اس دیہاتی کا سر پھاڑ دے گا۔ اس نے فوراً ہی کہا۔

''آکاش جی...... غصہ میں نہ آؤ...... جذباتی نہ ہو...... سمجھنے کی کوشش کرو۔''

امرتا رانی کے لہجے میں سمجھانے کا جو انداز تھا اس نے آکاش کے پیروں میں جیسے بیڑیاں ڈال دیں، پھر اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ امرتا رانی اس شخص کو اپنے عشق سے کوئی کھیل..... کھیل رہی ہے، کوئی جذبہ کارفرما ہے۔ اس لئے اس مرد کو بے تکلف ہونے دیا ہے۔ پھر آکاش رک گیا۔ اس نے شاخ کو زمین پر پھینک دیا۔

''کان کھول کر سن لیا نا..... تیری کھوپڑی میں آگیا...'' امرتا رانی کی بات سن کے اس نے امرتا رانی کو چمٹا سا لیا۔ ''میں تجھے بتادوں کہ یہ میری کٹیا میں چھپی دیہاتی آئی ہے..... میرے گاؤں کی لڑکیاں، عورتیں اور کنواریاں مجھ پر مرتی ہیں..... میں ایسی ویسی کسی لڑکی، کنواری اور عورت پر دل وار نہیں کرتا ہوں..... یہ واقعی نہایت حسین اور بے مثال پرکشش ہے..... اس نے جو رقص کیا اس نے مجھے گھائل کردیا..... اس نے کیا حسن اور شباب پایا ہے..... کیا رقص پیش کیا..... اس لئے میں اس کے سراپا پر مرمٹ گیا ہوں..... کھیتوں میں فصل کٹ رہی ہے اس لئے میں میلوں کی مسافت طے کرکے آیا ہوں..... ورنہ میں وہیں اسے فتح کرلیتا۔''

اس مرد کی ہرزہ سرائی سن کر اس کا خون کھول اٹھا۔ اس نے اپنی زبان بندی اس لئے کرلی تھی کہ امرتا رانی نے، اس مرد کی نگاہیں بچا کے غیر محسوس انداز سے اشارہ کرکے سمجھایا تھا۔ آکاش نے دل پر جبر کرکے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

''کیا یہ تیرا غلام ہے جو مجھے تیرے ساتھ دیکھ کر برداشت نہیں کررہا ہے..... یہ کون ہے تیرا..... تو مجھے جلدی سے بتادے یہ کسی پالتو کتے کی طرح لگ رہا ہے۔'' وہ تحقیر آمیز انداز سے بولا۔ پھر اس نے امرتا رانی کی پشت سہلائی۔

ناگ رانی نے اس کے اور قریب ہوکر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بڑی آہستگی سے کچھ کہا جسے سن کر وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

اس کی آواز میں بھاری پن تھا۔ وہ امرتا رانی کے ساتھ لمبی مسافت طے کرکے آیا تھا۔ ویرانے اور سنسان علاقے سے گزرتے ہوئے اس نے جیسے خوب فائدہ اٹھایا تھا..... امرتا رانی کے بکھرے بالوں اور بے ترتیب لباس سے ظاہر ہوتا اور اس کے چہرے پر نشان ابھرے ہوئے تھے جیسے بھڑوں نے کاٹا ہو۔ اس کی دست درازیاں کو محسوس کرکے آکاش نے سوچا کہ امرتا رانی نے پھر بھی برداشت کرلیا۔ وہ تو زبردست شکتی کی مالک ہے۔ اس نے صرف نازیبا حرکتوں کا مزا کیوں نہیں چکھایا۔

پھر وہ دونوں خیمے کی طرف بڑھے..... بڑھتے بڑھتے اس دیہاتی نے جھک کر بڑے والہانہ انداز سے امرتا رانی کو گود میں اٹھالیا اور اس کے چہرے پر جھکا تو امرتا رانی نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کردیں، یہ دیکھ کر آکاش کا لہو رگوں میں کھولنے لگا۔ چوں کہ امرتا رانی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اس لئے وہ خون کے گھونٹ پی گیا۔ ورنہ اس دیہاتی کا سر پھاڑ کے اور حلیہ بھی بگاڑ دیتا۔

جب وہ دونوں خیمے میں گھس گئے تو اس نے سنگیت سے کہا۔ ''صورت حال کیا بڑی مشکوک نہیں لگتی ہے؟''

''ہاں.....'' آکاش نے سر ہلادیا۔ ''تم یہاں رکو..... میں ابھی آتا ہوں۔''

پھر وہ دبے پاؤں خیمے کی طرف بڑھا۔ اس نے چند قدم طے کئے تھے کہ امرتا رانی تیزی سے باہر آتی دکھائی دی۔ اس کا چہرہ متغیر سا تھا اور اس کی آنکھوں سے ایک وحشت سی جھانک رہی تھی وہ پاس آکر سرگوشی میں بولی۔

''آکاش جی.....! سنو..... اپنا غصہ قابو میں رکھو..... میں نے اسے جھانسہ دے کر پھانسا..... اگر اس کمینے کو ذرا سا بھی شک ہوگیا تو پھر ساری محنت پانی میں مل جائے گی..... یہ ذلیل بڑی مشکل سے قابو میں آیا ہے۔''

امرتا رانی نے اسے کچھ کہنے اور پوچھنے کا موقع نہیں دیا اور جس طرح آئی تھی اس طرح واپس خیمے میں گھس گئی۔

امرتا رانی کی وضاحت نے معاملہ کو اور گھمبیر بنا دیا۔ وہ ایک طرح سے الجھ گیا۔ امرتا رانی کی وضاحت اسے بڑی پراسرار سی لگی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ بے آواز قدموں سے خیمے کی طرف بڑھا۔ اس کی دیوار موٹی چٹائی کی تھی جس میں ایک اتنی بڑی جھری سی تھی کہ ایک آنکھ سے بہت کچھ دیکھا جا سکتا تھا۔ پھر وہ اس میں آنکھ لگا کر اندر جھانکنے لگا۔ اس نے پتوں کے پیال پر ان دونوں کو دراز دیکھا۔ وہ دیہاتی اس پر قابو پا کر بے بس کرنے پر تلا ہوا تھا۔ امرتا رانی نے اسے بڑی ملائمت سے کہا۔

''تم ذرا دم لو...... آرام کرو...... اتنی لمبی مسافت طے کر کے ہم دونوں آئے ہیں...... میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔''

''تمہارے اس نامراد عاشق سے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں وہ غصے میں آ کر مار ہی نہ ڈالے مجھے......''

''اس کی مجال نہیں کہ وہ تم سے لڑ بھڑ سکے اور اندر گھس آئے......'' امرتا رانی نے اس کا رخسار تھپ تھپایا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ مجھ سے عشق ضرور کرتا اور مجھے کسی مرد کے ساتھ دیکھ نہیں سکتا ہے...... اور پھر میں نے اسے آج تک چھونے نہیں دیا...... تم پہلے میرے مرد ہو گے، میں تمہاری ہر بات کا پالن کر دوں گی۔''

''میں نے آج تک تجھ جیسی ناری نہیں دیکھی...... تو میرے صبر کا امتحان نہ لے...... بس تو حکم کر...... میں ابھی اس کا کام پل بھر میں نمٹائے دیتا ہوں...... میں تجھے دیکھ دیکھ کے پاگل ہوا جا رہا ہوں...... راستے میں بھی تو نے مجھے زیادہ خوش نہیں کیا...... بس یہ کہتی رہی کہ تھوڑا سا راستہ رہ گیا ہے...... میرے ارمان پورے نہ ہو سکے......''

آکاش کو بے اختیار سادھو مہاراج کے الفاظ یاد آئے...... وہ سنیاسی بابا تھے...... گرو مہاراج بھی تھے...... انہوں نے اس سے کہا تھا کہ یہ گلابی ناگن...... بڑی عیاش فطرت کی ہے۔

لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ امرتا رانی نے اس شخص کا سامنا کیوں کرایا؟

وہ اس مرد کے ساتھ کہیں بھی رنگ رلیاں منا سکتی تھی...... اس کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی تھی...... کیا اس میں امرتا رانی کی کوئی مصلحت تھی...... وہ یہ جتانا چاہتی تھی کہ اسے مردوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ یا تو اسے جلا رہی ہے یا پھر کوئی انجان جانا، کھیل، کھیل رہی ہے؟

پھر وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اس لئے امرتا رانی کو اگر اس دیہاتی جوان نے بے بس کیا تو پھر اس سے رہا نہیں جائے گا۔ ہٹنے سے قبل اس نے امرتا رانی کی یہ بات سن لی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

''ہاں تم نے اتنا دھیرج کیا تھوڑی دیر اور سہی...... کیوں کہ وہ سرِ شام ہی سو جاتا ہے...... وہ نشہ کرتا ہے...... یہ رات ہم دونوں سہاگ رات کی طرح منائیں گے......''

سنگیت جو ایک کونے میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس گیا تو سنگیت نے پوچھا۔ ''کیا وہ دونوں بہک رہے ہیں؟''

''نہیں......'' آکاش نے جواب دیا۔ ''وہ اس مرد سے کہہ رہی ہے کہ میں تھوڑی دیر میں سو جاؤں گا...... پھر میں اور تم اس رات کو رنگین بنا کر گزاریں گے...... دھیرج رکھو۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں۔''

گو وہ سنگیت کے پاس ہی تھا لیکن اس کی ساری توجہ خیمے کی طرف تھی اور وہ چشمِ تصور میں خیمے میں ان دونوں کو مہکتا دیکھ رہا تھا۔ امرتا رانی کی اس حرکت سے اس کے دل پر چوٹ لگی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا ان دونوں کو

جذبات کی افراتفری میں مبتلا پار ہا تھا۔ لمحہ لمحہ کسی صدی کی طرح بن گیا تھا۔

پھر آکاش نے سوچا کہ امرتا رانی کو یہ اختیار اور آزادی حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرتی پھرے..... وہ اسے کسی حرکت سے باز نہیں رکھ سکتا۔ وہ اس کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ کون ہوتا ہے اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے والا..... یہ اس کا اس پر بڑا احسان ہے کہ ہر مشکل اور افتاد میں اس کے کام آرہی ہے..... آخر امرتا رانی اس کی نسل کی عورت نہیں ہے..... وہ ایک خوب صورت ناگن ہے..... جانے اس کی زندگی میں کتنے مرد آچکے ہیں اور آرہے ہیں..... یہ اور بات ہے کہ وہ اس سے عشق کرتی ہے..... اس کا عشق جنون ہے اور اس میں ایک دیوانگی ہے..... یوں تو نہ جانے کتنی ناگنوں نے عورت کا بہروپ بھر کے اس سے عشق کیا۔ لیکن ان کا عشق صرف اس کی خوب صورتی سے دل بہلاتا تھا.....

وہ جذباتی ہوکر نہ جانے کیا کچھ سوچتا جارہا تھا کہ امرتا رانی خیمے سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ وہ اس کی سمت آرہی تھی۔ لیکن اس کے بشرے اور لباس سے ایسا لگتا تھا کہ وہ دیہاتی اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا۔

جب امرتا رانی اس کے پاس آئی تو وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''کیا رنگین رات گزار آئی ہو.....؟ دل میں کوئی ارمان حسرت باقی رہ گئی ہے..... وہ دیہاتی بڑا خوبرو اور کڑیل نوجوان ہے..... اس نے دل خوش کردیا ہوگا۔''

امرتا رانی اس کی بات سن کر غصے میں آنے کے بجائے ہنس پڑی۔ پھر اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کرکے بولی۔

''میرے من کے دیوتا.....! تم اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچنے لگے ہو..... میں نے کبھی اس بات کا برا نہیں منایا کہ تم نے کتنی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ دل بہلایا..... میں پہلے تمہیں اس خیمہ میں سنگیت کے پاس چھوڑ گئی تھی اور آج بھی تم دونوں کتنی گھڑیاں ساتھ رہے..... لیکن میرے دل میں نہ تو حسد آیا۔ جلن ہوئی۔ برا منایا..... خوشی سے تم دونوں ایک ساتھ چھوڑ گئی..... گو مجھے اس صفائی کی ضرورت نہیں..... تم میری بات پر وسواس کرو..... وہ اپنی ہٹ پوری نہ کرسکا۔ جب میں اسے یہاں لارہی تھی راستے میں اسے من مانیاں کرتا تھا۔ ایسا نہ کرتی تو یہ شکار ہاتھ سے نکل چکا ہوتا..... میں اس سے یہ کہہ کر آئی ہوں میں دیکھ آتی ہوں کہ تم کہاں ہو.....؟ سوگئے یا نہیں..... میں اس کی تسلی کرآئی ہوں..... میں اسے تمہاری خاطر یہاں لائی ہوں۔''

''میری خاطر.....؟ کیوں تم میرا مذاق اڑا رہی ہو..... مجھے بے وقوف بنارہی ہو..... یہ کیوں نہیں کہتی ہو کہ اس شاہی خیمہ اسے جشن منانے لائی ہو.....'' آکاش نے طنز کیا۔ ''جاؤ جشن مناؤ.....''

''میری جان.....! میرے دیوتا.....! تم مجھ سے بدظن نہ ہو..... من میں کھوٹ نہ ڈالو.....'' امرتا رانی نے اس کے اور قریب آئی اور سرگوشی کی۔ ''یوں سینکڑوں جوانوں اور مردوں کی کوئی کمی نہ تھی..... میں نے کس شکل سے اسے تلاش کیا۔ یہ میرے دل سے پوچھو۔''

''اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہزاروں میں ایک ہے.....'' آکاش نے پھر اس پر طنز کیا۔

''تم نے ایک بات پر غور کیا کہ اس میں کون سی ایسی خاص بات ہے.....؟ جس کے لئے مجھے گھڑیوں وقت برباد کرنا پڑا۔''

''خاص بات.....؟'' آکاش نے کہا۔ ''وہ نہ صرف کڑیل مرد ہے بلکہ بھرپور جوان بھی ہے۔''

''نہیں..... یہ بات نہیں..... تم نے اس کی آنکھوں پر غور کیا.....؟ توجہ دی تھی؟'' امرتا رانی نے کہا۔

''اس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی اور خوب صورت ہیں۔'' آکاش اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔

''سنگیت.....!'' امرتا رانی نے اسے مخاطب کیا

جو خاموش کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''جی...... رانی جی......'' سنگیت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا اس کی آنکھیں ہو بہو آکاش جیسی نہیں ہیں......؟'' امرتا رانی نے اسے یاد دلایا۔ ''ذرا سوچو......''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو......؟'' سنگیت نے ایک دم سے غور کر کے کہا۔ ''لیکن اس کی آنکھوں سے کیا لینا دینا ہے؟''

''میں واپس جا کر اسے فریب دے کر سلا دوں گی۔ اسے گہری نیند سلا کر ہی اپنا مقصد اور کام پورا کرسکوں گی...... اس کے لئے مجھے اس کی ہر بات ماننا پڑے گی...... اس کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ اس کا گہری نیند میں سونا ضروری ہوگا۔''

''وہ کس لئے...... تمہارا مقصد اور کام کیا ہے......؟'' آکاش نے پوچھا۔

''اس لئے کہ اس کی بائیں آنکھ نکال کے تمہاری خراب آنکھ کی جگہ لگا دوں گی......'' امرتا رانی نے جواب دیا۔ ''پھر تمہاری دونوں آنکھوں میں ذرا برابر بھی فرق محسوس نہیں ہوگا...... نہ تم یہ محسوس کرو گے تمہاری اس آنکھ کی بینائی لوٹ آئی ہے...... وہ پیدائشی طور کی لگے گی......''

''کیا کہا......؟'' آکاش ایک دم سے اچھل پڑا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ ''تم اس کی آنکھ سے مجھے روشنی دو گی؟''

''ہاں......'' امرتا رانی نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولی تھی۔ ''یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنی مرضی سے سو جائے گا...... میں جبھی تمہاری آنکھ سے اس کی آنکھ بدل دوں گی......''

''کیا اسے اس بات کا احساس نہیں ہوگا؟'' آکاش نے سوال کیا۔ اس کے دل پر جو کثافت تھی وہ ڈھل گئی۔

''نہیں...... اس لئے کہ جب وہ صبح بیدار ہو کر باہر نکلے گا تو اسے ٹھوکر لگے گی اور اس کی بائیں آنکھ ضائع ہو جائے گی۔ وہ یہ سمجھے گا کہ اس کے گرنے سے اس کی آنکھ ضائع ہوگئی ہے...... لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوگا۔''

''پھر کیسے ہوگا......؟ کیا تم کسی ڈاکٹر کی طرح میری اور اس کی آنکھ کا آپریشن کرو گی؟'' آکاش نے تجسس سے دریافت کیا۔

''وہ یوں کہ مجھے ساری رات کھلونا بنا کے کھیلنا چاہتا ہے...... اس خیمہ کے ایک کونے میں صراحی میں شراب رکھی ہوئی ہے جو میں اسے پلا دوں گی...... وہ شراب پیتے ہی مدہوش ہو کر بے ہوش ہو جائے گا۔ میں اس اس لئے شراب پلاؤں گی کہ بے ہوشی کی حالت میں ان جانے خواب دیکھتا رہے گا...... صبح بیدار ہو کر وہ مجھے بستر پر نہ پا کر میری تلاش میں باہر نکلے گا۔ شراب کی وجہ سے اس کے قدموں میں لغزش ہوگی۔ پھر میں اسے اپنی شکتی سے گرادوں گی جس سے اس کی آنکھ پر چوٹ لگے گی۔ وہ یہ سمجھے گا کہ گرنے کے کارن آنکھ اور بینائی سے محروم ہو گیا ہے......''

''کیا تم مجھے بھی شراب پلا کر بے ہوش کر دو گی......؟'' آکاش نے دریافت کیا۔

''ہاں اسے سلا کر بے ہوش کر کے تھوڑی دیر میں آؤں گی...... تمہیں اس کے برابر لٹا دوں گی...... پھر میں اپنی شکتی بھری آنکھیں تمہاری آنکھوں میں ڈال دوں گی تم گہری نیند سو جاؤ گے...... جب تم جاگو گے تو تمہاری دونوں آنکھیں روشن اور زائل شدہ آنکھ سابقہ حالت میں لوٹ آئے گی اور اس کی ایک آنکھ غائب ہو چکی ہوگی؟''

''کیا میری خراب آنکھ صحیح سلامت دیکھ کر اسے شک تو نہیں ہو جائے گا؟''

''اس نے اس بات کو محسوس کیا اور نہ ہی اس نے تمہیں غور سے دیکھا تھا۔ تم چنتا نہ کرو'' اور امرتا رانی نے دلاسا دیا۔ ''اور ہاں...... میں تمہیں ایک بات جو نہایت ضروری ہے بتانا بھول گئی ہوں۔''

''وہ کیا......؟'' آکاش نے سوال کیا۔

''وہ جب تک زندہ رہے گا۔ اس وقت تک تمہاری متاثرہ آنکھ میں روشنی رہے گی...... جس سے وہ مرے، گا اس کی چتا جلائی جائے گی تمہاری یہ آنکھ روشنی سے محروم ہو جائے گی۔'' امرتا رانی نے بتایا۔

''کیا یہ ممکن نہیں کہ میں کبھی بینائی سے محروم نہ ہوں......'' آکاش نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

''نہیں...... میرے دیوتا! میری جان......!'' امرتا رانی نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ''اس آنکھ کی بینائی بحال کرنے کے لئے مجھے کوئی دوسرا نیا آدمی ڈھونڈنا پڑے گا...... تمہارے جیون میں یہ چکر چلتا رہے گا۔''

''میرے خیال میں اس کی آنکھ میری آنکھ سے، بدل دینا...... کیا یہ ظلم نہیں ہے؟ انیائے نہیں ہے؟'' آکاش بولا۔

''نہیں...... یہ ظلم نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے، اس کے کئے کی اسے سزا ملے گی۔'' امرتا رانی بولی۔

''کس کئے کی......! کیا وہ اچھا آدمی نہیں۔'' سنگیت جو خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی درمیان میں بول اٹھی

''اچھا آدمی نہیں...... بلکہ بڑا سنگ دل، ہے...... اس نے ایسی لڑکیوں، عورتوں کے چہروں پر تیزاب پھینک کر ان کی بینائی ضائع کی جو اس کی بات سے انکار کر کے رات اس کے ہاں نہیں گزارتی تھیں۔ اس نے بڑی زندگیاں خراب کیں...... اب وہ اس قدر بدصورت ہو جائے گا بلکہ میں اسے کردوں گی کہ وہ گھر سے نکلنا اور ظلم کرنا بند کر دے گا۔''

''ایسے ظالم کو ایسی عبرت ناک سزا ملنا ضروری ہے۔'' سنگیت بولی۔ ''مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ اسے سزا تو مل رہی ہے۔''

''ابھی تو میں اس پاپی کے پاس جا رہی ہوں جو میرے انتظار میں ان جانے سپنے دیکھ رہا ہوگا۔'' امرتا رانی بولی۔

آکاش کو مطمئن کرنے اور اس کی غلط فہمی دور کرنے اور دوبارہ بینائی بحال ہونے کی نوید سنا کر امرتا رانی دوبارہ خیمے میں گھس گئی...... انتظار کی ایک گھڑی نہ صرف بڑی کٹھن بلکہ اذیت ناک بھی تھی...... سنگیت اور آکاش کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس دیہاتی نے امرتا رانی کو قابو میں کر کے بے بس کر لیا ہے لیکن آکاش جانتا تھا کہ اس دیہاتی کے لئے امرتا رانی پر قابو بڑا دشوار سا ہے۔ وہ اسے شیشے میں اتارنے کے لئے ترکیب کر رہی ہوگی۔

ایک گھڑی بیت جانے کے بعد خیمہ کا دروازہ کھلا اور امرتا رانی نے باہر جھانکا اور آکاش کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''رات سرد ہو چلی تھی۔ وہ انتظار میں سنگیت کو لئے بیٹھا ہوا تھا۔ امرتا رانی کا اشارہ دونوں خیمہ کی جانب بڑھ گئے۔

آکاش نے اندر داخل ہونے کے بعد دیکھا کہ ایک مٹی کا دیا روشن ہے۔ اس کی لو اس قدر تیز تھی کہ خیمہ کے اندر کا ذرہ ذرہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی مشعل مانند روشنی میں وہ دیا ہتی چتوں کے کشادہ پیال پر وہی دیہاتی بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ بے حس و حرکت...... اس کے پاس امرتا رانی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت اس پر ایک بلا کی سنجیدگی کی چھاپ تھی۔

''اس کے بائیں ہاتھ پر اوندھے ہو کر لیٹ جاؤ......'' امرتا رانی نے کسی معالج کے انداز میں اسے ہدایت کی۔ اس سے یہ خیمہ جیسے آپریشن تھیٹر لگ رہا تھا۔ آکاش نے فوراً ہی اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

اس کے دراز ہونے کے بعد امرتا رانی اس کے سرہانے پہنچی۔ پھر اس کی ہدایت پر آکاش نے نظریں ملائیں اور پھر پھریری لے کر رہ گیا۔ خیمہ کی روشنی میں اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور ان میں سے خارج ہونے والی نادیدہ مقناطیسی لہروں کا ایک طوفان اس کی آنکھ کے راستے اس کے بدن میں سرایت کرنے لگا۔

(جاری ہے)

انوکھا ہمسفر

مدثر بخاری-شہر سلطان

کیا ایسا ممکن ہے کہ مرنے کے بعد بھی چاہت و خلوص کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو کیوں؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد بھی چاہت و محبت قائم رہتی ہے اور مرنے والوں کی روحیں اپنے چاہنے والے سے ملتی ہیں، حقیقت کہانی میں ہے۔

عشق و محبت اور چاہت و خلوص کی ایک انمٹ کہانی جو پڑھنے والوں کے ذہن سے محو نہ ہوگی

''**تم** اپنی دنیا میں واپس کیوں نہیں چلی جاتی گل زارا...... خدارا تم یہاں مت آیا کرو۔''

''کیوں نہ آؤں میرے سرتاج...... میں نے وعدہ کیا تھا کہ مرنے کے بعد میں ہر روز آپ سے ملنے ضرور آؤں گی......'' ایک میٹھی ملائم آواز ابھری۔

''تمہارا وعدہ اپنی جگہ قائم ہے اور پچھلے پچیس سالوں سے تم بلاناغہ مجھ سے ملنے آتی ہو۔ مجھے بھی بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے تم سے مل کر...... مگر میرا راز افشا نہ ہو جائے۔ لوگ مجھے پاگل سمجھنے لگیں گے کہ ایک نادیدہ وجود سے کیوں کر اور کیسے بات چیت کرتا ہوں......'' وہ بولا۔

''مطلب کہ تم لوگوں سے خوفزدہ ہو۔ وہ لوگ جو کسی کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لوگوں کا کیا ہے جتنے منہ اتنی

باتیں ......!"

"کبھی تو تم ٹھیک ہو گل زارا...... اچھا یہ بتاؤ تمہیں مری اور کالام کا سفر یاد ہے۔ جب تم نتھیا گلی میں گھوڑے سے گر گئی تھی۔"

پھر مسکرانے اور قہقہوں کی آواز آنے لگی......

"ہاں اور آپ نے نمک والی چائے پلائی تھی۔ غلطی سے چینی کے بجائے نمک انڈیل دیا تھا۔"

"یہ سب تمہاری شرارت تھی...... اور تم نے شاپنگ کے دوران چاکلیٹس چوری کی تھی۔ قسم سے اگر پکڑی جاتی تو عزت کا ستیاناس ہو جاتا۔ حالانکہ وہ سب ایک مذاق تھا اور وہ لمحہ یاد ہے جب ہم تین گھنٹے چیئر لفٹ پر کھڑے رہے تھے۔ بالکل مری کے درمیان میں، سرسبز وادیوں کے عین اوپر، بہتی آبشاروں اور بادلوں کے جھرمٹ میں......!"

"اور تبھی تم بیت بازی کا مقابلہ ہار گئی تھی......"

"سب کچھ یاد ہے......!" وہ بولی۔

"مگر تم مجھے کیوں چھوڑ کے چلی گئی...... مجھے ادھورا کر گئی، تم جب سے میری زندگی سے گئی ہو میرا دل ویران ہو گیا ہے۔ جینے کی وجہ صرف تم ہی تھی...... میری زندگی کی رونق صرف تم سے ہی تھی......" وہ روہانسی ہو گیا تھا......

"اسی لئے مجھے یہاں مت آنے کا کہتے ہو، مجھے معلوم ہے تم میرے بغیر رہ نہیں سکتے، مرنا ایک حقیقت ہے، مگر میری موت حادثاتی نہیں تھی۔ بلکہ جان بوجھ کر میری زندگی کا چراغ گل کر دیا...... میرے قاتلوں کو ایک نہ ایک دن ضرور سزا ملے گی...... اچھا اب میں چلتی ہوں، کل آؤں گی۔" پھر آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

وہ کارڈیالوجی کا اسٹاف کوارٹر تھا۔ میرے انکل کا تیسرے دن بائی پاس ہونا تھا۔ ہم لوگ پچھلے ایک ماہ سے اسپتال میں موجود تھے۔ اس دوران اسپتال کے، تمام ورکرز سے میری اچھی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ نہ صرف مریضوں کے لواحقین کے ساتھ بلکہ ڈاکٹرز اور نرسوں سے بھی اچھی اور ویل بی ہیو کمیونیکیشن رہی تھی۔

ہم دوسری منزل پر تھے۔ بیسمنٹ پر کینٹین، واش روم، ایکسرے لیبارٹریز، تمام ڈاکٹرز کے آفس موجود تھے۔ میں آزادانہ گھومتا تھا۔ ماحول اور لوگوں سے کافی انسیت ہو گئی تھی۔

عملے کے لوگوں میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو پانچ وقت نماز ادا کرتا، خاموش اور ملنسار طبیعت کا ملک، عمر 50 سال کے نزدیک، سفید داڑھی، ہر کسی سے مسکرا کر ملنے والا، عمر حیات خان نے لڑکپن، جوانی اور اب بڑھاپے کے دن اسی کارڈیالوجی میں گزارے، مجھے یہاں صرف عمر حیات کی شخصیت متاثر کن لگی...... اس کے فلاحی کام بہت شاندار تھے۔ فارغ وقت میں مریضوں کی فائلیں تیار کرانا، لوگوں کو صحیح گائیڈ کرنا، درخواستیں لکھ کر دینا، دوائیوں کی تفصیل سمجھانا وغیرہ وغیرہ۔

اسی کی بدولت سارا اسپتال چمک رہا ہوتا تھا۔ اس کی ایک عادت بہت دل کو لگنے والی تھی وہ صفائی کرتا جاتا اور درود پاک پڑھتا جاتا...... ایسا لگتا جیسے اسے کوئی دکھ نہ ہو۔ مگر آج معلوم ہوا کہ اصل ماجرا کیا تھا؟

میں ٹہلتے ٹہلتے اسٹاف کوارٹر کی طرف آ گیا تھا۔ اس طرف ڈاکٹرز کی کوٹھیاں اور باقی ملازمین کی رہائش گاہ تھی۔ میں عمر حیات سے گپ شپ لگانے کا سوچ کر اس کے کوارٹر تک آ گیا تھا۔ ابھی میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بیل بجاؤں مگر پھر ایک سلسلہ کلام شروع ہو گیا۔ عمر حیات کسی عورت سے گفتگو کر رہے تھے۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ کیونکہ ان کی بیوی عرصہ دراز ہو گیا وفات پا گئی تھی۔ ان کی کوئی اولاد بھی نہ تھی۔ اور نہ عمر حیات، عمر کے اس حصے میں کسی غلط قسم کے فعل کا مرتکب ہونے والا لگتا تھا۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تمام گفتگو سن لی۔ کون عورت تھی جو کہ اب جا چکی تھی۔ مگر اس کا وجود

بظاہر موجود نہ تھا کیونکہ وہ لازماً دروازے سے ہو کر واپس جاتی۔

پھر ایک سوال ابھرا کہ وہ کس قسم کا وجود تھا جو مجھے نظر نہ آیا۔ کون تھی وہ اور کہاں گئی تھی؟ اس کا عمر حیات سے کیا رشتہ تھا؟

☆......☆......☆

وہ حسین وجمیل دوشیزہ میرے دماغ پر چھا گئی تھی۔ یہ 26 سال پرانی بات ہے جب میں گیٹ کیپر ہوا کرتا تھا۔ وہ ہنڈا سوک گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی آئی تھی...... میں نے اسپتال کا گیٹ مکمل کھول دیا۔ وہ ایمرجنسی وارڈ کے بالکل سامنے جا رکی تھی...... میری نظریں اس کے مکمل سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔ خوب صورت لانبی آنکھیں، لمبی چوٹی، فراخ پیشانی، صاف ستھرا اور قیمتی لباس، وہ ڈرائیونگ سیٹ سے اتری، اس نے پچھلا دروازہ کھولا...... مجھے محسوس ہوا جیسے اسے مدد کی ضرورت ہے۔ میں معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس کی طرف لپکا۔

صورتحال گھمبیر تھی۔ پچھلی سیٹ پر ایک بزرگ عورت بے ہوشی کے عالم میں تھی۔

''پلیز! انہیں اندر لے جانے میں میری مدد کریں۔ ان پر ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا ہے۔'' وہ بول کیا رہی تھی، گویا اس کے بولنے سے جیسے موتی جھڑ رہے ہوں...... وہ اکیلی تھی۔ شاید مجبور تھی۔ میں نے بڑھیا کو باہر نکال کر وہیل چیئر پر ڈالا اور اسے ایمرجنسی میں لے آیا۔ ڈاکٹرز آن ڈیوٹی تھے۔ فوراً بڑھیا کی حالت پر کنٹرول پا لیا گیا...... میں اس کے ساتھ رہا۔ غرض اسے میں نے واپس روانگی تک وقت دیا۔

وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی چلی گئی...... مگر میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ سراپا محبت، سراپا روشنی، جانے کہاں سے آئی تھی مگر ایک بات میں نے محسوس کی کہ جاتے وقت اس کی آنکھیں کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔

ممنون آنکھیں، مگر وہ بھی کچھ کہہ نہ پائی۔''

عمر حیات خان اپنی داستان سنا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اداس تھیں۔ جیسے دل پر بوجھ ہو۔ بہت بڑا غم تھا۔ ان کے سینے پر۔

میں نے غور سے دیکھا۔ اب ان کی آنکھیں نم تھیں۔ ''بابا پھر کیا ہوا......؟'' میں نے تھوڑے وقفے کے بعد پوچھا۔

پھر جیسے وہ ماضی میں کھو گئے۔

''میں صرف اس حسین دوشیزہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ نہ صرف میرے دل میں تھی بلکہ دماغ بھی اس کی طرف لوٹ جاتا۔ صرف اسے سوچنے کا من کرتا۔ میں نے بہت سی حسین عورتیں دیکھیں مگر کبھی دل کی دنیا میں کوئی داخل نہ ہو سکی۔

وہ معصوم اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ میں نے اس کی کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا...... اور مجھے قوی امید تھی کہ وہ دوبارہ ضرور آئے گی اور پھر میری توقع کے عین مطابق وہ اگلے دن اسپتال پھر آئی...... میں گیٹ پر موجود تھا۔ آج گیٹ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ مگر اس نے بریک لگائے اور باہر نکل آئی۔

''بیٹے...... میری امی کی طبیعت خاصی بگڑ چکی ہے۔ آپ پلیز! میری مدد کریں۔''

میرا دل بے اختیار سا ہو گیا۔ دھڑکن جیسے ایک دم سے فل اسپیڈ سے چل رہی تھی جیسے دل باہر نکل آئے گا۔

''جی ضرور...... چلیں...... میں ہوں ہی آپ کی خدمت کے لئے......!'' میں نے کہا۔

وہ مجھے کار کے اندر بیٹھنے کا کہہ رہی تھی۔ میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اس نے ایمرجنسی کے سامنے کار روکی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس بزرگ عورت کو باہر نکالا۔ مگر میرا تجربہ بتا رہا تھا کہ بزرگ عورت یا تو دنیا سے جا چکی ہے یا اس کے زندہ بچنے کے چانسز ہی نہیں ہیں۔

بہر حال ہم اسے اندر لے گئے...... میرا شک یقین میں بدل گیا۔ بڑھیا کی حرکت قلب بند ہو چکی تھی۔ یہ بہت دکھ بھری بات تھی۔ لڑکی رو پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا۔ دل چاہتا تھا کہ وہ صرف مسکراتی رہے۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل پسیج گیا اور میں نے ہمدردانہ اور پیار بھرے انداز سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا......

''حوصلہ کریں۔ اور ہمت سے کام لیں۔''

نجانے کیوں میرا دل اندر سے دکھی ہو گیا تھا۔

اس نے بالکل نارمل انداز میں میری طرف دیکھا...... جیسے اسے کوئی غمگسار مل گیا ہو۔

اس دن میں نے ایمبولینس میں اس کی والدہ کی ڈیڈ باڈی کو گھر تک پہنچایا۔ بارعب اور خوبصورت گھر، اعلیٰ رہائش گاہ تھی۔ مگر چند ایک لوگ ہی وہاں موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد جنازہ آخری منزل کی طرف بڑھا، میں نے خود اس کی والدہ کو لحد میں اتارا۔

میں واپس آ گیا...... وہ اداس بیٹھی تھی، آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے...... یہ رات کا وقت تھا۔ لوگ جا چکے تھے۔ وہاں صرف ایک کام کرنے والی ملازمہ تھی......

میں نے ملازمہ سے پوچھا...... ''جو فوت ہوئی ہیں وہ کون ہیں اور ان کے علاوہ اور کون کون یہاں رہتا ہے؟''

''صاحب زمرد خان...... امریکہ میں رہتے ہیں۔ گل زارا بی بی کے منگیتر...... مگر سنا ہے انہوں نے کسی میم سے شادی کر لی ہے۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی بھی نہیں، گل بی بی کا، گل بی بی کی والدہ تھیں جو ہارٹ کی مریض تھیں۔'' یہ کہہ کر ملازمہ چائے بنانے چلی گئیں۔ جبکہ میں نے گل سے اجازت چاہی......

''مجھے اجازت دیں...... آپ کی امی کا شدید دکھ ہوا، اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے......''

''آپ درد مند آدمی ہیں، میں تو آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتی۔ میری امی کی آخری رسومات کسی مرد سے ادا ہونی تھی اور بدقسمتی سے ہمارے خاندان میں مرد تھے ہی نہیں...... میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔''

''کون سا شکریہ اور کون سا احسان...... انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ آپ پلیز! کھانا کھا لیں۔ جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔ ہم صرف دعا کر سکتے ہیں۔''

''مگر میری امی بہت اچھی تھیں...... میں ان کے ساتھ ہی کھانا کھاتی تھی۔ اکیلے کھانے کی عادت نہیں......''

☆......☆......☆

عمر حیات خاموش ہو گیا۔

اس کی سفید داڑھی بھیگ چکی تھی...... مجھے محسوس ہوا جیسے وہ آج بھی گل زارا سے شدید محبت کرتا ہے اور اس کے کھو جانے کا شدید غم ہے اس کے دل میں......

''پھر آگے کیا ہوا بابا؟'' میں نے افسردہ لہجے میں پوچھا۔

وہ دوبارہ شروع ہوا۔ ''پھر ہم جیسے ایک دوسرے کے لئے ضرورت بن گئے۔ وہ بہت بڑے بزنس کی واحد مالک تھی۔ میری نئی زندگی شروع ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنی فیکٹری کا وزٹ کرایا...... عید پر بہترین شاپنگ کرائی...... ہم بہت خوش تھے۔

''اگر تم میری زندگی میں نہ ہوتے تو شاید میں زندہ نہ رہ پاتی، تم میرے لئے زندگی کا واحد سہارا ہو۔ خدا نے شاید ہمیں اس طرح ملانا تھا'' اس نے کہا۔

''نہیں...... مگر مجھے صرف ایک چیز کا ڈر رہتا ہے کہ کبھی تم بدل نہ جاؤ۔ تم امیر خاندان سے اور میں ایک عام سا گیٹ کیپر۔'' میں نے کہا۔

اس نے کار روک دی۔ ''تم مجھے سمجھ نہ سکے۔ انسان کی اصل شخصیت اس کے کردار سے سامنے آتی

ہے۔ ورنہ آج کل لالچ اور ہوس زدہ لوگوں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ لوگ ایک عام عورت کو چاہے وہ کتنی بھی طاقتور نہ ہو اسے لوٹ کھسوٹ کا مال سمجھتے ہیں اور تم ان سب سے الگ ہو......!"

غرض محبت کا سہانا سفر شروع ہوا...... وہ آزاد خیال مگر باحیا لڑکی تھی، باکردار اور سلجھی ہوئی......!

اس کی مختصر کہانی کچھ یوں تھی۔ میرا نام گل زارا، باپ بہت بڑا بزنس مین، والدین کی اکلوتی اولاد، کزن زمرد خان، زندگی میں پہلا مرد مگر منگنی کے بعد امریکہ جاکے کسی گوری میم سے شادی رچالی اور پھر واپسی نہ ہوئی۔

ہم بہت جلد ایک ہوگئے۔ وہ میری زندگی کے سہانے اور خوب صورت دن تھے۔ ہم مری گئے۔ مری کے دن کبھی بھولتے ہی نہیں......

☆......☆......☆

زمرد خان ایک عیاش اور بگڑا ہوا رئیس تھا۔ اس نے آنٹی کی خبر سنی تو اسے بھی افسوس کرنے کا خیال آیا۔ اس نے گھر کے نمبر پر لینڈ لائن سے کال کی۔

"ہیلو...... گل ...... میں زمرد خان بول رہا ہوں۔"

گل کو اس کے نام سے بھی نفرت تھی، ایک لاوا تھا جو اس کے اندر پکا ہوا تھا۔ وہ جو اسے بیچ راہوں میں چھوڑ گیا تھا۔ اسے تنہا کرنے والا، معاشرے کے حوالے کرکے خود عیاشی کرنے والا شخص آج اسے کیونکر یاد آگئی تھی۔

وہ پھٹ پڑی۔ "تم میری ماں کے قاتل ہو۔ تمہاری وجہ سے میری دنیا اجڑ گئی، زمرد خان...... تم میری نظر میں، کتنے اونچے تھے، مگر کیوں کیا ایسا؟ بہتر ہوگا کبھی دوبارہ فون نہ کرنا...... مرگئے تمہارے سب رشتے...... اور ہاں میں نے شادی کرلی ہے اور اخلاقی طور پر میں کسی اجنبی سے بات کرنے سے قاصر ہوں......!" اور گل زارا نے کریڈل دبادیا۔

میرے منع کرنے کے باوجود گل نے ساری جائیداد میرے نام کردی...... زندگی خوب صورت چل رہی تھی کہ زمرد خان امریکہ سے واپس آگیا۔

وہ اپنی انسلٹ برداشت نہ کرسکا...... ایک اجنبی نمبر سے اس نے گل زارا کو دھمکی دی۔

"ہیلو......!"

"تم میرے ہاتھوں ہی مروگی۔ میں اپنی انسلٹ کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

گل گھبرا گئی اس نے ساری بات مجھے بتائی۔

مگر اگلے روز ہم دونوں کار میں آفس جارہے تھے کہ ایک بہت بڑے ٹرک کی ٹکر نے ہمیں گھائل کے رکھ دیا...... اس کے نتیجے میں گل تمہ اجل بن گئی......

میں دیوانہ ہوگیا...... پاگلوں کی طرح سڑکوں پر گھومتا، میرا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ پھر میرے آفس کے مینجر نے مجھے اسپتال میں داخل کرادیا...... میں ٹھیک نہیں ہونا چاہتا تھا مگر پتہ نہیں کیوں مجھے سکون ملنا شروع ہوگیا تھا۔

آخری لمحے گل نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ آئے گی ضرور۔

اور پھر ایسا ہی ہوا وہ واقعی ہر روز آتی تھی۔ میری حالت سنبھلنے لگی۔ اس نے میری زندگی میں ایک نئے انداز سے قدم رکھا تھا۔ وہ ہر رات میرے پاس آتی۔ اور آج تک آتی ہے۔" یہاں تک بول کر عمر حیات خاموش ہوگیا اور اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

☆......☆......☆

تین دن بعد میرے انکل کا شاندار بلکہ کامیاب آپریشن ہوا، میں نے عمر حیات سے خصوصی دعا کروائی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ عمر حیات کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔ اور واقعی اس نے ہمارے حق میں دعا کردی تھی۔ میں انکل کے ساتھ تھا۔ ان دنوں عمر حیات سے ملاقات نہ ہوگی، میں اس دن پہنچ گیا...... میں اسپتال سے باہر بیلنس ڈلوانے جانا چاہتا تھا اور مجھے روڈ کراس کرکے روڈ والی شاپ تک جانا تھا۔

میں جونہی باہر نکلا۔ ایک معذور آدمی جس کی

ٹانگیں ضائع ہو چکی تھیں۔ بال کھچڑی داڑھی، مکمل سفید مگر گرد آلود، آنکھوں سے محروم، ایک مفلوک الحال شخص نظر آیا، اس کے آگے ایک جست کا کٹورہ رکھا ہوا تھا، جس میں لوگ چند سکے ڈال دیتے تھے۔

مجھے اس بوڑھے معذور پر ترس آیا۔ کچھ سکے میں نے بھی اس کے کٹورے میں ڈال دیئے۔

☆......☆......☆

عمر حیات خان سے آخری دن ملاقات ہوئی۔

''مجھے آپ کی مکمل کہانی سننی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے اس ٹرک ڈرائیور کو پکڑوایا جس نے ہماری گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔

ٹرک ڈرائیور نے زمرد خان کا نام لیا۔ اس کام کے لئے اس نے کچھ دن تک مخبری کی اور پھر موقع محل کے مطابق بھرپور ٹکر ماری۔

میں نے زمرد خان کو ڈھونڈا مگر مجھے گل زارا نے روک دیا...... ''حیات میں اس سے خود انتقام لوں گی، اور ایسا انتقام کہ وہ نہ مر سکے گا اور نہ جی سکے گا۔''

اور پھر ایک دن زمرد خان کا بھرپور حادثہ ہوا۔ اس کی اپنی خود کی دونوں ٹانگیں ہمیشہ کے لئے ضائع ہوگئیں۔

کچھ عرصہ بعد اس کی دونوں آنکھیں ختم ہوگئیں، کسی نے تیزاب ڈال کر اس کا چہرہ بگاڑ دیا۔

انہی دنوں اس کی بیوی آئی۔ شوہر سے خلع لیا۔ جبکہ ساری دولت پہلے ہی اس کے نام تھی۔

آج کل زمرد خان بھیک مانگتا ہے۔ تبھی میرے ذہن میں بھیک مانگتا ہوا بوڑھا آ گیا۔

حیات خان چپ ہوگیا۔

''بابا، اسے میں نے دیکھا ہے۔ کل ہی، وہی بوڑھا اسپتال سے باہر نظر آیا۔''

''بالکل...... یہ وہی زمرد خان ہے۔ یہ گل زارا کا لیا ہوا انتقام ہے۔ پچیس سال سے یہ ایسے ہی بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔''

''بابا...... ایک بات بتائیں، گل زارا فیکٹریوں کی مالک تھی۔ پھر آپ آج بھی ادھر جاب کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

بابا مسکرا اٹھے۔

''بیٹا...... جس کی دولت تھی وہ چلی گئی۔ دولت اگر کسی کے کام نہ آئے تو فائدہ...... میں نے گل زارا کے نام ایک فلاحی ٹرسٹ کھولا۔ اور ساری دولت رفاحی ادارے کے نام کر دی۔ ایک یتیم خانہ بھی کھولا۔

دولت یا تو ایمان کی ہے یا محبت کی...... محبت کے دم سے ہی دنیا کے سارے رنگ قائم ہیں۔''

''اچھا بابا...... ایک اور بات...... زمرد خان کو اس حال تک کس نے پہنچایا......!''

''گل زارا کے انتقام نے...... اس نے ایک ٹرک سے ہی حادثہ کیا۔ اور زمرد خان آج تک بھیک مانگتا پھر رہا ہے۔''

☆......☆......☆

ہم لوگ کارڈیو سے ڈسچارج ہو چکے تھے۔ عمر حیات، میرے انکل کو سہارا دے کر گاڑی میں بیٹھا گئے تھے۔

''اچھا بابا...... اب اجازت! آپ سے رابطہ رہے گا۔ دعا کریں آج بارش ہو جائے۔ خاصی گرمی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ضرور...... شاہ جی...... آج بارش ہوگی اور ضرور ہوگی۔'' ہم الوداع کہہ کر روانہ ہوگئے۔

ہم مظفر گڑھ تک پہنچے اور بادل بن گئے۔ اور پھر بارش شروع ہوگئی۔ خوب مینہ برسا...... مجھے عمر حیات، خان کا چہرہ اور یہ جملہ یاد آ گیا

''ضرور...... شاہ جی...... آج بارش ہوگی اور ضرور ہوگی۔''

اور واقعی بارش ہوئی تھی۔ شاید عمر حیات عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا سفر طے کر چکے تھے۔ تبھی تو ان کے الفاظ پورے ہوتے تھے۔

☠

بلاعنوان

عامر ملک-راولپنڈی

خوبرو دلکش دلنشین حسینہ لرزتی رہی، کپکپاتی رہی، ماهئی بے آب کی طرح تڑپتی رہی، دل و دماغ پر جبر کرتی رہی، خوف کے سمندر میں غوطہ زن رہی اور پھر جب حقیقت کا انکشاف ہوا تو وہ سراپا چکرا کر رہ گئی۔

حقیقت سے چشم پوشی اور اندھا اعتماد زندہ درگور کردیتا ہے، اس کے مصدق خوفناک کہانی

دسمبر کے آخری دن تھے، سردی پورے شباب پر تھی۔ پہاڑی علاقوں میں شدید برف باری کے بعد تیز بارش بھی ہونے لگی۔ ساتھ ہی تیز ہوائیں بھی چلنی شروع ہوگئیں۔ اس منجمد کردینے والی سردی کی وجہ سے سارا بازار سرشام سنسان ہوگئے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ انسانوں کی بستی نہیں بلکہ شہر خموشاں ہے۔

اس کڑکڑاتی سردی میں...... وہ ٹیکسی سے اتری اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی جو گھمبیر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سردی سے سن کانپتی انگلیوں سے پرس میں سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کرکے اندر سے مقفل کردیا۔ پھر اس نے بجلی کے سوئچ کو ٹٹول کر آن کیا۔ بارش میں اس کا لباس بھیگ گیا تھا۔ جس وجہ سے اس کا تمام بدن کانپ رہا تھا اور دانت بج رہے تھے۔

اس نے فوراً ہی لباس تبدیل کیا اور ہیٹر جلا کر اپنا جسم گرم کرنے لگی......

جب جسم گرم ہوا تو اسے اپنے محبوب شوہر خاور کا خیال آیا..... کہ وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں پہنچا نہ جانے وہ اس وقت کہاں ہوگا؟ کیا کر رہا ہوگا؟

☆......☆......☆

نیلم خوب صورت اور پڑھی لکھی تھی، کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اسے نت نئے ایڈونچر کرنے کا شوق تھا۔ خاص کر پہاڑی علاقوں کی سیر کرنے کا، وہ کبھی کبھی اکیلی ہی دور دراز کے علاقے گھوم آتی تھی۔ خاور سے اس کی ملاقات شمالی علاقہ جات کی سیر کے دوران ہوئی تھی۔ جس نے جلد ہی محبت کا روپ دھار لیا۔ خاور کا ان علاقوں میں کاروبار تھا۔ اور آبادی سے ہٹ کر گھنے جنگل کی اونچائی پر اس کا بنگلہ تھا۔ جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ دونوں کی محبت رنگ لائی اور ان کی شادی ہوگئی۔ نیلم...... خاور کی محبت پا کر بہت خوش تھی۔ خاور کا کاروبار اور دفتر کالام میں تھا۔ جہاں وہ روزانہ آتا جاتا تھا۔ شادی سے پہلے تو وہ کبھی کبھار کالام میں ہی ٹھہر جاتا تھا۔ مگر شادی کے بعد وہ روزانہ گھر لوٹ آتا تھا۔

شادی کے چار ماہ بعد نیلم اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے لاہور آگئی تھی۔ اور اب ایک ماہ گزرنے کے بعد واپس کالام آئی تھی۔ وہ سارے راستے خاور ہی کے متعلق سوچتی رہی کہ خاور گھر میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا ہوگا اور میری غیر متوقع آمد پر بہت ہی خوش ہوگا۔ لیکن..... خاور نہ جانے کہاں تھا؟...... اسے احساس ہوا کہ قصور اس کا اپنا ہی ہے کہ اس نے خاور کو اپنی آمد کی اطلاع جو نہیں دی تھی...... اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ خاور ابھی تک نہیں آیا تو ممکن ہے وہ آج رات گھر ہی نہ آئے اور کالام میں ہی رہ جائے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں آج رات گھر آ رہی ہوں۔ کاش میں نے اس کو اطلاع کردی ہوتی۔

ادھر بارش تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ اور طوفان بڑھتا ہی جارہا تھا۔ گھر کے اردگرد پھیلے ہوئے جنگل کے دیو قامت درختوں سے ہوائیں ٹکرا کر سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ اور کبھی تو ایسے لگتا تھا کہ رات کے پرہول سناٹے میں کوئی سسکیاں بھر رہا ہو۔ رفتہ رفتہ اندھیری رات کا ماحول پراسرار اور دہشت ناک ہوتا گیا...... تو نیلم خوف زدہ سی ہوگئی۔

اسے اپنے ہی گھر سے خوف آنے لگا۔ حالانکہ شادی کے بعد اس نے خود اس میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہاں آ کر وہ بے حد خوش تھی۔ آخر کیوں نہ ہوتی۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ جسے اس نے بڑے شوق سے آراستہ کیا تھا۔ لیکن آج وہ اسی گھر میں ڈر رہی تھی۔ اور خوف سے اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر دوسرے کمرے یعنی...... خواب گاہ میں گئی اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں کو برش کرنے لگی۔ اس وقت اسے پھر خاور کا خیال ستانے لگا...... کاش وہ اس وقت آجائے...... ابھی تو ساری رات باقی ہے...... خاور کے بغیر گھر بے رونق لگ رہا تھا اسے، جیسے ویرانہ ہو۔ اس نے خوف پر قابو پانے کے لئے گھر کے تمام کمروں، صحن اور برآمدے کے بلب روشن کردیئے۔ مگر خاور کی عدم موجودگی کا احساس لحہ بہ لحہ شدت اختیار کرتا گیا۔ "خدا کرے کہ خاور آجائے اور دونوں اکٹھے کھانا کھائیں۔" مگر خاور کے آنے کا نام ونشان نہ تھا۔ نیلم کی بے چینی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ بارش اسی رفتار سے برس رہی تھی۔ بارش میں بھیگتی ہوئی ہوا کے زوردار تھپیڑے دروازوں اور کھڑکیوں سے یوں ٹکراتے جیسے کوئی شخص ہتھوڑے برسا رہا ہو۔ لمبے درختوں کی شاخیں ہوا کے زور سے کمروں کی چھتوں پر یوں پڑتیں جیسے مردہ جسم پر تازیانہ۔ ان حالات میں اس کی کیفیت یہ ہوگئی کہ وہ معمولی سی آہٹ پر بھی کانپ اٹھتی۔

وہ خاور کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ اس نے بھی تو اسے محبت، دولت گھر، آزادی سب کچھ دے رکھا تھا۔ دونوں بڑی خوش وخرم زندگی گزار رہے تھے۔

شادی ہونے کے بعد پہلی بار وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ چار ہفتوں کی جدائی کو نیلم نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس لئے وہ اب جلد از جلد خاور کی بانہوں میں سما جانا چاہتی تھی۔

طوفان، باد و باراں شدید ہوگیا۔ درختوں کی شاخیں چھت پر ہتھوڑے برسانے لگیں تو وہ پلنگ پر اچھل کر بیٹھ گئی۔ جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو...... وہ سامنے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ چپکی ہوئی بڑی ہی مکروہ اور بھیانک شکل دکھائی دی۔ جس کی گول گول آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ نیلم کے مرمریں بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی...... اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھا۔ بڑی ہی دہشت ناک اور بگڑی ہوئی شکل تھی...... پھیلی ہوئی ناک پچکے ہوئے رخساروں پر کانٹوں کی طرح کھڑے بال۔ جوڑے اور بھدے ہونٹ، اور دو چھوٹی سی گول مٹول آنکھیں۔

''اف خدایا...... یہ کون ہے؟'' نیلم نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں...... کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول کر وہاں دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

''یہ میرا وہم ہے۔'' نیلم نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے سوچا۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے کہ اتنی شدید سردی اور طوفانی بارش میں کوئی شخص باہر کھڑا ہو۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور بجلی کا سوئچ آف کردیا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس کا دل زور زور سے اچھلنے لگا گویا ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا وہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور شیشوں سے باہر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا...... اسے گونہ سکون محسوس ہوا اور وہ پلنگ پر دراز ہوگئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں اس کے سکون کا شیش محل گر کر چکنا چور ہوگیا۔

کھڑکی کے پاس باہر کسی کے قدموں کی دھیمی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ ''یا الٰہی یہ کون ہے؟''

''کوئی چور اچکا ہے...... ایسی شکل کسی انسان کی نہیں کسی بدروح کی ہوسکتی ہے۔''

یہ خیال آتے ہی اس کا خون خشک ہوگیا۔

''خدا کرے...... خاور آجائے۔ میری حفاظت وہی اور صرف وہی کرسکتا ہے...... میں اب اس مکان میں نہیں رہوں گی۔ صبح ہوتے ہی میں کہیں اور چلی جاؤں گی۔ اب مجھے اس گھر کا پرسکون ماحول نہیں چاہئے۔ اب یہاں سکون ناپید ہوگیا ہے۔ قبر کی سی خاموشی اور اداسی ہے۔ کیوں نہ ابھی یہاں سے بھاگ جاؤں...... لیکن...... مکروہ چہرے والا باہر کھڑا ہے...... اس وقت باہر نکلنا خطرناک ہے......'' ہوا اور بارش کے تھپیڑوں سے اس کی طرح مکان کے در و دیوار بھی لرزنے لگے۔ اس نے اپنے پراگندہ خیالات پر قابو پانے کی خاطر یہ سوچ کر اپنے دل کو ڈھارس دی کہ یہ سب کچھ اس کا وہم ہے...... شیشے کے ساتھ چپکا ہوا بھیانک چہرہ اور محتاط قدموں کی آہٹ یقیناً اس کے وہم کی تخلیق ہے نہ جانے کتنے ہیولے انسان کی توہمات نے آج تک تراشے ہیں اور مستقبل میں بھی تراشتا رہے گا۔

اب آرام کرنا چاہئے۔ اگر صبح تک جاگتی رہی تو یہ بے ہودہ توہمات میری جان لے لیں گی...... اس نے اپنے اوپر کمبل اوڑھ لیا اور نیند کے انتظار میں کروٹیں لینے لگی۔ مگر نیند کہاں......؟ اس نے اٹھ کر بجلی کا سوئچ آن کیا اور کرسی پر بیٹھ کر کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن اس کی یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ اس کے خیالات بھٹک رہے تھے...... تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ سردی سے کانپ رہی ہے۔ ہیٹر نشست گاہ میں رکھا ہوا تھا۔ ویسے بھی ہیٹر میں اتنی تپش نہ تھی کہ جسم گرم ہوسکے...... اس نے انگیٹھی میں لکڑیاں جلانی چاہیں لیکن لکڑی کے لئے اسے کمرے سے نکل کر تیس فٹ صحن کو عبور کرکے مکان کے آخری حصے میں واقع گودام میں جانا ہوگا۔۔ وہاں روشنی کا بھی انتظام نہیں ہے۔ بس صحن میں لگے ہوئے بجلی کے بلب کی معمولی روشنی وہاں پہنچتی ہے...... دروازے کے پاس جا کر خوف سے اس کے قدم رک گئے لیکن جلد ہی اس نے قابو پالیا اور چٹخنی کھول کر باہر برآمدے میں آگئی۔ سارا مکان خالی تھا۔ اس کے سوا کوئی اور ذی روح وہاں موجود نہ تھا۔ اس کی ہمت بندھی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گودام کی طرف بڑھی۔ گودام

کا دروازہ کھلا تھا۔ نیلم نے سوچا کہ ہوا سے کھل گیا ہوگا۔ وہ گودام کے دروازے سے گزر کر اندر چلی گئی۔ اندھیرے سے، اسے خوف آنے لگا..... ٹانگیں کانپنے لگیں۔ خیالات بھٹکنے لگے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ کمرے سے باہر کیوں نکلی ہے۔ سردی سے بچنے کے لئے کمبل اوڑھ کر بستر میں لیٹ جانا چاہئے تھا۔ انگیٹھی میں آگ جلانے کی ضرورت ہی کیا تھی..... وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی..... اس کی حالت بالکل اس سارس سے مشابہ تھی۔ جو شکاری کو دیکھ کر اپنی چونچ ریت میں دبا کر خود کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے اور شکاری بڑے اطمینان سے اسے آدبوچتا ہے۔

شیشے سے چپکی ہوئی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ اور بھاری قدموں کی آواز قدموں سے ٹکرانے لگی۔ سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

''اب کیا کرنا چاہئے.....؟''

''گودام سے نکل بھاگوں..... شاید وہ گودام سے باہر صحن میں کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کمرے میں داخل ہو چکا ہو۔ اور کمرے میں واپس جاتے ہی مجھے پکڑ لے..... نہیں..... یہ ممکن نہیں..... اگر کوئی ہوتا تو اب تک اپنی منحوس شکل کے ساتھ میرے سامنے آچکا ہوتا۔ یہ میرا وہم ہے۔ مجھے لکڑیاں لے کر واپس کمرے میں جانا چاہئے۔

نیلم نے آگے بڑھ کر لکڑیاں اٹھائیں اور اپنے نرم بازوؤں پر ٹھوڑی تک اونچی رکھ لیں اور باہر نکلنے کے لئے پلٹی ہی تھی..... کہ اس کی نظر دیوار کے ساتھ چمکتی ہوئی کسی چیز پر پڑی۔

''یہ کیا ہے.....؟'' اس نے تاریکی میں گھور کر دیکھا۔

اس کا دل زور سے دھڑکا اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ یہاں تو ایک بڑا سا صندوق رکھا ہوا تھا۔ نیلم نے دھندلائی ہوئی مدھم روشنی میں غور سے دیکھا..... صندوق کھلا ہوا تھا۔ اس نے سوچا۔ ممکن ہے..... وہ صندوق بند کرنا بھول گئی ہو..... پھر اسے خیال آیا کہ امی کے گھر جانے سے ایک دن پیشتر اس نے اپنے اور خاور کے کپڑے اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر صندوق میں رکھنے کے بعد صندوق کو بند کر کے تالا لگا دیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا..... تو پھر اسے کس نے کھولا ہے.....؟

ممکن ہے اس کی عدم موجودگی میں خاور نے کوئی کپڑا نکالنے کے لئے کھولا ہو۔ اور پھر بند نہ کیا ہو..... اس نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ خوف سے وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ لکڑیاں ہاتھ سے نیچے گر گئیں اور ٹانگوں میں کھڑا ہونے کی سکت نہ رہی۔ دہشت سے آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں..... اس کی حالت یک لخت ایسی ہوگئی جیسے اسے ہپناٹائز کر دیا گیا ہو..... اس نے چیخ ماری اور گودام سے نکل کر اندھا دھند کمرے کی طرف بھاگی۔ کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ پلنگ کو گھسیٹ کر دروازے کے آگے کر دیا اور خود کرسی پر بے سدھ ہو کر گر پڑی۔

اسے فوری طور پر پہلا خیال یہ سجھائی دیا کہ گھر سے باہر نکل بھاگے۔ اب یہاں ایک پل بھی ٹھہرنا مشکل تھا۔ لیکن پھر اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ چپکی ہوئی بھیانک شکل پھرنے لگی۔ کانوں سے بھاری قدموں کی آواز ٹکرانے لگی..... یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے چھپ کر پیچھے سے اس کے دماغ پر وزنی ہتھوڑا پوری قوت سے دے مارا ہو..... اس نے ایک بار پھر ڈرتے ڈرتے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ برف پوش بلند قامت درختوں کو دیکھ کر اس کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔

''اف خدایا..... اب کیا کروں؟..... کہاں جاؤں؟''

اس منحوس چہرے کی گول گول آنکھوں میں خون خوار چمک کے تصور ہی سے وہ کانپ گئی۔

''خدا کرے خاور آجائے۔ خاور ہی مجھے اس خونخوار بلا سے بچا سکتا ہے۔ وہی میری حفاظت کر سکتا

ہے میں اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں ہی محفوظ رہ سکتی ہوں۔"

نیلم کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں...... اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے ذہن کے پردے پر خون آشام مناظر ابھرنے لگے۔

☆......☆......☆

صندوق میں ایک نوجوان عورت کی لاش گٹھری کی صورت میں پڑی ہوئی تھی۔ جس کے دائیں ہاتھ کی تیسری خوب صورت مخروطی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی انگارے کی طرح چمک رہی تھی۔ عورت کا چہرہ اس کے بکھرے ہوئے سیاہ ریشمی بالوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ دونوں ٹانگیں پیٹ پر دوہری ہو رہی تھیں اور بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ کے نیچے تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں...... "اب کیا ہوگا؟"

عورت کی لاش کے بارے میں اگر پولیس کو علم ہوگیا تو الزام مجھ پر بھی آسکتا ہے۔ میں اپنی بے گناہی کا ثبوت کیونکر پیش کروں گی؟ میری بات پر کوئی یقین بھی نہیں کرے گا...... اور دوسری صورت میں خاور کو مجرم گردانا جاسکتا ہے۔ میں خاور کو بھی کسی قسم کی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس کے بغیر میری زندگی کس کام کی ہے......؟

لاش کو اٹھا کر جنگل میں پھینک دینا چاہئے۔ لیکن میں تنہا یہ کام نہیں کرسکتی اور کھڑکی کے شیشے کے ساتھ چپکا ہوا خوفناک چہرہ مجھے گھر سے نکلتے ہی آدبوچے گا......

کاش اس وقت خاور پہنچ جائے......

وہ کرسی پر دم سادھے بیٹھی سوچتی رہی۔ اپنی بے بسی اور تنہائی کا احساس اس کے لئے شدید ذہنی کرب کا سبب بن گیا...... وہ اچھل کر کرسی سے کھڑی ہوئی۔ جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔

"باہر کوئی موجود تھا......"

بھاری قدموں کی آواز پہلے کی نسبت بہت واضح تھی۔ یہ یقیناً وہم نہیں ہوسکتا، مکان میں داخل ہونے کے لئے کوئی نشست گاہ کے دروازے کی طرف جارہا

تھا۔ دور ہٹتے ہوئے قدموں کی واضح آواز دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکن کی طرح مدھم ہوتی چلی گئی...... پھر تالے میں چابی گھمانے کی آواز...... اور دروازہ کھل گیا ہے...... اس نے نشست گاہ میں داخل ہوکر دروازے کو بند کردیا ہے......" میرے خدا! اب کیا ہوگا؟

میں صحن کے راستے باہر نکل جاؤں۔ جنگل میں بھاگ جاؤں۔ جنگل چڑیلوں کا مسکن ہوسکتا ہے۔ میں کہیں نہیں جاسکتی۔"

نیلم کا ڈر کے مارے برا حال ہورہا تھا۔ اس نے کرسی کو اٹھا کر دونوں کمروں کے درمیان کھلنے والے دروازے کے ساتھ رکھ دیا...... نشست گاہ میں قاتل گنگنا رہا تھا۔

ابر اور ٹھنڈی ہوا کا احساس ہونا چاہئے
تم کو ایسی رت میں میرے پاس ہونا چاہئے

نیلم کا دل سینے کے اندر زور زور سے اچھلنے لگا۔

"یہ خاور کی آواز ہے...... میرے خاور کی...... وہ آگیا ہے۔ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں کوئی بھی میرا بال بیکا نہیں کرسکتا......"

اس نے کرسی کو دروازے کے سامنے سے ہٹا کر چٹخنی کھولی اور لپک کر اپنے خاور سے لپٹ گئی۔

دونوں بہت خوش تھے۔ نیلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" خاور نے نیلم کی پریشان زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

نیلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔ خاور نے اسے دلاسہ دیا اور جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"کیا بات ہے کچھ بتاؤ تو سہی؟"

"لاش......" نیلم کی زبان سے نکلا۔

"لاش...... کہاں...... کس کی......؟"

"گودام میں ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟" خاور نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

"قاتل باہر کھڑا ہے۔"

"اچھا......!" خاور نے سوچتے ہوئے کہا۔ "آؤ میں بھی دیکھوں۔"

خاور نے پیار سے نیلم کے گداز کندھوں پر ہاتھ پھیرے اور دونوں کمرے سے نکل کر گودام کی طرف چل دیئے۔ نیلم اب مطمئن تھی۔ خاور کے ہوتے ہوئے اسے کوئی ڈر نہ تھا۔ نیلم نے گودام میں جاکر ہاتھ کے اشارے سے خاور کو بتایا کہ لاش صندوق میں ہے۔

خاور نے آگے بڑھ کر دیکھا اور قہقہہ لگایا......

صندوق تو خالی تھا......

نیلم نے ایک بار پھر اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ لیکن خاور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھو نیلم! تنہا ہونے کے سبب تم ڈر گئی ہو۔ لاش اور قاتل تمہارے وہم کی تخلیق ہے۔ تم نے اگر مجھے اپنے آنے کی اطلاع کردی ہوتی تو تمہیں اس قدر پریشانی نہ ہوتی...... آؤ کمرے میں چلیں...... بہت سردی ہے۔ تم کافی تیار کرو۔ دونوں مل کر پئیں گے۔"

نیلم خاموش ہوگئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا...... اسے اپنے حواس پر شک ہونے لگا کہ ممکن ہے خاور کا خیال درست ہو۔ اس پرہول رات کی تنہائی میں خوفزدہ ہونے کے باعث اس کے محسوسات دھوکہ دے گئے ہوں...... خیر جو کچھ ہونا تھا ہوچکا۔

اب خاور آگیا ہے۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... وہ اٹھی اور باورچی خانے میں جاکر کافی کے لئے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھا اور خاور خواب گاہ میں جاکر لباس تبدیل کرنے لگا۔

نیلم کے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اسے گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ وہ حیران تھی کہ لاش کہاں غائب ہوگئی؟

کھڑکی کے پاس چپکا ہوا خوفناک چہرہ تو ممکن ہے اس کے کمزور دماغ کی تخلیق ہو لیکن...... عورت کی لاش...... "یہ وہم نہیں ہوسکتا۔"...... وہ سوچنے لگی...... اس کا دماغ الجھتا ہی چلا گیا۔

خاور لباس تبدیل کرکے باورچی خانہ میں ہی چلا آیا اور نیلم کے قریب کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگا۔ ”بارش اور ہوا کے اس قیامت خیز طوفان سے تم خوفزدہ ہوگئی ہو......!“

نیلم مسکرادی...... ”میرا بھی یہی خیال ہے۔ ڈارلنگ اب تم آگئے ہو۔ اب مجھے کوئی ڈر اور خوف نہیں۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی...... کہ عورت کی لاش صندوق سے کہاں غائب ہوگئی ہے؟ یہ وہم نہیں ہوسکتا۔ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھاسکتیں۔“

”تم نے پھروہی رٹ لگانا شروع کردی ہے۔“ خاور نے مسکرا کر بات کاٹ دی۔

”لیکن......!“

”لیکن کیا؟ تم نے خود دیکھ لیا ہے۔ صندوق خالی ہے۔ لاش ہوتی تو ہم دونوں کی نظروں سے کیوں کر اوجھل رہ سکتی تھی۔“

نیلم خاموش رہی...... اس کا دماغ الجھ گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ خاور سے کیا کہے، عورت کی لاش اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ کھڑکی سے چپکا ہوا چہرہ اور آہٹ بھی سنی تھی...... کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ ”آخر یہ سب کیا ہے؟......“ وہ سوچنے لگی۔

”میں نے خواب دیکھا ہے۔“ اس نے ذو معنی بات کہی۔

خاور نے مسکرا کر نیلم کو اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔ اور خواب گاہ میں آکر پلنگ پر دے پھینکا...... نیلم نے آنکھیں بند کرلیں......

☆......☆......☆

باورچی خانے میں کیتلی میں پانی ابل کر باہر گرنے لگا تھا...... کہ اسی رات کے سناٹے میں نیلم کی ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔ بادل زور سے گرجے۔ سسکیاں بھرتی ہوئی ہوا کا طوفان کچھ اور تیز ہوگیا۔

نیلم کی نظر خاور کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں پہنی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی پر جم کررہ گئی۔ یہی انگوٹھی اس نے کچھ دیر پہلے ہی دیکھی تھی۔ جس میں شیر کو اپنے اگلے پنجوں میں ہیرا پکڑ کر بیٹھے دکھایا گیا تھا۔ وہ مقتول عورت کی ذبح بستہ انگلی میں پہنی ہوئی اس انگوٹھی کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ اس نے مشکوک اور خوفزدہ نظروں سے اپنے خاوند...... خاور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ خاور کی آنکھوں میں بڑی خوفناک چمک تھی، وہ خوفزدہ سی ہوکر پیچھے ہٹی اور خاور اس کی طرف بڑھنے لگا......

”ت......تم......“

نیلم کے منہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا تھا۔ یک لخت اسے محسوس ہوا جیسے خاور کا جسم دھواں ہوگیا ہو۔ چمکیلا سا دھواں اور پھر دھواں مجسم ہونے لگا۔

نیلم کے منہ سے ایک خوفزدہ سی چیخ نکلی۔ اس کے سامنے وہی عورت کھڑی تھی۔ جسے اس نے صندوق میں دیکھا تھا۔ اس کا جسم سڈول اور گداز تھا۔ چہرے کے نقوش بھی دلکش تھے اور رنگت بھی خوب تھی۔ لیکن...... لیکن نیلم کے ذہن پر تاریکی سی چھانے لگی...... اس عورت کا منہ کھل گیا تھا اور اس کے جھانکتے ہوئے سفید دانت کسی بھیڑیے کے جبڑے کا سا منظر پیش کررہے تھے۔ اس نے چاہا کہ وہ پلنگ سے کود کر بھاگ نکلے...... لیکن...... شاید وہ نیلم کا ارادہ بھانپ گئی تھی......

وہ جھپٹی اور دوسرے ہی لمحے نیلم اس کی گرفت میں تھی...... پھر اسے اپنی گردن پر شہ رگ کے قریب سوئیوں کی چبھن کا احساس ہوا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ذبح ہوتی ہوئی بکری کی طرح وہ تڑپی۔ مگر آہنی گرفت سے نہ نکل سکی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی گردن ادھیڑی جارہی ہو۔ ناقابل برداشت تکلیف کا احساس اور پھر...... ڈوبتے ہوئے ذہن نے صرف ایک ہی جملہ سنا۔

”شاباش ڈیئر! مگر میرا حصہ چھوڑ دینا......“

اور یہ جملہ...... اس کے پیارے اور محبوب شوہر خاور نے ادا کیا تھا۔

محافظ

طاہرہ آصف-ساہیوال

صبح کا مگلجا اندھیرا ابھی باقی تھا کہ خاتون خانہ کی آنکھ کھل گئی اور پھر بستر سے اٹھ کر صحن میں نیچے سے اوپر جاتی سیڑھیوں پہ سے ایک خطرناک موذی نظر آیا، انسانی قدم کی آہٹ پاتے ہی وہ مڑا اور پھر اس کی قہر برساتی نگاہوں نے……

رائٹر کے اعلیٰ سوچ کی عکاسی کرتی دماغ پر خوف کا سکہ بیٹھاتی خوفناک اور دلفریب حقیقت

قیام پاکستان کا اعلان ہو چکا تھا اور مسلمانان ہند ہجرت کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے، بہت سے ایسے تھے جنہوں نے فسادات کی بو پاکر پہلے ہی ہجرت کر لی اور بہت سے ایسے تھے جو ہندوؤں سے اچھائی کی توقع پر حتمی فیصلے کے منتظر تھے، اب سر پر کھڑی مصیبت کو دیکھ کر اسباب سمیٹ رہے تھے۔ثریا کی بیوگی کے زخم سے ابھی لہو رس رہا تھا کہ اسے ہجرت کا بھی زہر پینا پڑا، وہ تو اپنے محبوب شوہر کی قبر چھوڑ کر جانے پر بالکل آمادہ نہیں تھی لیکن ساس سسر کے سمجھانے پر اس کے آگے یہ جواز پھیکے پڑ گئے۔ اگر چہ زمینیں اور ذاتی گھر چھوڑنا ان کے لئے بھی سوہان روح تھا مگر جوان بہو اور پری وش پوتیاں ایسی نہیں تھیں جن کے لئے وہ کوئی ناعاقبت اندیش فیصلہ کرتے۔

رمضان نے اپنی تمام جائیداد کے کاغذات سنبھالے، سونا، چاندی زیورات اور چند جوڑے کپڑوں کی گٹھری بنائی، بیوی اور بہو کو ہدایات کی کہ رات کو نکلنا ہے وہ تیار رہیں۔ بوڑھے رمضان نے اس مصیبت کی گھڑی میں ہاتھ پاؤں چھوڑنے کے بجائے عقل سے کام لیا اسے معلوم تھا کہ خطرہ صرف جان کا نہیں بلکہ عزت کا بھی ہے۔

ایک ماہ قبل اکلوتا بیٹا ہیضے کے مرض کی وجہ سے ساتھ چھوڑ چکا تھا وہ اپنے پیچھے ایک بیوی کے علاوہ چار بیٹیاں چھوڑ گیا تھا۔ بڑی پوتی سولہ برس کی اس سے اگلی چودہ برس کی اور دو جڑواں گیارہ برس کی تھیں، چاروں حسن میں باکمال تھیں، ابھی کم سن تھیں لیکن دادا دادی انہیں چھپا کر اپنے پروں میں سمیٹ کر رکھتے تھے۔ زمانے کے سرد گرم سے بچانے کے لئے بوڑھے رمضان کو بیٹے کے غم سے منہ موڑ کر اس کے حصے کی ذمہ داری نبھانی پڑ رہی تھی۔

آنے والی رات چاند کی آخری تاریخوں کی رات تھی اندھیرے کا فائدہ لیتے ہوئے یہ سات نفوس بہت خاموشی سے نکلے، ان کی برادری اور پاس پڑوس کے باقی گھرانے بھی مشترکہ فیصلے کے بعد اسی رات روانہ ہو رہے تھے۔گاؤں کے باہر ایک جگہ مقرر تھی جہاں سب نے ملنا تھا۔رات عشاء کی نماز رمضان نے مسجد کے بجائے گھر پر پڑھی۔گھر کے تمام لوگ سر شام کھا پی کے بلکہ سفر کے لئے کافی سامان تیار پہلے ہی سے کر لیا تھا۔اب نماز کے بعد دعاؤں میں مشغول تھے، ثریا کی آنکھوں کے ساتھ دل بھی رو رہا تھا۔شوہر کے بعد اب وطن بھی چھوٹ رہا تھا۔ یہ ایک انفرادی نہیں قومی فیصلہ تھا جس میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔

تمام چھوٹی بچیوں کو برقع پہنائے کھانے اور دیگر سامان کی گٹھریاں بانہوں میں سمیٹ کر یہ سب خاموشی سے چل رہے تھے۔ابھی تک کسی کو ان کے جانے کی کوئی خبر نہ ہو سکی تھی۔ کچھ دیر کے بعد یہ سب مقررہ جگہ پر جمع ہو گئے، اب آگے کا سفر شروع ہوا، تمام رات چلتے رہے یہاں تک کہ خطرے کے مقام سے دور آگئے، پو پھٹنے کے وقت سب رک گئے کچھ وقت ستایا، کھایا پیا اس کے بعد پھر چل پڑے۔ یہ قریباً اسی فرد کا قافلہ تھا سب ایک ہی گاؤں کے تھے اکثریت رشتہ دار تھے۔ دو دن یونہی چلتے گزر گئے خوش قسمتی سے بلوائیوں سے بھی سابقہ نہ پڑا پھر انہیں فوجیوں کا ٹرک مل گیا۔ جس نے انہیں بحفاظت بارڈر کے قریب چھوڑ دیا،

قافلے والوں کو خیریت سے پہنچ جانے پر یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ اب تک جتنے بھی لوگ جانے کے لئے نکلے تھے اکثریت جنونیوں کے ہاتھوں مارے گئے، لڑکیاں اغوا ہوگئیں، یہ معجزہ صرف ان کے ساتھ ہوا کہ یہ جتنے تھے سب کے سب ارض پاک پہنچ گئے۔

رمضان اپنی متاع لئے بغیر منزل پر پہنچنے پر بار بار سجدہ شکر بجالا رہا تھا۔ لیکن ابھی مصیبتیں باقی مہینہ بھر کیمپ میں رہنا امتحان سے بڑھ کر تھا۔ اس افراتفری اور بے سرو سامانی کے عالم میں بھی بہت سے ایسے تھے جو گدھ کی طرح نظریں جمائے بیٹھے تھے، لیکن رمضان اپنے بیٹے کی آبرو بچانے کے لئے کلیم کے کاغذات اٹھائے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ یہ مشقت اس کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن وہ اپنے خاندان کا واحد مرد تھا، بوڑھا ہوا تو کیا، خیر مہینے سے کچھ دن اوپر اسے رہنے کا ٹھکانہ مل ہی گیا۔ شہر میں صاحب حیثیت ہندوؤں کی کالونی میں اسے ایک کوٹھی الاٹ ہوگئی، قبضہ ملتے ہی اس نے گھڑی بھر رکنا مناسب نہ سمجھا اور اہل و عیال کو لے کر کوٹھی میں آگیا۔ یہ شہر کے گنجان حصے سے ہٹ کر صاف ستھرا اور سرسبز علاقہ تھا جہاں تقسیم سے قبل پڑھے لکھے اور رئیس ہندو رہتے تھے۔

رمضان احمد کو اپنی کل املاک جو وہ ہندوستان چھوڑ آیا تھا کے بدلے میں یہ کوٹھی ملی۔ یہ ایک شاندار وسیع اور ملحقہ باغیچہ کے ساتھ کوٹھی تھی، حتیٰ کہ رہائش کے تمام سامان بھی موجود تھا۔ کچن میں برتن بھی تھے۔ یہ سب اس وجہ سے تھا کہ یہ جس ہندو کی رہائش تھی۔ وہ سرکاری اثر و رسوخ والا بندہ تھا۔ ضروری سامان لینے کے بعد اس نے خود پورے گھر کو مقفل کیا تھا۔ اور چابیاں ایک سرکاری عہدیدار کے سپرد کی اور تاکید کی کہ گھر کو چھیڑا نہ جائے وہ کچھ ذاتی اشیا چھوڑے جارہا ہے۔ جنہیں وہ بعد میں آکر لے جائے گا۔

عہدیدار نے اس کے جانے کے بعد تمام کوٹھی کا بغور معائنہ کیا لیکن فرنیچر اور کچن کے سامان کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز نظر نہ آئی۔ اب یہ گھر اسی حالت میں رمضان احمد کی ملکیت تھا۔ پہلے دن تو انہوں نے محض آرام کرنے

میں گزار دیا کھانا بھی باہر سے منگوا کر کھایا اب اگلے دن سب نے تمام گھر کا جائزہ لیا گھر کسی حد تک ہندوانہ طرز تعمیر پر تھا تاہم بہت بڑا اور پرآسائش تھا۔ ہر چیز موجود تھی، بستر برتن چارپائی فرنیچر پردے غرض جو بھی تھا ان کے لئے بہت تھا، لیکن جگہ جگہ ہندو مذہب کی نشانیاں موجود تھیں۔ رمضان اپنے ساتھ سونا چاندی اور رقم بھی لایا تھا اس نے سب سے پہلے بازار جا کر کھانے پکانے کا سامان خریدنے کا ارادہ کیا، بہو اور پوتیوں کو گھر کی صفائی کا کہا اور یہ بھی کہا کہ یہاں جتنی بھی ہندو مذہب کی نشانیاں ہیں انہیں ختم کردو کیونکہ اب ہم رہیں گے تو ماحول بھی ہمارے عقائد کے مطابق ہونا چاہئے۔

ثریا اور اس کی بیٹیوں نے پہلے تمام گھر کے معائنہ کا سوچا گھر میں بہت سارے کمرے تھے جن میں سے بیشتر کو ابھی کھولا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے جھاڑو اور صفائی کا سامان لیا اور کام کا آغاز کیا سب سے بڑی بیٹی عابدہ کے ذمہ پانی لانے کا کام تھا، یہاں ایک ہینڈ پمپ اور پانی کا کنواں دونوں ہی تھے۔ تمام کمرے باری باری کھولے وہاں صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتے گئے۔ ہر کمرے میں اگرچہ بہت زیادہ سامان نہیں تھا لیکن جو بھی تھا۔ ان کے محدود طرز زندگی سے ہٹ کر اور اچھا تھا۔ قالین پردے بہترین پلنگ کرسیاں اور بہت کچھ سہ پہر تک وہ پانچوں ماں بیٹیاں سب کرکے فارغ ہوگئیں، باقی کام اگلے دن پر ڈال کر کھانے کا انتظام کیا اور رات میں جلدی سوگئے۔

کوٹھی کے عقب میں ایک باغیچہ بھی تھا جہاں پھل دار درخت پھولوں کے پودے اور جھولا بھی تھا کافی دن کی بے توجہی کے باعث سب اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ رمضان احمد ایک مالی کو بلا لائے اور باغیچے کی حالت درست کروائی۔

تمام گھر کی درستگی کے بعد ثریا اگلے روز چھت پر آئی تو چھت پر بھی دو کمرے برآمدہ اور غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ ثریا نے نیچے آکر سسر کو مطلع کیا "ابا اوپر بھی دو کمرے ہیں۔" رمضان چابیوں کا گچھا لے کر بہو کے ساتھ اوپر آیا کیونکہ ثریا نے بتایا تھا کہ اوپر کے کمرے بھی مقفل ہیں یہاں آکر تالے دیکھے تو یہ خاصے بڑے تھے اور عام تالوں سے یکسر مختلف تھے، ثریا نے باری باری تمام چابیاں آزمالیں لیکن یہ قفل نہ کھلے مایوس ہوکر دونوں نیچے آگئے فی الحال نیچے کا گھر ہی اتنا بڑا تھا، وہ ہی ان کی ضرورت سے زیادہ تھا سو بیا آئندہ پر ٹال کر مطمئن ہوگئے۔

یہاں آکر یکسوئی سے رہنا نصیب ہوا تو سب کے حواس بحال ہوگئے اب آئندہ کے بارے میں سوچا جانے لگا۔ سب سے اہم سوال بوڑھے رمضان کے سامنے یہ تھا کہ سب کا پیٹ پالنے کے لئے کیا کیا جائے اگر وہ گھر بیٹھ کر جمع پونجی کھانے لگتے تو جلد قلاش ہوجائیں گے، عمر ایسی نہیں کہ وہ مزدوری ہی کرلیتا آخر پوتیوں کو رخصت بھی کرنا تھا۔ یہ ساری فکریں اس کی ذات کی تھیں جبکہ بچیاں اتنے شاندار گھر میں آکر بہت خوش تھیں، پہلے وہ چاروں ایک کمرے میں رہتی تھیں اب اتنے کمرے تھے کہ انہیں اپنا اپنا کمرہ چننا مشکل تھا، عابدہ نے باغیچے کی جانب والا کمرہ لے لیا۔ ساجدہ نے ماں کے ساتھ والا کمرہ لے لیا جبکہ دونوں چھوٹیوں نے دادا دادی کے بالکل سامنے والے کمرے میں رہنا پسند کیا، چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ دادا دادی کی لاڈلی تھیں۔

رمضان احمد نے اپنی بیوی اور بہو سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے کیونکہ اسے تو صرف زمینداری آتی تھی۔ بہرحال۔ طے یہ پایا کہ وہ کالونی میں کوئی دکان کرایہ پر لے کر دکانداری کرے یہ نسبتاً آسان کام ہوگا۔ مدد کے لئے کسی لڑکے کو رکھ لے۔ اس طرح پہلے دکان دیکھی گئی۔ اتفاق سے بیشتر دکانیں تو مقامی لوگوں کے پاس تھیں لیکن ایک دکان مل ہی گئی۔ ساتھ لائے ہوئے زیورات بیچ کر سامان ڈلوایا۔ غریب آبادی کے ایک نوعمر لڑکے کو ملازم رکھ کر کام کا آغاز کردیا اس طرح ایک مہم تو سر ہوئی تو زندگی کو معمول پر آتے اور ان کو یہاں رہتے تین ماہ ہونے والے تھے، اب تک سب ٹھیک ہی جارہا تھا۔ لیکن آئندہ کیا ہونے والا تھا یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

دونوں چھوٹی رضیہ اور صفیہ کو اسکول میں داخل کروادیا گیا، ثریا کی عدت بھی پوری ہونے والی تھی۔ ثریا کی ساس سردار بیگم اب ارد گرد کی کوٹھیوں میں آنے جانے لگی تھیں تاکہ کچھ جان پہچان اور محلہ داری کا تعلق قائم ہوجائے۔

آتی سردیوں کے خوشگوار دن تھے عابدہ کا دل یونہی چاہا کہ وہ اوپر چھت پر جائے کام تو وہ ماں کے ساتھ مل کر نمٹا ہی چکی تھی۔ ساجدہ پچھواڑے باغ میں بیٹھی چادر کاڑھ رہی تھی۔ عابدہ اوپر آ گئی۔ اس کا ارادہ چھت کا جائزہ لینا تھا ساتھ ہی سوچا کہ جب تک دھوپ میں تیزی نہیں آتی وہ دھوپ سینک لے گی۔ کافی وسیع چھت تھی۔ ساری کی ساری پختہ دیواریں قدرے اونچی تھیں لیکن پھر بھی اردگرد سب با آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ بہت دیر تک وہ گھوم کر یہاں وہاں دیکھتی رہی علاقے کی خوب صورتی سے محظوظ ہوتی رہی، پھر دل بھر گیا تو بیٹھنے کے لئے کسی چیز کی تلاش میں نگاہیں گھمائیں تو چھت کی مشرقی جانب بنے ہوئے دو کمروں کے برآمدے میں دو موڑھے دکھائی دیئے وہ جا کر ایک موڑھا اٹھا لائی جو کہ گرد سے اٹا ہوا تھا، دوپٹے کے پلو سے جھاڑا اور دھوپ میں بیٹھ گئی۔

نرم گرم دھوپ اچھی لگ رہی تھی پھر وہ مقفل کمروں کی جانب دیکھ کر سوچنے لگی کہ دادا نے انہیں نہیں کھلوایا، بھلا یہ بھی کھلوا کر دیکھ لیتے، گرمیوں میں اوپر سونے کے لئے چھت استعمال ہوگی تو بستر اور چارپائیاں ہی رکھ لیں گے۔

اب دھوپ میں تیزی آ رہی تھی، وہ کمرے کے دوسری جانب منہ کر کے بیٹھی تو سامنے نظر گئی، دیکھا تو ایک بہت بڑا اور سیاہ سانپ پھن اٹھائے کھڑا تھا، سانپ اس قدر بڑا اور موٹا تھا کہ عابدہ نے چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن حلق سے آواز نہ نکلی سانپ مسلسل اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

لاشعوری طور پر عابدہ بھی اس کی طرف نگاہیں لگائے بیٹھی تھی اس سانپ کی دہشت تھی یا سحر کہ وہ نہ ہل سکی نہ چیخ سکی، نجانے کتنے لمحے بیت گئے پھر وہ سانپ رینگتا ہوا کمروں کی جانب جانے لگا، عابدہ اسی لمحے ٹرانس سے نکلی اور تیر کی طرح لپکتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔

عابدہ نے اس سے قبل کبھی اتنا بڑا سانپ نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیدھی دادی اور اماں کے پاس آئی وہ اتنا ہانپ رہی تھی کہ اس سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا سکا، بمشکل وہ دونوں کو سانپ کا بتا پائی۔

ثریا اور اس کی ساس سانپ کا سنتے ہی سراسیمہ ہو گئیں، دادی جلدی سے اٹھیں اور پڑوس والی کوٹھی سے ایک لڑکا بلا لائیں، پھر ثریا نے ایک بڑا ڈنڈا لڑکے کو دیا اور ایک خود پکڑ لیا اور چھت پر آ گئے، عابدہ بھی دو افراد کی ڈھارس سے ساتھ ہی آ گئی، پھر سب نے تمام چھت کا کونہ کونہ دیکھ لیا لیکن کہیں سانپ نظر نہ آیا۔

عابدہ نے کمروں کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ "اس نے اس جانب سانپ کو جاتے دیکھا تھا۔" کمرے تو بند تھے انہوں نے ہر طرف ٹھونک بجا کر دیکھا لیکن کوئی درز یا سوراخ ایسا نظر نہیں آیا جہاں سے عابدہ کی بتائی ہوئی جسامت کا سانپ گھس سکتا تھا۔

پڑوسی لڑکا حامد نے ثریا سے کہا۔ "خالہ جتنا بڑا ناگ باجی بتا رہی ہیں وہ یہاں تو نہیں گھس سکتا البتہ نیچے اتر گیا ہوگا ویسے بھی باجی کہتی ہیں کہ ناگ نقصان پہنچائے اور حملہ کئے بغیر چلا گیا ہے تو ڈرنے والی کوئی بات نہیں، ہو سکتا ہے کہ ناگ ویسے ہی آیا ہو، انہیں دیکھ کر پلٹ گیا ہوگا، اب کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بلا لیجئے گا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

وہ دونوں بھی نیچے آ گئیں لیکن سب کے دل میں ڈر بیٹھ گیا، دادی نے کہا کہ "آ لینے دے تیرے ابا کو ان سے کہتی ہوں کہ اوپر والے کمروں کے تالے تڑوا کر وہاں بھی صفائی کر لیں یہ نہ ہو کہ خالی گھر میں کوئی موذی وہاں پل رہا ہو آخر بچیوں والا گھر ہے۔"

دوپہر میں اسکول سے رضیہ اور صفیہ بھی آ گئیں تو دادی نے دوپہر کے کھانے پر سب کو سختی سے منع کر دیا کہ "اوپر کوئی نہ جائے اور بہو کو ہدایت کی کہ تمام احتیاطی تدابیر کرے ایک بار پھر سارے گھر کی صفائی کرو اور لحاف بھی نکلوا کے ان کے استر دھو کر پھر استعمال کرو کیونکہ یہ سب ان سے پہلے ہندوؤں کے استعمال میں تھا ایک بار پاک کر کے استعمال میں لے آؤ۔"

ایک بار پھر سب کام میں جت گئیں رات رمضان احمد گھر آئے تو سارا واقعہ ان کے سامنے بیان کیا گیا۔ انہوں نے بھی کہا کہ "کل وہ اپنے ملازم لڑکے کو گھر بھیجیں گے۔ وہ آ کر تالے توڑ جائے گا اور ساتھ ہی کمروں کی صفائی بھی اسی سے کروا لینا تا کہ کوئی مسئلہ ہو تو دیکھ لے گا۔"

اگلے روز دکان کا ملازم لڑکا حمید دن دس بجے کے بعد آ گیا اٹھارہ انیس برس کا محنتی اور صحت مند لڑکا تھا ثریا اور اس کی ساس اسے لے کر اوپر آ گئیں، ساتھ ہی پانچ سیر کا بلد بھی تھا۔ اس نے باری باری دونوں کمروں کے تالے توڑے جو کہ بہت جان ماری کے بعد ٹوٹے۔

ثریا نے چند لمحے سوچا پھر حمید سے کہا "بیٹا تو رک میں اندر جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے کنڈا کھولا اور اللہ کا نام لے کر کمرے میں داخل ہو گئیں، پہلے تو اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا پھر آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو دیکھا کہ کمرہ تقریباً خالی تھا لیکن درمیانے سائز کے لکڑی کے چار پانچ صندوق اوپر نیچے اور کچھ دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تھے، سب کے سب اچھی طرح سے بند تھے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی، صرف ایک دیوار کے ساتھ کچھ ایسا سامان جیسے لکڑی کے دانوں کی مالا، بجھے دیئے، مرجھائے پھول اور سیندور کی ڈبیا پڑی تھی جیسے یہاں کوئی پوجا یا وظیفہ کرتا رہا ہو، انہوں نے باہر آ کر حمید سے کہا کہ "اندر پڑے بکسوں کو کھولے نہیں بس ادھر ادھر کرکے کمرے کی صفائی کردے۔"

حمید جھاڑو پونچھا لے کر اپنے کام میں لگ گیا۔

ساس کے کہنے پر بہو نے جواب دیا۔ "اماں لکڑی کے صندوق ہیں معلوم نہیں ان میں کیا ہو، کل صبح ابا کی موجودگی میں کھلواؤں گی، نامعلوم اس کے سامنے کھولنا مناسب ہے یا نہیں۔"

ساس نے بھی سمجھنے کے انداز سے سر ہلا دیا پھر ثریا نے دوسرے دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہو گئیں کمرہ ان کی توقع کے بالکل برعکس تھا صاف ستھرا اور پرتعیش خوب صورت پلنگ پر دبیز گدا اور اعلیٰ پوش بھاری پردے قیمتی قالین چھت کے ساتھ لٹکتا بیش قیمت فانوس آبنوس کی لکڑی کی نقش و نگار والی خوب صورت میز، غرض یہ سب بہت شاندار تھا صفائی سے لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ کمرہ مہینوں سے بند ہو، حتیٰ کہ پلنگ کی ہلکی ہلکی شکنوں سے ایسا لگتا تھا کہ ابھی کوئی اٹھ کر گیا ہو، یہ سب دیکھ کر دونوں پریشان ہو گئیں فوراً باہر آ گئیں اور کمرہ بند کردیا۔

پریشان کن امر یہ تھا کہ انہوں نے اپنے سامنے تالہ تڑوایا تھا، پھر کمرے کے اندرونی منظر نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ بہرحال وہ خاموش رہیں، حمید کچھ دیر بعد صفائی کرکے نکل آیا، پونچھا کا سامان اس نے ایک تھیلے میں ڈال کر انہیں پکڑا دیا اور دوسرے کمرے کی صفائی کا پوچھنے لگا تو ثریا نے منع کردیا پھر تھیلا اسی کمرے میں رکھ کر دروازہ بند کرکے تینوں نیچے آ گئے، دوپہر کا کھانا عابدہ اور ساجدہ نے تیار کردیا تھا، حمید کو کھانا کھلا کر سر کا کھانا باندھ کر دیا اور شکریہ ادا کرکے بھیج دیا۔

ثریا کو معلوم تھا کہ لڑکیوں کو اوپر کے کمرے دیکھنے کا بہت تجسس ہے لیکن اس نے سختی سے سب کو کہا۔ "کوئی بھول کر بھی اوپر نہ جائے۔"

رات میں رمضان احمد آئے تو بہو نے کھانا رکھا، ہاتھ دھلائے اور پاس بیٹھ گئی، رمضان نے جیسے ہی کھانا ختم کیا ثریا حقہ تازہ کرکے لے آئی اور ان کے قریب لاکر رکھ دیا۔ پھر دن میں دیکھے جانے والی صورتحال ان کے سامنے رکھی۔ "ابا جی آپ جانے سے پہلے صندوق خود دیکھ لیں، نامعلوم ان میں کوئی ایسی ویسی چیز نہ ہو۔"

"کاش! اللہ مجھے ایک بیٹا ہی دے دیتا، بڑھاپے میں آپ پر میرا اور میری بچیوں کا بوجھ بھی آن پڑا ہے۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگ گئی تو اپنے مرحوم بیٹے کو یاد کرکے رمضان اور ان کی بیوی بھی آبدیدہ ہو گئیں۔

اگلی صبح نماز کے لئے بیدار ہوئے رمضان مسجد چلے گئے، باقیوں نے گھر پر نماز پڑھی عابدہ اور ساجدہ تلاوت کے بعد پھر سو گئیں، رضیہ اور صفیہ اسکول کے لئے تیار ہونے لگیں ثریا سب کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگی، ناشتے کے بعد حمید آ گیا، بچیوں کو اسکول چھوڑنے چلا گیا، ثریا صندوقوں کو کھولنے کے لئے ہتھوڑی نکال کر لے آ گئی۔ حمید واپس آیا تو رمضان نے دکان کی چابیاں پکڑائیں اور خود بعد میں آنے کا کہہ کر روانہ کیا۔ اس کے بعد تینوں اوپر آ گئے۔ سب سے پہلے ثریا نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جو کسی کی خواب گاہ معلوم ہوتا تھا لیکن یہ کیا دروازہ باہر سے کنڈا ہٹانے کے باوجود نہیں کھلا اس نے ہر

طرح سے زور لگا کر دیکھ لیا مگر نہیں کھلا۔

رمضان یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ثریا کو منع کر دیا اب انہوں نے دوسرا دروازہ کھولا اور اندر رکھی لکڑی کی پیٹیاں سسر کو دکھائیں پھر انہوں نے انہیں کھولنا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی کوشش سے ایک صندوق کھل گیا۔ رمضان نے دیکھا اس میں بہت سی کتابیں رکھی تھیں سب کی سب سنسکرت زبان میں تحریر تھیں اور خاصی پرانی بھی، اس پر ڈھکن واپس رکھ دیا اس کے بعد دوسرا کھولا تو اس میں جلے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے تھے سب نے حیرت سے دیکھا کہ جلے ہوئے ٹکڑوں کو بھلا اس قدر سنبھال کر صندوق میں بند کر کے رکھنے کی کیا ضرورت۔

بہر حال اسے بھی ایسے ہی رہنے دیا گیا۔ اگلا صندوق سائز میں سب سے چھوٹا تھا اسے کھولا تو اس میں چاندی کے بہت سارے برتن چمکتے ہوئے ایسے کہ ابھی استعمال نہ ہوئے ہوں اب آخری صندوق رمضان نے خود کھولا۔ ثریا اور سردار بیگم کو پیچھے کھڑا ہونے کو کہا۔ احتیاط سے اسے بھی کھولا تو اس میں دلہن کا بہت قیمتی اور خوب صورت لباس تھا ساتھ میں مکمل زیورات تھے۔

رمضان احمد نے اس کو ہاتھ لگائے بغیر یہ صندوق بھی بند کر دیا پھر اٹھ کر باہر آ گئے، انہیں نکلتا دیکھ کر وہ دونوں خواتین بھی باہر آ گئیں۔ ثریا نے دروازہ بند کر دیا۔ رمضان نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "میری عمر ستر کے قریب ہے میں تمام عمر ہندوؤں کے ساتھ رہا ہوں، ان کا مذہب پراسرار سا ہے ان میں ایسی بہت سی رسوم اور مذہبی وظائف ہیں جو یہ دوسروں سے پوشیدہ رکھتے ہیں ہمارا یہ گھر بھی ہم سے قبل کسی ہندو رئیس کا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں ان تمام چیزوں سے دور رہنا چاہئے یہ کسی اور ہی چکر کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ اگر کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتے تو جب تک میں کسی صاحب علم اور روحانی شخصیت کو تلاش نہیں کر لیتا تم ان کمروں سے دور رہو اور بچیوں کو بھی دور رکھو۔"

اس کے بعد سب خاموشی سے نیچے آ گئے۔

رمضان احمد کا اپنے اہل خانہ پر خاصہ دبدبہ اور احترام تھا۔ اگر انہوں نے کہہ دیا تھا کہ اوپر کے کمروں سے لاتعلقی اختیار کی جائے تو یہی ہونا تھا ان کے جانے کے بعد دادی نے عابدہ اور ساجدہ کو اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ اب وہ اوپر جائیں بھی تو بھولے سے کمروں کو کھول کر یہ دیکھنے کی کوشش نہ کی جائے اور دونوں چھوٹیوں کو خاص طور پر سمجھایا گیا۔

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا ثریا کو سسر تمام آمدنی لا کر دے دیتے، وہی گھر اور دکان کے پیسوں کا حساب رکھتی اور نظم و ضبط سے گھر چلاتی بلکہ وہ دونوں بڑی لڑکیوں کی شادی کے لئے پس انداز بھی کر رہی تھی اس عالیشان کوٹھی میں آ کر رہنے پر وہ اور اس کی بیٹیاں خوش تو بہت تھیں کیونکہ انداز زندگی بھی بدلا تھا ساتھ ہی ان کی برادری کے لوگوں پر ان کے گھر کی دھاک بھی بیٹھ گئی تھی اور انہیں یہاں کوئی تکلیف بھی نہ تھی لیکن اوپر کی منزل کا اسرار اسے بے چین کر دیتا کہ "کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے نہ جانے۔"

شدید سردی کا موسم آ چکا تھا اکثر دھند ہی رہتی تھی ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی کہ ثریا کی آنکھ کھل گئی اسے اندازہ نہ ہوا کہ کوئی بیدار ہوا ہے پھر یہ سوچ کر اٹھ گئی کہ فجر کی اذان تو ہونے ہی والی ہے وہ اٹھ کر سب کے لئے پانی گرم کر دے، کمرے میں ہلکی روشنی کی لالٹین جل رہی تھی اس نے لالٹین کی روشنی بڑھا دی اور کنوئیں سے پانی نکالنے کے لئے بالٹی اٹھا کر کنوئیں کی جانب چل دی کنواں سیڑھیوں کے سامنے تھا پانی نکال کر پلٹی تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا کم از کم دو فٹ لمبا سانپ سیڑھیوں سے اوپر جا رہا تھا وہ پانی رکھ کر جلدی سے سیڑھیوں کی طرف آئی اس کے قدموں کی آواز سے سانپ نے پھن اٹھا کر اس کو پلٹ کر دیکھا۔

ثریا کی روح فنا ہو گئی لیکن اگلے لمحے سانپ اوپر چلا گیا۔ ثریا نے جلدی سے بالٹی اٹھائی اور کچن کے دروازے کے پاس پہنچی، اتنے میں اذان شروع ہو گئی وہ بھاگ کر سسر کے کمرے میں گئی اور انہیں اٹھایا۔ "ابا ابا اٹھو میری بات سنو، ابا ہمارے اوپر واقعی کوئی رہتا ہے۔"

رمضان ہڑبڑا کر اٹھے۔ "کیا ہوا پتر کیوں گھبرائی ہوئی ہے۔"

اتنے میں سردار بیگم بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں ثریا نے کہا۔ "ابا میں وضو کے لئے پانی نکالنے کے لئے پلٹی تو سیڑھیوں پر

ایک بہت بڑا موٹا ناگ اوپر جا رہا تھا اس نے مجھے پلٹ کر دیکھا بھی لیکن کہا کچھ نہیں اور تیزی سے اوپر چلا گیا۔

ابا آپ اوپر جا کر اس سے پوچھو وہ کون ہے اور ہمارے گھر میں کیوں رہ رہا ہے، ابا بھی سانپ بھی گھروں میں رہتے ہیں وہ تو زمین میں کھوہ بنا کر رہتے ہیں اور انسان کو تو دیکھتے ہی ڈس لیتے ہیں یہ کیسا سانپ ہے جو ہمیں کچھ نہیں کہتا۔"

رمضان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کندھے سے لگا کر تسلی دی۔ "پتر تو نہ گھبرا بلکہ حوصلہ رکھ، بچیوں کے سامنے اس بات کا ذکر بھی نہ کرنا، میں دیکھتا ہوں کہ کیا معاملہ ہے تو وضو کا پانی رکھ میں نے نماز کے لئے جانا ہے۔"

ثریا اب کچھ بہتر ہوئی تو پانی گرم کرنے چلی گئی، دونوں کے لئے الگ الگ گرم پانی کے لوٹے رکھے اور پھر خود وضو کر کے نماز پڑھنے لگی، رمضان احمد وضو کے بعد مسجد چلے گئے۔ نماز کے بعد سردار بیگم خاموشی سے اوپر جانے لگیں، ابھی مکمل دن نہیں ہوا تھا ملگجا سا اندھیرا تھا تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی انہوں نے تمام چھت کو اچھی طرح سے دیکھا پھر رہائشی کمرے کی طرف آ گئیں، دروازہ کھولا تو کھل گیا اب بھی اندر کا منظر ویسا ہی تھا جیسے پہلے دیکھا ہلکی ہلکی خوشبو بھی آ رہی تھی، لیکن کوئی بھی ذی نفس دکھائی نہیں دیا، وہ دروازہ بند کر کے پلٹ آئیں۔

ثریا نے سسر کے کپڑے نکالے ان کے نہانے کا پانی گرم کیا۔ آج جمعہ تھا اور وہ گھر سے نہا کر جاتے اور دکان سے ہی نماز جمعہ کے لئے چلے جاتے غسل خانے میں گرم پانی رکھا ابا کے کپڑے اور چادر باہر کھونٹی سے ٹانگے اور ان کے لئے ناشتہ تیار کرنے چلی گئی۔

اگلے ہفتے ان کے خاندان میں شادی کی تقریب آ رہی تھی۔ رمضان نے خواتین سے کہا کہ وہ شرکت کر لیں وہ صرف ولیمہ میں آ جائیں گے۔ تمام ہفتہ شادی کی رسوم میں شرکت کرتے گزر گیا جمعہ کو شادی تھی لیکن دادی کو رات سے خاصا بخار ہو گیا جو صبح تک ٹھیک نہ ہوا۔ دادا نے تمام کو شادی میں شرکت کا کہا اور عابدہ نے گھر پر رکنا منظور کر لیا اسے دادی سے بہت انسیت تھی چونکہ وہ بیمار تھیں تو ثریا کو ان کی جگہ جانا ضروری تھا رمضان نے دکان بند رکھی، بہو اور پوتیوں کو لے کر چلے گئے۔

عابدہ نے دادی کو اپنے ہاتھ سے کھچڑی کھلائی دوا دی اور خود گھر کا کام نمٹاتی رہی دوپہر کے قریب کام ختم کر کے دادی کا سر دبانے بیٹھ گئی کچھ دیر بعد تو دادی سو گئی لیکن عابدہ کا تجسس جاگ اٹھا اسے معلوم نہیں تھا کہ اوپر کیا ہے، بس ماں اور دادی نے اوپر جانے پر پابندی لگا رکھی تھی۔

دادی کی طرف سے اطمینان تھا جبکہ باقی سب تقریب میں گئے تھے۔ شام سے پہلے کہاں واپس آنا تھا، وہ اٹھی چپل پاؤں میں ڈالی دادی کے اوپر لحاف درست کیا اور آہستگی سے چلتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ یہاں آ کر پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر کمروں کی جانب آ گئی، قفل ندارد تھے، اتفاق سے ایک دروازہ بھی کچھ کھلا ہوا تھا، عابدہ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور ایک قدم اندر رکھ دیا، پاؤں کے نیچے قالین محسوس ہوا اور نگاہوں نے ایک عشرت کدے کو روبرو دیکھا ایک نگاہ میں یہ اس جگہ کی زیبائش اور ماحول نے اسے مسحور کر لیا، اس نے پاؤں سے چپل اتار کر اندر آ گئی اور اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھنے لگی ہر چیز کو ہاتھ لگا کر محسوس کرتی آخر پلنگ پر بیٹھ گئی، پلنگ کے بچھونے کی دبازت سے لگا کہ وہ بادل پر بیٹھی ہو۔

وہ یونہی لیٹ گئی اسے یہ بہت پسند آیا تھا وہ سوچنے لگی۔ "یہاں کون رہتا ہو گا کس قدر اعلیٰ ہے یہ بچھونا اور غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور وہ سو گئی۔

کتنا سوئی یہ تو معلوم نہیں لیکن کسی کے لمس سے وہ اچانک اٹھ گئی، آنکھ کھلنے پر دیکھا کہ ایک خوبرو مرد اس کے سر پر ہاتھ رکھے جھک کر کھڑا ہوا ہے، وہ بوکھلا کر تیزی سے پلنگ سے اتری اور دوپٹہ اٹھا کر سر پر پھیلا لیا۔ مرد نے اسے ایسا کرتا دیکھا تو مسکرا کر سیدھا ہو گیا۔

عابدہ نے پوچھا۔ "آپ کون ہیں اور یہاں ہمارے گھر میں کیسے اندر آ گئے؟"

وہ دو قدم چل کر قریب آیا اور کہا۔ "آپ کا گھر نیچے ہے میں آپ کے گھر نہیں بلکہ آپ میرے گھر میں آئی ہو وہ بھی بغیر پوچھے۔"

عابدہ پہلے تو گھبراہٹ میں اسے ٹھیک سے دیکھ بھی نہ پائی تھی۔ اب اس کی جانب دیکھا۔ وہ دراز قد نہایت حسین اور خوبرو تھا سیاہ لباس میں اس کی سفید رنگت بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا اماں اور دادا کو پتہ ہے کہ آپ یہاں رہتے ہو، ہم نے تو کبھی آپ کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔“

”نہیں کوئی نہیں جانتا کہ میں یہاں رہتا ہوں اور نہ کوئی میری مرضی کے بغیر جان سکتا ہے اور تم بھی کسی سے نہیں کہو گی کہ تم مجھے یہاں دیکھ اور مل چکی ہو سمجھ گئیں ناں۔“

عابدہ کی جان پر بنی ہوئی تھی وہ جانے کے لئے پلٹی تو اس نے کہا۔ ”رکو کہاں جارہی ہو۔“

وہ رک گئی۔ ”یہاں بیٹھو۔“ اس نے پلنگ کی پائنتی کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ...... وہ دادی کو بخار ہے میں جاؤں کھانا کھلانا ہے۔“

”تمہاری دادی ابھی نہیں اٹھے گی تم آرام سے بیٹھو۔“ عابدہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی وہ دوسری طرف بیٹھ گیا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی میرا نام عابدہ ہے۔“

”اچھا میری بات توجہ سے سنو! میں یہاں کسی خاص وجہ سے ہوں، کچھ مدت کے بعد جو مجھے بھی معلوم نہیں کتنی ہے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ بس تم سب مجھ سے کوئی مطلب نہ رکھو۔ میں بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم سب جیسے رہ رہے ہو رہتے رہو اگر تمہارے گھر والوں کی طرف سے تکلیف نہ ہوئی تو میں تمہیں فائدہ بھی دوں گا۔ دوسری صورت میں میرا تو کچھ بگڑنے والا نہیں لیکن نقصان بھی تمہارے گھر والے اٹھائیں گے۔“

عابدہ مزاجاً کچھ سمجھدار تھی اگرچہ پورے معاملے کا جاننا اس کے بس میں نہیں تھا لیکن جتنا سمجھ آیا وہ کافی تھا اس کے بعد وہ رکی نہیں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی اور پھر نیچے آکر سب سے پہلے دادی کو دیکھا وہ ابھی سو رہی تھیں۔ اس نے شام کو کھانے کی قبل از وقت تیاری شروع کردی۔ شام مغرب سے پہلے سب آگئے۔ عابدہ نے معمول کے مطابق تمام کام ختم کیے، شادی کی تقریب کا احوال پوچھا پھر سب عشاء کی نماز میں مشغول ہوگئے۔

رمضان احمد عشاء کی نماز پڑھ کر آئے تو آکر لحاف اوڑھ کر بیٹھ گئے اور درود شریف کی تسبیح پڑھنے لگے۔ باقی سب اپنے اپنے کمروں میں جاچکے تھے عابدہ اسی کی منتظر تھی، وہ دادی کو دیکھنے کے بہانے آئی لحاف درست کیا اور دادا کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ”بڑے ابو مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ بہت آہستگی سے بات کررہی تھی۔ تاکہ دادی تک آواز نہ جائے۔

”کیا بات ہے پتر بتا۔“

”وہ ابو آپ پہلے مجھے معاف کردیں کہ میں آپ کی بات نہیں مانی اور غلطی کر بیٹھی۔ آج جب آپ سب گئے ہوئے تھے تو میرا دل چاہا کہ میں اوپر جاکر دیکھوں کہ وہاں کیا ہے؟ اور جب میں وہاں گئی تو دیکھا کہ کسی نواب کے گھر جیسا کمرہ تھا لیکن خالی، میں وہاں بیٹھ گئی اور پھر سوگئی۔“ اور آگے کا سارا واقعہ بیان کردیا۔

رمضان احمد نے توجہ سے اس کی بات سنی۔ ”پتر غلطی تو تو نے بہت سنگین کی ہے لیکن جب میں بھی تمہاری عمر کا تھا تو وہی کام کرجاتا جس سے بڑے منع کرتے یہ عمر ہی ایسی ہے دوسرا اس سے ہمیں کھل کر کسی کے ہونے کا پتہ چل گیا ہے کیونکہ وہ ہم میں سے کسی کے سامنے نہیں آیا، تمہارے سامنے آگیا، اب تم سختی سے احتیاط کرو کہ کبھی اوپر نہ جاؤ میری عمر ایسی نہیں کہ میں کوئی مسئلہ جھیل سکوں اور تم بچیوں کا ساتھ ہے، عافیت اسی میں ہے کہ خاموشی سے رہا جائے، وہ جن ہے یا سانپ جو کوئی بھی ہے اپنی مدت پوری کرکے کبھی تو چلا ہی جائے گا۔ بس تم اپنی بہنوں کو نہ بتانا اور ان پر نظر رکھنا کہ وہ اوپر نہ جائیں۔“ عابدہ نے سر ہلا کر دادا کی تائید کی اور اٹھ کر آگئی۔

رمضان کو بس اپنی پوتیوں کی فکر رہتی تھی۔ وہ بچہ نہیں تھے کہ گھر میں چلنے والے پراسرار چکر سے بے خبر رہتے لیکن دانستہ بے خبر بننے میں ہی بھلائی تھی۔ اگر آس پڑوس اور خاندان برادری کے لوگوں کو ان کے گھر سے متعلق کوئی بھی غیر معمولی بات کا پتہ چلتا تو آئندہ ان کی پوتیوں کے رشتے

ہونا مشکل ہوجاتے۔ اسی لئے انہوں نے اس معاملے کو قطعی نظر انداز کردیا اور رہنے والے نے خود ہی حد فاصل واضح کردی تھی تو وہ بلاوجہ کیوں چھیڑ چھاڑ کرتے۔

وقت خاموشی سے گزر رہا تھا، دادی اور ثریا کو بھی معاملے کی کافی حد تک سمجھ آچکی تھی۔ انہوں نے بھی چشم پوشی اختیار کئے رکھی ایک صرف عابدہ تھی جسے پہلی ملاقات کے بعد ایک بار پھر اس کا سامنا ہوا اور اس نے اسے گھر کے سب سے آخری اور الگ تھلگ کمرے میں ایک پوشیدہ جگہ پر رکھے ہوئے چاندی کے سکوں کا بتایا کہ "وہ اسے وہاں سے نکال کر اپنے استعمال میں لے آئیں۔" یہ ان کے تعاون کے جواب میں پہلا انعام تھا۔ ان سکوں کو رمضان نے امداد غیبی جانتے ہوئے دونوں بڑی پوتیوں کے جہیز اور شادی کے اخراجات کی مد میں سنبھال لیا۔

عابدہ اٹھارہ برس کی ہوچکی تھی کہ ان کی برادری سے اور ایک ان کی کالونی میں رہنے والے انہی کے جیسے مہاجر گھرانے سے رشتے آئے سردار بیگم اور رمضان نے دونوں سے وقت لے لیا گھر میں یہ موضوع زیر بحث تھا جبکہ عابدہ اس سب سے لاتعلق گھر میں الجھی ہوئی تھی۔ اتنا بڑا گھر تھا کہ بانٹ کر کرنے کے باوجود اس کے لئے خاصہ کام ہوتا۔

وہ دوپہر کے کھانے کے برتن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی، دن خاصا گرم تھا کچھ لمحوں کے بعد اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ اسے سانپ کی زبردست پھنکار سنائی دی وہ گھبرا اٹھی اور جلدی سے کھڑکی کا پٹ کھولا اس کی کھڑکی سے سیڑھیاں بخوبی دکھائی دیتی تھیں اسے وہی سانپ دکھائی دیا وہ پھن اٹھائے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اگلے لمحے وہ اوپر جاتا دکھائی دیا عابدہ کو لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے وہ دوپٹہ اوڑھ کر نکلی اور سوچا کہ دادی سے پوچھ کر چلی جائے لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ دادی کبھی جانے نہیں دیں گی وہ خاموشی سے بنا بتائے اوپر جانے لگی۔

دھوپ بہت تیز تھی گرمی ایسی تھی کہ باہر نکلنا محال تھا لیکن اسے جانا پڑ رہا تھا۔ وہ کافی عرصے بعد سیڑھیوں پر قدم رکھ رہی تھی۔ کئی ماہ پہلے اوپر گئی تھی تب اس نے سکوں کے متعلق بتایا تھا آج اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا کہ نجانے کیا بات ہے وہ کمرے کے باہر کھڑی تھی کہ ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولے کہ دروازہ خود ہی کھل گیا وہ چپل اتار کر اندر آگئی، دوپٹہ اس نے مضبوطی سے لپیٹ رکھا تھا۔ باہر سے اندر کا ماحول بالکل الگ تھا راحت انگیز ٹھنڈک نے اس کا استقبال کیا۔ عابدہ نے سامنے دیکھے بغیر سلام کیا یہ بالکل غیر ارادی طور پر ہوگیا تھا لیکن اسے جواب بھی مل گیا وہ خاموشی سے نگاہیں جھکا کر کھڑی رہی۔ "بیٹھ جاؤ لڑکی لگتا ہے میرا بلانا اچھا نہیں لگا۔" اس کی بات پر عابدہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "تمہارے لئے دو رشتے آئے ہیں اپنے دادا سے کہو کہ برادری والے رشتے کو منع کردے وہ لالچ میں تمہارا رشتہ لینا چاہتے ہیں جبکہ پڑوس سے آنے والے رشتہ کو قبول کرلیں وہاں تم ٹھیک رہو گی۔ میں نے سوچا کہ تم سب کو بہتر فیصلے سے آگاہ کردوں۔ میری آزادی کے دن بھی قریب آرہے ہیں۔ کچھ وقت ہے کہ میں بھی چلا جاؤں گا۔ میری طرف سے اپنے گھر والوں کا شکریہ ادا کرنا تم مسلمان بہت اچھے ثابت ہوئے ہو۔" عابدہ خاموشی سے سنتی رہی۔ "میں اگر کچھ پوچھوں تو برا تو نہیں لگے گا۔"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"آپ کا نام کیا ہے اور آپ کون ہیں؟" اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "بتا تو دوں لیکن تمہارے لئے اس میں نقصان ہے کیونکہ انسان سے راز چھپانا ممکن نہیں وہ کبھی نہ کبھی راز کھول دیتا ہے۔ میرا راز ایسا ہے کہ اگر تم افشا کردو تو مصیبت میں پڑ سکتی ہو، میرے یہاں رہتے ہوئے تمہیں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی لیکن میرے جانے کے بعد میرا راز کھلتے ہی مصیبتوں کا آغاز ہوجائے گا۔ تم سب نے میری توقع کے برعکس یہاں میری موجودگی کو نظر انداز کیا اور صبر اور خاموشی سے وقت گزارا جس کا مجھے یقین نہیں تھا۔ یہ عقلمندی مجھے بہت پسند آئی ہے۔ میں اس کا بھرپور محبت سے جواب دوں گا۔ اگر تم خود پر قابو رکھ سکتی ہو تو میں اپنے بارے میں بتا دیتا ہوں۔"

عابدہ نے کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کے

بارے میں کبھی بات نہیں کروں گی اس میں میرا نقصان ہے آپ کے ہی مطابق تو کیوں برے وقت کو آواز دوں۔"

"تو سنو یہ ایک کہانی ہے تم سب کے یہاں آنے سے قبل یہاں ایک ہندو رئیس شنکر کمار رہتا تھا ان ہندوؤں میں دولت کی بہت ہوس ہوتی ہے لیکن شنکر کمار میں کچھ زیادہ ہی تھی وہ بچپن میں یتیم اور بے سہارا تھا اس کے باوجود اس نے بہت دولت اکٹھی کی جس میں زیادہ حصہ اس نے سادھوؤں، پنڈتوں اور سالوں محنت کرنے والے پجاریوں سے حصول دولت کے چلوں سے حاصل ہونے والی دولت کا ہے اس کے لئے اس نے بچوں اور لڑکیوں کی قربانی تک دی۔ اب دولت تو بہت حاصل کرلی اب اسے اس کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا۔ اسے ایک گیانی نے یہ بتایا کہ اگر وہ کسی خاص سانپ کو منتروں کے ذریعے اپنی مایا پر بیٹھا دے تو وہ اس کی حفاظت کرے گا اور وہ جب چاہے اپنی دولت اپنے قبضے میں لے سکتا ہے لیکن اس کی بھی ایک خاص مدت ہے اگر وہ اس مدت کے پورے ہونے سے پہلے نہیں لیتا تو وہ مایا اس ناگ کی ہوجائے گی۔ اب اس ہندو نے ایک سپیرے سے بھاری قیمت پر ایک ناگ حاصل کیا جو کہ سانپوں کی مخصوص نسل ہے جو ایک مرحلے پر آکر انسان میں بدل جاتے ہیں وہ سانپ بھی ہوتے ہیں اور انسان بھی۔

وہ ناگ میں ہوں۔ جب اس نے مجھے حاصل کیا تو وہ میرا وقت انسان بننے کا نہیں آیا تھا ابھی کچھ وقت باقی تھا لیکن ظالم نے اپنی غرض کے لئے مجھے اس جادوگر گیانی کے ذریعے منتروں سے اپنی دولت پر پابند کردیا۔ وہ تو اپنی غرض پوری ہونے پر بہت خوش تھا لیکن میں اپنے اصل مقام اور بیوی سے دور ہوگیا مجھے اس کی دولت کی حفاظت کے دوران ہی اپنی مدت مکمل ہونے کا علم ہوا اور میں ایک انسان کے قالب میں آتا گیا، میں اب منقلب سانپ تھا اپنے دوسرے قالب میں آنے کے بعد میں نے اس رئیس کو کہا کہ "وہ میرے سب سے الگ رہنے کا بندوبست کرے۔"

تب اس نے اوپر کی منزل پر دو کمرے بنوائے اور میری خواہش کے مطابق سب کچھ مہیا کیا۔ پھر وہ وقت آیا کہ اسے یہ ملک چھوڑ کر جانا پڑا۔ موقع ایسا تھا کہ وہ سب ساتھ نہ لے جا نہیں سکتا تھا وہ اس وعدے پر معمولی سا سونا لے کر چلا گیا کہ وہ دوبارہ آئے گا اور میعاد مکمل ہونے سے پہلے سب کچھ لے جائے گا۔"

اب اس میں کچھ دن باقی ہیں اگر وہ آگیا تو سب اس کا ورنہ سب میرا، میں تو یہاں قید کے دن پورے کررہا ہوں مجھے اپنی محبوب بیوی بہت یاد آتی ہے وہ بھی منقلب ناگن ہے وہ بھی میرا انتظار کرتی ہوگی۔" یہ سب کہتے ہوئے وہ بہت دلگیر سا ہوگیا۔

عابدہ یہ جان کر کہ وہ ناگ ہے سکتے کے عالم میں تھی اس نے تو دادی سے یہ سنا ہوا تھا کہ اکثر جنات سانپ کے بھیس میں ہوتے ہیں وہ ہر روپ دھارنے پر قادر ہوتے ہیں وہ اسے بھی جن تصور کررہی تھی لیکن یہ سانپ سے بننے والا انسان تھا یعنی بیک وقت وہ جانداروں میں بدل جانے والی مخلوق، عابدہ بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی تو کہا۔ "تم نے ہمیں کاٹا کیوں نہیں اماں کہتی ہیں کہ سانپ کی فطرت ڈسنا ہے تو تم بھی آدھے سانپ ہو تو ہمیں کیوں نہیں کاٹا۔"

اس کا سوال بہت معصومانہ تھا پہلی بار اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تم نے تو مجھے بالکل عام سانپوں سے ملادیا لڑکی میں نے کہا نا کہ میں یہاں پابند کیا گیا ہوں اور اب میں انسان ہوں تمہارے اہل خانہ نے کچھ ایسا کیا ہی نہیں کہ میں کاٹتا اگر تم پسند کرو تو تمہیں کاٹ لوں۔"

یہ سن کر وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا۔ "رکو میں نے مذاق کیا اور تم نے سنجیدہ لے لیا۔ رکو ابھی مجھے اور بھی باتیں کرنی ہیں۔"

وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ "تم کھاتے پیتے کہاں سے ہو۔"

"میں وہی سب کھاتا ہوں جو تم کھاتے ہو۔" اس نے جواب دیا۔ "اپنے دادا سے کہو کہ تمہاری شادی کا انتظام کریں میں تمہاری شادی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب جب میں جا ہی رہا ہوں تو تم سب کا سامنا کرکے جاؤں اور نہیں یہ بھی کہنا کہ دھوم دھام سے ہونا چاہئے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کھڑکی کے ساتھ رکھی ہوئی آبنوسی الماری تک گیا اسے کھولکر کچھ نکالا اور واپس اس کی طرف آگیا۔ یہ

چاندی کی ایک چھوٹی صندوقچی تھی اس نے عابدہ کو دی، جو کہ خاصی بھاری تھی۔ "یہ بھی دادا کو دینا میری طرف سے تم سب بہنوں کی شادی کا تحفہ۔"

اسے یہاں بیٹھے خاصا وقت ہو گیا تھا وہ جلدی سے کھڑی ہوئی اور جانے لگی۔ "جی عصر کی اذان ہونے والی ہے میں جاتی ہوں۔" وہ چھپاک سے نکلی اور بھاگ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ سیڑھیوں کے قریب ثریا کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ "کہاں رہ گئی تھی تم جانتی ہو میری جان پر بنی ہوئی تھی اگر چند لمحے اور نہ آتی تو تیرے دادا کو بلوانے والی تھی۔" ثریا نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "اور یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"امی آپ تو بہت پریشان ہو جاتی ہو یہ اس نے دادا کے لئے دیا ہے۔" ڈبہ ماں کے ہاتھ میں دے کر کہا اور دادا کے لئے پیغام بھی ہے۔ "آپ سکون سے رہیں کوئی ایسی ویسی بات نہیں بس بڑے ابو آ جائیں تو بتا دوں گی۔"

پھر وہ دونوں وضو کرنے چل دیں پھر معمول کے کام چلتے رہے، رات میں رمضان احمد آئے تو ساجدہ نے جلدی سے بالٹیاں بھر کر غسل خانے میں رکھیں چادر باہر لٹکائی اور کھانا لگانے چلی گئی، گرمی کی وجہ سے رمضان احمد آتے ہی پہلے نہاتے پھر کھانا کھا کر نماز عشاء کے لئے چلے جاتے، رات آنگن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں، ثریا اوپر والی ہستی کا پیغام جاننے کے لئے بے چین تھی اس نے جلدی جلدی سب کو سلایا اور خود حقہ تیار کر کے لے آئی۔ اتنے میں ابا آ گئے دادی کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ بھی شوہر کی ساتھ والی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئیں۔

عابدہ نے پائنتی بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔ ثریا ساس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور لالٹین قریب ایک چھوٹی تپائی پر رکھ دی۔ جب رمضان اطمینان سے بیٹھ گئے تو ثریا نے ڈبہ نکال کر سسر کو تھما دیا اور کہا۔ "ابا جان آج اس نے پھر عابدہ کو بلوایا تھا اور آپ کے لئے یہ دیا ہے ہم نے کھولا نہیں کہ آپ کا کھولنا ہی مناسب ہو۔" رمضان نے ڈبہ کھولا تو لالٹین کی روشنی ماند پڑ گئی چاندی کا ڈبہ سونے کے زیورات اور جواہر سے بھرا ہوا تھا اس کی جگمگاہٹ نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔ آگے کی بات عابدہ نے دادی سے کہہ دی تھی وہ انہوں نے شوہر کو بتا دی کہ "یہ اس نے تمام لڑکیوں کی شادی کا تحفہ دیا ہے۔ وہ ہمارے سلوک سے بہت خوش ہو کر دے رہا ہے رشتہ کہاں کرنا چاہئے اس بارے میں اس کا پیغام اور آخر میں یہ کہ وہ یہاں سے کچھ عرصہ بعد جانے والا ہے۔"

"بات یہ ہے اسلم کی ماں کہ مجھے اس کے ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔" رمضان نے گلا کھنکھار کر اپنی بات کا آغاز کیا۔ "اس نے ہمیشہ ہمیں مالی فائدہ دیا ہے یہ اتنا بڑا گھر بذات خود کوئی نقد رقم نہیں کہ جس سے میں چاروں کی شادی کرتا الٹا ہر ایک کو ہمارے گھر کی وجہ سے ہم مالدار نظر آتے ہیں، وہ جن ہے یا سانپ مجھے کوئی مطلب نہیں وہ تو میرے لئے رحمت کا فرشتہ ہے اس نے تو ہماری پشتیں سنوار دی ہیں، اب یہی بات لے لو کہ اس نے رشتہ والوں تک رہنمائی کر دی ہے اب میں عابدہ کا رشتہ آنکھ بند کر کے کروں گا اور اصل فکر تو اب شروع ہو گی، بیشک اللہ کی پاک ذات ہی سب کی محافظ ہے لیکن وہ وسیلہ تھا اس گھر اور ہماری عزتوں کی حفاظت کا ورنہ سوچو میں بوڑھا آدمی گھر میں عورتیں ہی عورتیں اور نیا دیس مجھے تو قدم قدم پر خطرہ تھا اب تک جو کسی نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تو سوچو کیا راز ہے۔"

عابدہ پتر تو کسی طرح میری اس سے ملاقات کروا، تو بچی ہے کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں، جو بچوں سے نہیں کھلوائی جا سکتیں اور پھر مجھے اس کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔'

عابدہ نے نگاہیں جھکا کر کہا۔ "ابو وہ کہتے ہیں کہ اپنے دادا سے کہنا کہ شادی دھوم دھام سے کریں، وہ میری شادی میں آئے گا، آپ تب مل لینا میں خود بھی اوپر نہیں گی وہ بلائے تو جانا ہوتا ہے۔" اب بات کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔ اسی لمحے ان سب نے ایک ہلکی سی پھنکار سنی، اب سب اپنے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئے۔

آنے والے جمعہ کے روز رمضان احمد نے کالونی میں رہنے والے مرزا انور کے بیٹے کا رشتہ منظور کر لیا اور اپنی برادری کے عزیزوں کو جواب کہلوا دیا اسی روز شام کو انور میاں کے گھر والوں نے عابدہ کو شگن کے پیسے ہاتھ پر رکھ کر بات

ٹھہرالی، ایک ماہ بعد شادی کی تاریخ طے ہوئی، گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں اس دور کے رواج کے مطابق جتنا بھی ہوسکتا تھا، رمضان احمد نے پوتی کے لئے کیا بیس تولہ کے زیورات تیار کرواکر جہیز میں رکھے، فرنیچر برتن بستر سامان ہر چیز عمدہ اور ڈھیروں دی، رسومات شروع ہونے سے قبل تمام سامان اس کے سسرال بھجوادیا گیا۔

عابدہ کی مایوں کی رسم سے دو دن قبل گھر کا سابقہ مالک شنکر کمار چند سرکاری اہلکاروں کے ہمراہ آیا، اتفاق سے رمضان احمد گھر پر تھے۔ انہوں نے گھر کے اندر آنے کی اجازت طلب کی، بقول شنکر کمار کے کہ جاتے وقت وہ کچھ امانتیں چھوڑ گیا تھا جنہیں لینے وہ اب آیا ہے۔

رمضان نے پہلے گھر کی خواتین کو ایک طرف کروادیا پھر انہیں گھر میں داخل کرلیا۔ شنکر کمار خاصی جلدی میں تھا وہ جلد از جلد اپنی چیزوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اتنے میں سیڑھیوں سے اتر کر کوئی آتا دکھائی دیا شنکر کمار نے آنے والے کو دیکھ کر فرط جذبات سے کھڑا ہوگیا۔ رمضان نے پہلی بار اس اجنبی کو دیکھا جو اس گھر کا حصہ تھا لیکن کسی احساس کے بغیر آنے والے کے رعب حسن نے سب کو گنگ کردیا وہ آکر شنکر کمار کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ”بدھائی ہو شنکر کمار کہ تم آگئے اپنی امانتیں وصول کرلینے کے لئے۔“

اب شنکر کمار گویا ہوا۔ ”ہاں میں آگیا ہوں شبھ گھڑیاں بیت رہی ہیں بہتر ہے کہ کرنے والا کام پہلے کرلیا جائے۔“ اور وہ اپنی چابیوں کا گچھا نکال کر اس کے ساتھ ہولیا۔ ان کا رخ گھر کے پچھواڑے بنے ہوئے باغیچے سے ملحق کمرے کی جانب تھا۔ رمضان نے سوچا کہ وہ بھی ان کے پیچھے ہو جائے، کیونکہ اب یہ گھر اس کی ملکیت تھا، آخر وہ بھی جانے کہ کیا تھا جو اب تک ان سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔

جس کمرے میں وہ آئے تھے وہ تقریباً خالی تھا وہاں صرف فاضل چارپائیاں اور کچھ کباڑ رکھا ہوا تھا۔ شنکر کمار اپنے ساتھ دو ملازم بھی لایا تھا وہاں آکر اس نے دیوار کے سامنے کھڑے ہوکر کچھ پڑھنا شروع کردیا وہ زیر لب پڑھتا جارہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنا الٹا ہاتھ دیوار پر پھیرتا جارہا تھا پھر اس نے پڑھنا بند کردیا اور کونے میں بنے ہوئے طاقچے میں جاکر ہاتھ رکھا کہ دیوار درمیان سے ہٹ گئی۔ رمضان اور ساتھ آنے والے ملازم حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ رمضان نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ دیوار اتنی موٹی ہوگی کہ اس کے اندر خلا ہوگا اس خلا میں اوپر نیچے تین بڑے صندوق رکھے تھے ان صندوقوں پر مضبوط قفل ڈالے ہوئے تھے۔ شنکر کمار نے وہ صندوق ملازموں کی مدد سے اٹھوائے۔

باہر ایک چھوٹا فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ باری باری اس نے تینوں صندوق اس میں رکھوائے، رمضان احمد نے محسوس کیا کہ صندوق رکھوانے کے بعد اس کے چہرے پر پھیلا اضطراب ختم ہوگیا اب وہ خاصہ پرسکون نظر آرہا تھا اس نے آخر میں پہلے رمضان کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کی جانب رخ کرکے بولا۔ ”سورج ڈیڑھ برس ہوا کہ گیانی جی اس جہان سے گزر گئے میں جب سے فکرمند تھا کہ کہیں ان کے گزر جانے سے تم آزاد نہ ہوجاؤ۔ اور میں اپنی پونجی سے محروم ہوجاؤں لیکن تم نے اس مایا کی حفاظت کرکے میری فکر ختم کردی۔ اب تم آزاد ہو۔“ یہ کہہ کر شنکر کمار رخصت ہوگیا۔

رمضان اسی لمحے کا انتظار کررہے تھے وہ سورج سے بات کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ دروازہ بند کرکے پلٹے تو ان کے پیچھے کوئی نہیں تھا وہ سرد آہ بھر کے رہ گئے۔ لیکن کم از کم اتنا تھا کہ انہوں نے اس نادیدہ ہستی کو دیکھ لیا اور شنکر کمار کے بارے میں ان کا اندازہ تھا کہ وہ جو صندوق لے کر گیا ہے وہ یقیناً خزانے سے بھرے ہوں گے وہ اتنے عرصے کے بعد اپنی چھپائی ہوئی دولت کے لئے آیا تھا وہ سمجھدار تھے سب سمجھ رہے تھے مگر افسوس ہوا کہ وہ اس سے بات نہیں کرپائے۔

ثریا کو جب سسر کی زبانی اس بات کا علم ہوا تو وہ ان سے خاصی ناراض ہوئی کہ ”گھر اب ہمارا ہے تو یہاں کی ہر چیز بھی ہماری ہے، ابا آپ نے اس ہندو بچے کو کیوں سب لے جانے دیا۔ کبھی نہ کبھی وہ ہمارے سامنے آجاتا۔“

اس پر رمضان نے کہا۔ ”پتر ثریا تو نہیں جانتی مگر یہ حقیقت ہے کہ اس طرح کے خزانے خون سے رنگے ہوتے ہیں۔ اور ان کو حاصل کرنے والے بھی سکھ سے نہیں رہتے اچھا ہی ہوا کہ فساد کی جڑ ہمارے گھر سے نکل

گئی، ثریا پتر میری جوانی کے دور میں جب ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی تو ہمارے گاؤں میں ایک چمار تھا جو بیچارہ ادھر ادھر مزدوری کرکے گزر اوقات کرتا تھا تو ایک بہت پرانے اور بوسیدہ گھر کو گرانے کی مزدوری ملی وہ سارا دن یہی کام کرتا ایک روز اسے ایک دیوار گراتے ہوئے اس دیوار کی بنیاد سے ایک دیگچی ملی جس میں سونا بھرا ہوا تھا اس غریب نے اپنی طرف سے تو اسے چھپالیا اور بہانے سے جا کر گھر رکھ آیا لیکن نامعلوم کیسے یہ بات ایک دوسرے مزدور کو پتہ چل گئی۔

وہ رات میں اس کے جھونپڑے میں گھس آیا کہ وہ دیگچی چوری کرسکے، چمار کو اس کے آنے کی خبر ہوگئی اپنا خزانہ بچانے کے لئے وہ اس سے بھڑ گیا آنے والے چور نے اس سے دیگچی چھینی اور چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا اس کے بعد وہ دیگچی لے کر بھاگ گیا مگر اس سارے جھگڑے میں خزانے کا راز کھل گیا وہ بھی خودکسی اور کے ہاتھوں مارا گیا اور پھر یہ سلسلہ رکا نہیں۔

یہ واقعہ میرے سامنے کا تھا اس بات کے بعد میرا دل اس طرح ملنے والی مایا سے متنفر ہوگیا۔ پتر تو شکر کر کہ ہمارا گھر بھی اب اجڑنے سے بچ گیا، تو بس اللہ کے دیئے ہوئے پر شکر کر اور ویسے بھی ہم کون سے محروم بیٹھے ہیں، اوپر رہنے والے مہمان نے ہمارے لئے ہماری سوچ سے بڑھ کر دیا ہے۔ تو شادی کی تیاری مکمل رکھ میں حمید کو بھیجتا ہوں تو نے جو منگوانا ہے اس سے منگوالینا۔" یہ کہہ کر وہ دکان کے لئے رخصت ہوگئے۔

آخر وہ شام بھی آگئی۔ جب عابدہ کو مایوں بٹھایا گیا ان کی برادری اور کالونی میں جان پہچان کی سب عورتیں آئی ہوئی تھیں۔ سب انتظام پچھواڑے کے باغیچے میں کیا گیا تھا رمضان شکر بجا لا رہے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کے حصے کی ذمہ داریوں کی پہلی کڑی کو پورا کرنے جا رہے تھے، وہ بار بار اپنے صافے کے پلو سے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھتے کبھی بیٹے کو یاد کرتے اور کبھی پوتی کے لئے سکھ بھری زندگی کی دعا کرتے، سردار بیگم بھی اب بڑھاپے میں ملنے والی خوشیوں سے خود کو سنبھالے ہوئے تھیں ورنہ اکلوتی اولاد کی جدائی نے انہیں بالکل کھوکھلا کردیا تھا اور رہ گئی ثریا تو اسے اسلم سے بے انتہا محبت تھی بلکہ اس کی شادی اس کی خواہش پر اسلم سے ہوئی تھی۔ اس کی چاروں بیٹیاں اپنے باپ کا حسین عکس تھیں بیٹی کی ودائی پر اپنے شوہر کو یاد کرکے دل خون ہو رہا تھا، ہر کوئی اس خوشی کو غم کے ساتھ ساتھ منا رہا تھا۔

مایوں کے تین روز بعد اس کی رخصتی کا دن بھی آ گیا رمضان کے بڑھاپے کو دیکھتے ہوئے بہت سارے عزیز اور پڑوسی ان کے مددگار بن گئے تھے ویسے بھی اب سے ساٹھ ستر برس قبل دلوں میں محبتیں اور رشتوں میں خلوص ہوتا تھا کام کرنے والے اتنے تھے کہ رمضان کے کرنے کو کوئی کام نہیں بچا، کوٹھی کے ساتھ خالی پلاٹ میں دیگیں تیار ہو رہی تھیں جبکہ دوسری جانب شامیانے لگائے جا رہے تھے، عورتوں نے گھر میں رونق لگا رکھی تھی۔ عابدہ کو دوپہر میں تیار کرنا تھا۔

دن گیارہ بجے کے قریب اس کی ممانی اور دادی نے آ کر کہا۔ "اب وہ کام چھوڑ کر نہالے تاکہ ماموں زاد بہنیں اسے تیار کردیں۔"

وہ خاموشی سے اٹھی اور نہانے چلی گئی جب وہ نہا کر آئی تو کوئی لڑکی یا عورت اس کے پلنگ پر بیٹھی نظر آئی، عابدہ نے دوپٹہ درست کرکے اسے سلام کیا، اس نے کھڑے ہو کر مسکرا کر اسے گلے لگایا، عابدہ نے اس عورت کو دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی، وہ عورت موم کی گڑیا جیسی مگر رعب دار اور صاحب جمال تھی، عابدہ نے اس سے پوچھا۔ "آپ کون ہیں، میں آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔"

وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ "میں تمہارے خاص مہمان کی بیوی ہوں۔" اس نے انگلی اوپر اٹھا کر کہا۔ "مور راج تمہاری شادی میں شرکت کے لئے آئی ہوں انہوں نے کہا ہے کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں دلہن بناؤں وہ بھی آئیں گے اس تم یہاں سب کچھ لے آؤ۔"

عابدہ نے کہا۔ "آپ ان کی بیوی ہیں جو اوپر رہتے ہیں وہ جو......"

"ہاں ہاں گھبراؤ نہیں بارات آنے کا وقت ہو رہا ہے۔"

یہ بات ابھی وہ کر رہی تھیں کہ ثریا اپنی بھتیجیوں کے ہمراہ جوڑا اور زیور لے کر کمرے میں داخل ہوئی وہ بھی عابدہ کے ساتھ کھڑی اجنبی عورت کو دیکھ کر خاصی حیران ہوئیں وہ عورت اپنے ظاہر سے کسی ریاست کی ملکہ جیسی حسین اور باوقار تھی، ثریا کو دیکھ کر اس نے مسکرا کر سلام کیا، ثریا نے جواب دے کر عابدہ کی جانب دیکھا تو عابدہ جلدی سے بولی۔ ''امی یہ باجی ہیں، اوپر والے صاحب کی بیوی، یہ میری شادی میں شرکت کے لئے آئی ہیں۔''

ثریا نے اب کی بار انہیں بہت مسرور نظروں سے دیکھا۔ ''آپا میرا نام چندا ہے انہوں نے کہا ہے کہ عابدہ کو میں تیار کروں اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں بناؤں اسے دلہن۔''

ثریا نے اپنی دونوں بھتیجیوں کو باہر بھیجا اور کہا۔ ''بہن آپ کے شوہر ہمارے محسن ہیں، آپ کا جو دل چاہے کیجئے، یہ جوڑا اور زیور میں لے آئی ہوں جو چاہے منگوالیں۔''

''نہیں شکریہ آپا آپ نے عزت دی۔''

ثریا بھی باہر آ گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

ادھر چندا عابدہ کو دلہن بنا رہی تھی ادھر بارات کی آمد ہوئی، رمضان احمد باہر آ کر سمدھی کا استقبال کرنے لگے، انہوں نے دولہا اور اس کے والد کو پھولوں کے ہار پہنائے تو ان کے بعد ایک ہاتھ آگے بڑھا، ہار پہنانے کے لئے، رمضان احمد نے مڑ کر دیکھا تو وہ ان کا محسن اور خوب صورت مہمان سورج تھا، وہ کب آ کر ان کے ساتھ کھڑا ہوا، انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔

رمضان احمد نے دولہا اور سمدھی سے ملنے کے بعد فوراً سورج کا ہاتھ پکڑ لیا کہ ناگہاں یہ پھر سے ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے، سورج نے بھی مسکرا کر ان کا ہاتھ تھپکا پھر باراتیوں کو بٹھانے سے لے کر رسم اور نکاح میں سورج ان کے ساتھ ساتھ رہا۔

جس نے بھی رمضان سے اس نوجوان کے بارے میں استفسار کیا تو رمضان نے اس کا تعارف اپنے عزیز نوجوان دوست کی حیثیت سے کروایا۔ سورج کی وجاہت سے ہر ایک مرعوب ہو رہا تھا پھر نکاح کے بعد کھانا ہوا اور کھانے کے بعد رخصتی کا مرحلہ آیا۔ چندا نے ایک لمحے کے لئے عابدہ کو نہیں چھوڑا اس نے اسے ایسی دلہن بنایا کہ جس نے دیکھا وہ پہچان نہ پایا کہ یہ عابدہ ہے یا کوئی پری۔

عابدہ کی دادی کو ثریا نے چندا کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً چلی آئیں اور اسے گلے لگا کر دیر تک ملتی رہیں اور آنسوؤں سے اس کا شکریہ ادا کرتی رہیں۔

پھر رخصتی کے وقت عابدہ سب سے ملی، آخر میں سورج اور چندا نے اسے گلے لگایا اور دعا دی، عابدہ نے نظر بھر کے دونوں کو دیکھا اور جان لیا کہ واقعی دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ سورج نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ''لڑکی میرا کمرہ اب تمہارا ہے تم اب جب بھی میکے آؤ تو وہیں رہنا، میں میاں جی سے کہہ جاؤں گا، اب تمہارے ساتھ میرے رخصت ہونے کی بھی گھڑی آ گئی ہے۔ ہم آخری بار مل رہے ہیں بس تم میری حقیقت پر پردہ رکھنا۔'' اور پھر عابدہ رخصت ہو گئی۔

جب سارے باراتی چلے گئے تو سورج رمضان احمد کے پاس آیا اور کہا۔ ''میاں جی میں جا رہا ہوں، میرا کمرہ اب عابدہ کا ہے آپ باقی بچیوں کو بھی جلد رخصت کر دیجئے گا گھر کی طرف سے فکر نہ کیجئے گا، میرے چھوڑے ہوئے نادیدہ محافظ آپ کے گھر اور آبرو کا خیال رکھیں گے، میں نے جو کچھ دیا ہے، امید ہے کہ آپ کی آئندہ ضرورتوں کے لئے کافی ہوگا۔'' پھر رمضان سے مصافحہ کیا اور چندا سب خواتین سے باری باری ملی اور وہ گھر سے رخصت ہو گئے۔

ثریا، سردار بیگم اور رمضان احمد ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئے۔ انہیں لگا کہ ان کا اسلم ایک بار پھر انہیں چھوڑ گیا۔

جب شادی کے بعد عابدہ میکے رہنے آئی تو حسب وعدہ اوپر کے کمرے میں ٹھہری۔ اس کی یعنی سورج کی خوشبو جو کہ اس کے رہتے ہوئے کمرے میں ہوتی تھی، وہی خوشبو اب بھی بسی ہوئی تھی اور سب سے حیران کن امر یہ تھا کہ ساتھ والے کمرے میں رکھے تینوں صندوق بھی غائب تھے۔

☠

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

میری ذات کے دونوں پہلو، ایک ظاہر ایک پنہاں
میں دل لگانا بھی جانتی ہوں، دل چھڑانا بھی جانتی ہوں
نظر نظر میں ہے خوشی سی، کہیں کہیں پر ہے اداسی
وفا کی بازی لگا کے دیکھو، میں ہارنا بھی جانتی ہوں
(مریم ماہ منیر...... لاہور)

بند ہیں دریچے تیرے پاس آؤں کیسے
تو خفا ہوجائے تو میں مناؤں کیسے
گزری ہے جو دل پہ بھلاؤں کیسے
داغ وہ ملا ہے تجھے دکھاؤں کیسے
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

کون ہمارا درد پڑھے گا ان زخمی دیواروں پر
اپنا اپنا نام لکھا ہے سب رونے والوں نے
دل کا غم سے رشتہ کیا ہے، عشق کا حاصل آنسو کیوں
ہم کو کتنا زہر پلایا ہے ان بے درد سوالوں نے
(محمد وارث آصف...... واں بھچراں)

تھکا ہوا ہے وجود سارا یہ مانتی ہوں
مگر خیالوں سے کوئی جائے تو نیند آئے
(فاریہ تبسم...... ٹھینگ موڑ قصور)

یہ کچھ دن ہیں کہ اس کو یاد ہر اک شام کرنا ہے
پھر اپنے دل کی بستی میں اسے گمنام کرنا ہے
یہ کچھ دن ہیں کہ اس کی یاد جسم و جاں تھکائے گی
پھر اس کے بعد ہم کو دیر تک آرام کرنا ہے
(ساحل دعا بخاری...... بھیر پور)

اسے یقین کہ میں جان نہ دے پاؤں گا
مجھے یہ خوف کہ روئے گا آزما کے مجھے
(آسترـ کراچی)

بڑی باتوں کو خاطر میں نہ لانا اس کی عادت ہے
ذرا سی بات پر طوفان اٹھانا اس کی عادت ہے
محبت میں وہ سنجیدہ ہے کتنا دیکھتے رہنا
محبت ہر کسی سے یوں جتانا اس کی عادت ہے
(شرف الدین جیلانی...... ٹنڈو الہ یار)

وہی رات کی خاموشی وہی تنہائی
یہ ہوا بھی کسی کی یاد لے آئی
ہم تو بیٹھے چاند کو دیکھ رہے تھے
نہ جانے کس کے لئے آنکھ بھر آئی
(مونا جاوید...... کراچی)

اس نے کہا، گہری رات کی تاریکیاں دیکھیں
کہا میں نے، پرانے عشق ہر پل دل میں جلتا ہے
کہا اس نے محبت میں تپش محسوس ہوتی ہے
کہا میں نے کہ یہ بچی ہو تو گلزار ہوتی ہے
(رضیہ...... کراچی)

آج کل کی دوستی کاغذ کے پھول ہوتی ہے
دیکھنے میں خوبصورت اور سونگھنے میں فضول ہوتی ہے
(بلقیس خان...... پشاور)

بات چلی کہاں سے اور کہاں ڈھل گئی
تم سے ملی نظر پھر کہاں سنبھل گئی
ان نظروں کے حصار میں صرف تم سماگئے
نظریں جو جھک گئی تو طبیعت کھل گئی
(عثمان غنی...... پشاور)

خون کیسا لبوں سے پھوٹا ہے
سانس ٹوٹی کہ کانچ ٹوٹا ہے
ساری دنیا اجڑ گئی جیسے
اس طرح تیرا ساتھ چھوٹا ہے
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی...... ٹھینگ موڑ قصور)

وہ جو رہتا تھا اس دل میں کبھی اپنوں کی طرح
ایسا بھولا کہ ملتا ہے اب سپنوں کی طرح
پل پل کرتا تھا جو ساتھ نبھانے کی باتیں
چھوڑ گیا ہم کو پرانی رسموں کی طرح
(انتخاب: شفیق رضا...... میاں چنوں)

چوٹ لگ جائے تو کیا ہوتی ہے دل کی حالت
اک آئینے کو پتھر پہ گرا کر دیکھو
(ریحانہ تبسم...... حیدرآباد)

☆☆

دور آنکھوں سے میری جس نے اجالے رکھے
خواب آنکھوں نے کبھی اس کے سنبھالے رکھے
ساتھ خوشیوں نے، شب و روز نبھایا کس کا
ہم نے پہ سوچ کے دکھ درد سنبھالے رکھے
میری آنکھوں کو بھی کردے گا وہ روشن اک دن
جس نے آکاش کے دامن میں ستارے رکھے
رات ساون کی طرح ٹوٹ کے برسیں آنکھیں
رات بھر ہم نے خطوط اس کے سنبھالے رکھے
دل کے زخموں کو کسی طور بھی بھرنے نہ دیا
ہم نے محفوظ محبت کے حوالے رکھے
(حکیم خان حکیم......کامل پور موسیٰ۔اٹک)

کسی سے سل نہ سکا جو وہ چاک داماں ہوں
کھلا نہ پھول کوئی جس میں وہ بنجر خشک بیاباں ہوں
سزا یہ ہے کہ ہوں دنیا میں ایک عجیب اجنبی کی طرح
لطف یہ ہے کہ میں اس دور میں بھی انساں ہوں
شغف تھا ایسا کہ تزئین بزم امکاں تھا
شکست ایسی کہ خود سے بھی اب گریزاں ہوں
بقدر ظرف کرد کسب فیض دیدہ درد
شمشیر گل کی طرح ہیں اب بھی یہاں پریشاں ہوں
ظلم عقدہ کشائی ہے میرا دست جنوں
مجھے پڑھو کہ میں بھی عزم شکست زنداں ہوں
جو نغمے جاگے تو دنیا ہلا کے رکھ دیں گے
نہ مجھ سے الجھو کہ میں بھی سامان حشر سزا ہوں
یہ حادثات جہاں کیوں ہوں دربدر واجد
خدا وہ دن ہی نہ لائے کہ میں تن آساں ہوں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

جو تمہارے لب پہ ہے وہ بات بھی بے ساختہ
ہاتھ میں جو آگیا، وہ ہاتھ بھی بے ساختہ
اس ہوا نے جانے کیا سرگوشی کی ہے جھوم کر
ناچ اٹھا ہر شجر ہر بات بھی بے ساختہ
یہ قبیلے اور نسل کے بندھنوں سے بے خبر
عشق تو اک ذات ہے اور ذات بھی بے ساختہ
اک ذرا سی بدگمانی بھی جو آئے درمیاں
آنکھوں سے ہو اشکوں کی ہر بات بھی بے ساختہ
تحفوں سے کب کم ہے یہ اہل وفا کے واسطے
دلبروں کے ظلم کی سوغات بھی بے ساختہ
جان لیتی ہیں دلوں کے راز آنکھیں دیکھیے
راحت دل کو مگر ہے بات بھی بے ساختہ
آفتاب عشق سے یوں بکھری ہر سو روشنی!
چیخ اٹھے درد سے ذرات بھی بے ساختہ
قلب خانم سے نکلتی ہے دعا یہ بارہا!
اے خدا ہو ساتھ اس کا، ساتھ بھی بے ساختہ
(فریدہ خانم......لاہور)

منزل پاس ہے اور راہ گزر بھی میرے پاس ہے
اس دشت غبار میں فقط ہمسفر کی تلاش ہے
دل میں میرے اک خواہش سی ہے دبی دبی
میرے دل کو اجڑے باغ کو کلی کھلنے کی تلاش ہے
ہوتا نہیں ہے کسی سے مداوا غم دل کا
ہمیں خوشیوں کی آرزو ہے، خوشبوؤں کی تلاش ہے
کل کا کچھ پتہ نہیں طلوع ہو بھی کہ نہ ہو
میری آنکھوں کو ابھی بھی اک سحر کی تلاش ہے
کچھ بھی تو مشترک نہ تھا ہم دونوں کے بیچ
دل لگی اس کا کھیل، ہمیں اک محبت کی تلاش ہے
دنیا کو تلاش جس کی ہمیں اس تلاش سے کیا
ہمیں اک خدا اور پھر اک ناخدا کی تلاش ہے
(مریم ماہ منیر......لاہور)

ادائے حسن کی تاثیر بھی کیا ہوتی ہے
چھپ کے رہ جاتی ہے دل کی جو صدا ہوتی ہے
شوخی، چشم، حیا پوش، خم ابرو توبہ
کیسی پرکیف حسینوں کی ادا ہوتی ہے

مراد وجود ہے تشنہ طویل عرصہ سے،
تصور میں جو آتے ہیں جاں ان پہ فدا ہوتی ہے،
بڑے صبر و تحمل کا وقت ہے اے دوست،
ہو جام و سبو سامنے پھر کس سے قضا ہوتی ہے،
صورت، حسن پہ کیوں کر نہ فدا ہو امتیاز
ہر ادا ان کی قیامت کا نشاں ہوتی ہے،
(ایس امتیاز احمد.....کراچی)

شام سے جو خاموش بنی سی رہتی ہیں
جاگتی سڑکیں کچھ نہ کچھ تو کہتی ہیں
جن کا دھوکہ لے ڈوبا تسکین مری!
یاد کی دیپک آنکھیں اب کیوں بہتی ہیں
اس کے ایک کھلونے سے جو کھیلا تھا
اب بھی سانسیں نام اسی کا لیتی ہیں
رات مرے ارمان کو کھائے جاتی ہے
جانے، آنکھیں مڑ مڑ کے کیا تکتی ہیں
یادوں کے بستر پہ جب بھی سوتا ہوں
تیز ہوائیں روح پہ دستک دیتی ہیں
کتنی پاگل ہیں قمر کی آنکھیں بھی
دیواروں سے دل کی باتیں کہتی ہیں
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

دیکھتی ہیں میری آنکھیں نظارے کیسے کیسے
آشیاں سے اٹھتے ہیں نظارے کیسے کیسے
جان بوجھ کے بھی نہیں ملتا وہ مجھے
زمانے میں مہرباں ہیں ہمارے کیسے کیسے
نہیں گلہ تجھ سے بے وفائی کا ہمنشیں
تقدیر میں اپنی ہیں انگارے کیسے کیسے
نظروں سے دور جا کے بھی تو خوش رہے
چمکتے ہیں آسماں پہ ستارے کیسے کیسے
بدنصیبی ہے میری تیرے ستم سہتا ہوں
تیری مسکراہٹ کے ہیں نظارے کیسے کیسے
زندگی بھی ہم نے داؤ پہ لگادی ہے جاوید
چمن میں پھول مہکتے ہیں پیارے کیسے کیسے
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

تم سے بچھڑے ہیں تو جانی ہے دنیا کی حقیقت
ہر سانس یہاں آفت، ہر گھڑی ہے مصیبت
کون کہتا ہے کہ بچھڑنے سے آتی ہے یاد میں کمی
ہمارے دل کو تو آج بھی ہے تم سے وہی عقیدت
رقص بسمل ہو، زہریلا امل یا سولی ہو کوئی
اس کی آب و تاب وہی کہ یہ ہے وادی محبت
ایک پل کے دیدار پر، سو جانیں کردوں فدا
یہی ہے دستور وفا، یہی ہے تقاضائے الفت
(اقصیٰ رباب.....فیصل آباد)

اپنی تنہائی کا احساس دلاؤں کیسے
جو مرے دل پہ گزرتی ہے بتاؤں کیسے
کند ذہنوں سے سیاہی کو مٹاؤں کیسے
راہ سیدھی میں زمانے کو دکھاؤں کیسے
سونے لگتا ہوں تو پلکیں یہ چمک جاتی ہیں
اپنی آنکھوں میں تیرے خواب چھپاؤں کیسے
میرا شیوہ ہے فقط سب سے محبت کرنا
دل میں نفرت کی میں دیوار اٹھاؤں کیسے
بھول سکتا ہوں زمانے کی نوازش، لیکن
میرے محبوب، تیرا پیار بھلاؤں کیسے
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ وعدہ نبھانا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پر تھے بیشتر وہ کرم تھا میرے حال پر
مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر اک بات پر روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں چاہ تھی کبھی تم کو بھی ہم سے راہ تھی
کبھی ہم تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا

میں وہی ہوں دلربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
(محمد وارث آصف......واں بھچراں)

موسم نے لی انگڑائی پھر یاد تمہاری آئی
کالے بادل گیا آئے پھر یاد تمہاری آئی
ہم نے دل کو سمجھایا کہ نہ جانا اس پار کبھی
پھر سے موسم بدل گیا پھر یاد تمہاری آئی
خوش آنکھوں کے سارے منظر کرچی کرچی ہوگئے
آنسو آنکھوں سے نکلے پھر یاد تمہاری آئی
بے رنگ زندگی ہے رنگوں سے عاری عاری
رنگوں کو دیکھ کر پھر یاد تمہاری آئی
یہ جینا بھی کیا جینا ہے اس سے بہتر مرجانا ہے
خوش نما چہروں کو دیکھ کر پھر یاد تمہاری آئی
(عثمان غنی......پشاور)

جن لوگوں پہ اکثر عشق کے حملے ہوتے رہتے ہیں
وہ شعر سناتے رہتے ہیں اور کھسکے ہوتے رہتے ہیں
محلے محبوب کے جاکر وہ بچوں کی منتیں کرتے ہیں
دیدار یار کی خاطر وہ تو بھکے ہوتے رہتے ہیں
جدائی کے لمحات میں وہ تو دیدے پھاڑے پھرتے ہیں
اور غم سے نیلے پیلے ہو کر رنگے ہوتے رہتے ہیں
اک محبوب کے چھ چھ عاشق آپس میں مل بیٹھیں تو
تو تو میں میں ہوتی ہے اور ونگے ہوتے رہتے ہیں
اس شوخ کو قابو کرنے کو نہ چھوڑیں ایک بھی عامل یہ
جیبوں خو خالی کرواکر وہ کنگلے ہوتے رہتے ہیں
چھوڑو علی ان قصوں کو اب اپنی بھی کچھ بات کہوں
تم پر بھی پاگل پن کے اکثر حملے ہوتے رہتے ہیں
(محمد علی چغتائی......خیر پور ٹامیوالی)

مجھ سے گلے ہیں اسے مجھ پہ بھروسہ نہیں اسے
یہ سوچ کر ہم نے بھی روکا نہیں اسے
وہ شخص بھی چاند ستاروں سے یہ پوچھے
ہے کون سی وہ رات جب سوچا نہیں اسے

الفاظ تیر بن کر اتر رہے ہیں دل میں
سنتے رہے چپ چاپ ہی ٹوکا نہیں اسے
فاریہ یہ محبت نہیں اصول وفا ہے کہ
ہم جان تو دیں گے مگر دھوکا نہیں اسے
(فاریہ تبسم......ٹھینگ موڑ قصور)

عشق اگر تجھ کو جناب ہوجائے
ہجر کا تو بھی نواب ہوجائے
روز مر مر کے تو جیے اے منیر
لمحہ لمحہ تیرا عذاب ہوجائے
جیے تو چاہے زندگی کی طرح
وہ اور آنکھوں کا خواب ہوجائے
تو اسے ڈھونڈتا رہے ہر دم
ختم تیرا بھی شباب ہوجائے
اسے تو دیکھے ہزار آنکھوں
چہرہ مگر اس کا سراب ہوجائے
آنکھ میں تیرے ہو جو آنسو
عشق میں وہ بھی تیزاب ہوجائے
تو بنائے فرشتہ اس کو مگر
منیر وہ بھی خراب ہوجائے
پھر مقدر تیرا بھی اے میرے ہمدم
جام و ساغر شراب ہوجائے
(منیر احمد ساغر......میاں چنوں)

عجیب لڑکی تھی رہتی تھی بس خیالوں میں
وہ ضرب کرتی تھی تقسیم کے سوالوں کو
کلاس روم میں پنسل تلاش کرتی تھی
وہ بھول جاتی تھی لگا کے اس کو بالوں میں
اس کی آنکھوں سے ظاہر تھی ہر اک بات جیسے
وہ بند رہتی تھی دل کے ہزار تالوں میں
وہ پیار چھوٹوں سے عزت بڑوں کی کرتی تھی
نہ میں بچوں میں آسکا نہ عمر والوں میں
اب بھی اگر حسینوں کے چہرے نہ پڑھے احسان
تو ہم نے کیا سیکھا زندگی کے اتنے سالوں میں

(احسان سحر......زادے خیلانوالہ۔میانوالی)

فصیل جسم پہ تانی ہے کرب کی چادر
ہم اہل درد سے پوچھ کہ زندگی کیا ہے
وہ میرے دل کی ستوں میں حلول کی خاطر
فصیل جسم میں کتنے شگاف کرتا ہے
وہ شہسوار بڑا رحم دل تھا میرے لئے
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اٹھالیا مجھے
ابھی سے میرے رفوگر کے ہاتھ تھکنے لگے
ابھی تو چاک میرے زخم کے سلے بھی نہیں
دکھ کی یکسانیت سے یہ لگتا ہے
ایک رات پلٹ کے آتی ہے
(محمد فواد......ضلع صوابی)

نہ پوچھ مجھ سے میری داستاں
تمہارے آنسو چھلک پڑیں گے
یوں نہ چھینو بچوں سے ان کی خواہش
کہ وہ بچارے بلک پڑیں گے
ایک تم ہو کہ ہماری طرف دیکھنا گوارہ نہیں کرتے
مگر یہ جان لو ہم اگر بازار میں نکلے تو چہرے جھلس پڑیں گے
ہمیں پتہ ہے تو کسی اور سے ملتا ہے
مگر ہر دل سے نکال کر ہم یہ دیکھنے سے جل پڑیں گے
رضا یہ زمانہ ہے کہ ملنے نہیں دیتا ہمیں
کیونکہ اگر ہم ملے تو ان کے آنسو نکل پڑیں گے
(سکندر علی رضا......فیصل آباد)

اندر سے میں ٹوٹ گیا ہوں
اذیت سے میں چھوٹ گیا ہوں
تباہی عشق کی ایسی پھیلی
وقت سے پہلے میں لوٹ گیا ہوں
اب میں تم سے نہیں بولوں گا
جاؤ تم سے میں روٹھ گیا ہوں
دل بدن جگر جل رہا ہے
عشق میں کھا گہری میں چوٹ گیا ہوں
سینے پہ بوجھ ہے سانس پھول گئی ہے
دم گھٹنے سے میں پھوٹ گیا ہوں
تیرے بے رخی سہ سہہ کر جاناں
ارمانوں کا گلا میں گھونٹ گیا ہوں
پیار و محبت میں جنگ جائز ہے ذاکر
پیار میں بول پہلا میں جھوٹ گیا ہوں
(محمد ذاکر......ہلاں آزاد کشمیر)

صحرا کے اس تپتے سفر میں......
زخم چور چور اور دل غمزدہ ہے......!
تپش سورج نے جلا دیا ہے انگ انگ......
نڈھال ہوں، رنجیدہ بھی......!
چلا تھا کوئے یار میں......!
بھٹکا کچھ اس طرح کہ......!
راستوں نے دھوکہ کچھ یوں دیا......!
آنکھوں کی بینائی اور نور قلب چھن چکا......!
فلاح کی تلاش میں رخت سفر باندھا تھا میں نے......!
کچھ اپنوں کا ساتھ تھا، کچھ اپنے بن سے گئے تھے......!
آغاز یورش کی مانند......!
سفر کے ہر لمحے میں، میرا دل مطمئن رہا......!
پھر کچھ یوں بچھڑے کہ ہمیشہ کو چھپ گئے......!
قافلہ لٹتا گیا، دل مچلتا گیا، زخم بڑھتا گیا......!
کچھ زخم اپنوں نے یوں لگائے......
مٹنے سے مٹ نہ پائیں......اک حصہ یوں کٹا کہ......!
آج تک جڑنے میں نہ آیا......!
بھوک اور مفلسی کا دور کچھ یوں آن پڑا......!
میرے قافلے کا ہر فرد بلکتا رہتا......
میں چیختا رہا، گڑگڑاتا رہا......!
عصمتیں لٹیں، چادریں چھنیں......!
خون یوں بکھرا......جیسے پانی ہو......!
غیرت کے نام سر کٹ گئے......!
آسمان روتا رہا، زمین بلکتی رہی......!

(مدثر بخاری......شہر سلطان)

☆☆

دل میں اک درد اٹھا ہو جیسے
پھر کوئی مجھ سے جدا ہو جیسے
دل دھڑکنے پہ یوں محسوس ہوا
خشک پتوں کی صدا ہو جیسے
سانس لینا بھی بہت مشکل ہے
زندگی ایک سزا ہو جیسے
زیست کی راہ پہ ہوں محو سفر
مجھ کو منزل کا پتہ ہو جیسے
رنگ بکھرا ہے خیالوں کا میرے
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے
جس کو جی بھر کے کبھی دیکھا نہیں
مجھ سے ہر بار ملا ہو جیسے
کرچیاں دیکھ رہا ہوں رانا
دل پہ پتھر سا گرا ہو جیسے
(قدیر رانا......راولپنڈی)

نہیں ہے بھروسہ کسی آدمی کا
زمانے میں کوئی نہیں ہے کسی کا
محبت میں دیکھے، دھوکے ہی دھوکے
یہاں پیار سچا نہیں ہے کسی کا
بلالے مجھے اندھیری نگر سے توں مولا
یہاں دیا جاتا نہیں زندگی کا
(منیر احمد ساغر......میاں چنوں)

جس دنیا سے گزر جاتے ہیں
ایسا کرتے ہیں، مرجاتے ہیں
دل جو ٹوٹے تو سر محفل بھی
بال بے وجہ بکھر جاتے ہیں
اب نہ دیکھو میری ہنستی آنکھیں
چڑھتے دریا تو اتر جاتے ہیں
دھوپ کا روپ رچانے والے
شام کو اور نکھر جاتے ہیں
اب نہ مڑ مڑ کے پکارو ان کو
لوگ رستے میں ٹھہر جاتے ہیں
تم کہاں جاؤ گے، سوچو محسن
لوگ تھک ہار کے گھر جاتے ہیں
(انتخاب: ساحل دعا بخاری......بھیرپور)

وعدے پر اعتبار کر کے
بگاڑلی زندگی میں نے
تمہارے آنے کے انتظار میں
گزارلی یونہی زندگی میں نے
عشق کے حسین خیالوں میں
سنوارلی زندگی میں نے
تمہارے آنے کی خوشی میں
بچھادی پھلوادی میں نے
بہت دیر کردی آنے میں
اب تو شادی کرلی میں نے
(سلیم بیگ ہمدانی......کراچی)

کبھی بارش برستی ہے
تو مجھ کو یاد آتا ہے
وہ اکثر مجھ سے کہتا تھا
محبت ایک بارش ہے
کبھی یہ جو برستی ہے
نہیں ہوتی سبھی کے واسطے یکساں
کسی کے واسطے رحمت کسی کے واسطے زحمت
میں اکثر سوچتی ہوں اب......!
وہ مجھ سے ٹھیک کہتا تھا
محبت ایک بارش ہے
کبھی یہ جو برستی ہے
مگر پھر بھی نہیں ہوتی یکساں
کبھی مجھ پہ بھی برسی تھی
مگر میرے لئے یہ نہ بن سکی راحت
یہ راحت کیوں نہیں بنتی
کبھی میں خود سے پوچھوں تو
یہ دل دیتا دہائی ہے
کبھی کچے مکانوں کو بھی بارش راس آئی ہے؟
(ساجدہ راجا......ہنداں سرگودھا)

جلوؤں کی خیرات بھی ہوگی
پھول کھلیں گے بات بھی ہوگی
شام ڈھلے گی رات بھی ہوگی
یادوں کی برسات بھی ہوگی
نینوں سے جب نین ملیں گے!
اشکوں کی بارات بھی ہوگی
جب آؤ گے پاس ہمارے
تم سے دل کی بات بھی ہوگی
جو بازی تم کھیل رہے ہو
اس بازی کو مات بھی ہوگی
میرے افسانے میں یارو
شامل اس کی ذات بھی ہوگی
شب بھر میرے ساتھ رہو گے
راشد ایسی رات بھی ہوگی
(راشد ترین......مظفر گڑھ)

تو نے اچھے دنوں کے تھے سپنے بنے
تو نے اب تک بنائے تھے جو بھی محل
جن پتوں پہ تو نے تھا تکیہ کیا
وہی پتے ہوا آج دینے لگے
تو نے دیکھے تھے جو
خواب اچھے برے
تیرے خوابوں کی تعبیر الٹی ہوئی
میرے امتیاز! تو
تو تو احمق ہوا
تو تو پاگل ہوا
اس زمانے میں ڈھونڈتا ہے وفا
(ایس امتیاز احمد......کراچی)
☆☆

خناس

وجیہہ سحر

پہلی قسط

خوف و ہراس کی وادی میں خراماں خراماں سرگرداں دل گرفتہ دل شکستہ حالات سے پر اپنی نوعیت کی ناقابل یقین و ناقابل فراموش حالات سے دو چار عجیب و غریب دل و دماغ کو مسوستی حیرت سے روشناس کراتی سوچ کے افق پر جھلمل کرتی تحیر انگیزی میں سب سے آگے ویران و اجاڑ وادی کے نشیب وفراز میں چنگھاڑتی و دندناتی ذہن سے محو نہ ہونے والی ایڈونچر شاہکار کہانی

اچھی کہانیوں کے متلاشی قارئین کیلئے حیرت انگیز خوفناک حیرتناک حقیقی کہانی

گریجوایٹ پوسٹ گریجوایٹ کلاسز کے فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹس کے ٹرپ کی بس بھرپور ہلے گلے کے ساتھ موٹروے پر دوڑ رہی تھی۔

چیک پوسٹ پر تھوڑی دیر رُکنے کے بعد بس مری کے روٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔

اسٹوڈنٹس نے بھرپور انداز میں نعرے لگائے ”ہُرّے! مری کا سفر شروع ہو چکا ہے۔“

میڈم اریبہ اور سر حسنان لڑکے لڑکیوں کی ان شرارت بھری حرکتوں پر مسکرائے جارہے تھے۔

”مجھے اس وقت بہت اچھا لگتا ہے جب گاڑی گول چکر کاٹتی ہوئی پہاڑ پر چڑھتی ہے اور ہم زمین کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں۔“

مس اریبہ نے سیٹ سے پشت ٹکاتے ہوئے لمبا سانس کھینچا۔

”اس میں کوئی شک نہیں، چڑھائی پر چڑھنے کا احساس بہت پُر مزہ ہوتا ہے۔ من تمام فکرات سے آزاد ہو کے خوشیوں کی فضا میں جھومنے لگتا ہے۔“ سر حسنان نے بھی اپنی رائے دی۔

پیچھے سے ایک اسٹوڈنٹ نے سر حسنان کی بات سن کر کہا۔ ”تھوڑا سا انتظار کرلیں سر! ہم ہوا میں پرواز کرنے والے ہیں۔“

سر حسنان نے مسکراتے ہوئے مس اریبہ کی طرف دیکھا مس اریبہ بس کی آخری سیٹ پر بیٹھے چار اسٹوڈنٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سر حسنان نے محسوس کیا کہ مس اریبہ یک دم سنجیدہ ہوگئی ہیں۔

”کیا بات ہے، آپ وہاں پیچھے کیا دیکھ رہی ہیں۔“

”جو میں محسوس کررہی ہوں کیا وہ تم محسوس نہیں کررہے۔ میں ان چار اسٹوڈنٹس کی بات کررہی ہوں جو آخری سیٹ پر بیٹھے ہیں۔“

”ہاں دیکھ رہا ہوں کہ دوسرے اسٹوڈنٹس کے شور شرابے میں وہ چاروں مسلسل خاموش ہیں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ امیر زادوں کی یہ بگڑی ہوئی اولاد ایسی ہی ہے۔ یہ چاروں بہت موڈی ہیں۔ ان کی اپنی ہی دنیا ہے۔ تم ان کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہو کیا تم انہیں جانتی نہیں۔“

”انہیں جانتی ہوں اس لیے تو پریشان ہوں، پُر رونق ماحول میں کسی ایک انسان کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ تمہارا واسطہ تو ان کے ساتھ زیادہ

رہتا ہے تم ان کے بارے میں کتنا جانتے ہو۔"

"چھوڑو! اس قدر پرمزہ سفر کو میں بور نہیں کرنا چاہتا۔"

"ابھی چڑھائیوں کا سفر شروع نہیں ہوا، ابھی بات کر لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر تمہیں بہت شوق ہے تو بتاتا ہوں۔ حوریہ، دشاء، خیام اور فرجاد یہ چاروں کلاس کے نالائق ترین اسٹوڈنٹ ہیں۔"

"یہ تو میں اچھی طرح جانتی ہوں مجھے تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ چاروں یونیورسٹی تک کیسے پہنچ گئے۔ ان کی تعلیمی حالت دیکھ کر تو بالکل نہیں لگتا کہ یہ فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹس ہیں۔ میں نے ان چاروں میں کچھ عجیب سی باتیں محسوس کی ہیں۔ اس لیے میں تم سے ان کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"تم بتاؤ کہ تم نے کیا محسوس کیا ہے۔ پھر میں تمہیں مزید کچھ بتاؤں گا۔"

اریبہ نے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالی اور پھر آہستگی سے کہنے لگی۔ "یہ چاروں ہمیشہ ہی اکٹھے رہتے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے کی پل پل کی خبر ہوتی ہے۔ گزشتہ کچھ دنوں سے یہ چاروں کلاسز جوائن نہیں کر رہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ آج حوریہ کلاس میں نہیں ہے اور کل دشاء نہیں ہے۔ یہ چاروں اکٹھے ہی کلاس سے غائب ہوتے ہیں۔

میں نے ایک اسٹوڈنٹ کو ان چاروں کا تعاقب کرنے کو کہا۔

اس اسٹوڈنٹ نے بتایا کہ وہ چاروں بار بار یونیورسٹی کے میوزیم میں جاتے ہیں اور کبھی کبھی یونیورسٹی کے ایسے حصے میں جاتے ہیں جہاں انہیں تنہائی میسر آئے۔"

حسنان کی تمام تر توجہ اریبہ کی طرف مرکوز ہوگئی۔

"میوزیم میں وہ چاروں کیا کر رہے تھے۔ تم نے اس اسٹوڈنٹ سے پوچھا۔"

اریبہ نے تذبذب کی سی کیفیت میں اپنے سر کو جھٹکا۔

"اس اسٹوڈنٹ کا کہنا تھا کہ ان چاروں نے میوزیم سے کچھ چرایا ہے، کچھ چھوٹے چھوٹے سٹفڈ (Stuffd) مگر جب میں نے ان چاروں کی تلاشی لی تو مجھے ان سے کچھ نہیں ملا اور میوزیم کی اشیاء میں کچھ کمی نہیں لگی۔"

حسنان نے اریبہ کی سیٹ پر ہاتھ رکھا۔ "مگر مجھے کچھ ملا تھا۔ میں نے بھی ان کی مشکوک حرکات کا نوٹس لیتے ہوئے حوریہ کو کسی کام سے بھیج کے اس کے بیگ کی تلاشی لی۔ مجھے اس کے بیگ سے بلیک میجک (Black Magic) کی بک ملی۔ میں نے وہ بک اس کے بیگ میں واپس رکھ دی۔ اسی طرح سے میں نے خیام کے بیگ کی تلاشی لی اس کے بیگ سے مجھے ہیروئن بھرے سگریٹ ملے۔ میں نے پرنسپل صاحب کو وہ سگریٹ دکھائے تو انہوں نے اس پر کچھ ایکشن نہ لیا۔ بس خیام کو بلا کر ڈانٹ دیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے یہ چاروں ہی ڈرگز لیتے ہوں۔"

وہ دونوں جوں جوں ان چار اسٹوڈنٹس کی بات کرتے جا رہے تھے وہ تفریح بھرے ماحول سے کٹتے جا رہے تھے۔

ایک اسٹوڈنٹ بندر کی طرح چھلانگ لگا کر ان دونوں کے درمیان آگیا۔

"سر! آپ کیوں اس قدر سنجیدہ بیٹھے ہیں۔ آپ نے جو کہا تھا، کیا وہ بھول گئے ہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ ٹرپ پر جائیں گے تو میں تمہارا استاد نہیں تمہارا دوست بن کر رہوں گا۔"

حسنان نے مسکراتے ہوئے اریبہ کی طرف دیکھا۔ "اور مس اریبہ، یہ بھی تمہاری ٹیچر نہیں ہیں۔"

اریبہ نے گھور کر حسنان کی طرف دیکھا۔ "جی نہیں...... میں نے ان سے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔"

تین اسٹوڈنٹ مزید کھڑے ہوگئے۔ "ہم کچھ

نہیں جانتے آپ دونوں ہمارے ساتھ انتاک شری کھیلیں۔ ایک اسٹوڈنٹ کا گانا جس حرف پہ ختم ہوگا دوسرے کو اسی حرف سے گانا شروع کرنا ہوگا۔"

اریبہ نے منہ بنایا۔"حسنان!....."

"کوئی بات نہیں اریبہ! ان کا ساتھ دیتے ہیں۔" پھر حسنان خیام سے مخاطب ہوا۔"تم چاروں بھی کھیلو۔" خیام کی جگہ جواب وشاء نے دیا۔"ہمارا موڈ نہیں ہے۔"

اریبہ نے سر کو خفیف سا جھکایا۔"یہ لڑکی وشاء مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ناک میں نتھنی اور جینس کے ساتھ شارٹ شرٹ، مہذب گھروں کی لڑکیوں کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے۔"

"باغی لوگ ہر اس روایت سے بغاوت کرتے ہیں جو ان پر زبردستی مسلط کی جائے۔ چاہے وہ ان کے فائدے کے لیے بھی ہو۔ تم انہیں چھوڑو انتاک شری کھیلتے ہیں۔" حسنان نے کہا۔

جب انتاک شری کا کھیل شروع ہوا تو ہنسی اور مذاق میں کب بیس کلومیٹر کا سفر طے ہوگیا، پتہ بھی نہ چلا۔

حسنان نے شیشے سے باہر جھانک کے زور دار نعرہ لگایا۔"بس اب کھیل ختم، پہاڑی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ Lets enjoy it مجھے یہ سب بہت پسند ہے۔"

اریبہ نے مسکراتے ہوئے لمبا سانس کھینچا۔

"دل چاہتا ہے کہ قدرت کے بنائے ان دلفریب مناظر کو آنکھوں میں جذب کرلوں۔"

دیوہیکل پہاڑوں پر لگے چیڑ کے درخت جیسے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔

کچھ فاصلے کے بعد بس ایک ناہموار تنگ سڑک پر گولائی میں چکر کاٹتی ہوئی پہاڑی پر چڑھنے لگی۔

"سانپ کی طرح لہریں بناتی ہوئی سڑک کو پیچھے چھوڑ کر ہم آسمان کو چھو رہے ہیں۔" ایک لڑکے نے ونڈ اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے نعرہ لگایا۔

پہاڑی سلسلوں کا پُرلطف سفر سبھی لڑکے لڑکیوں کے لیے خوشی بھری تفریح کا باعث تھا۔ تقریباً سبھی قدرت کے ان شاہکاروں کی پُراسرار خوبصورتی میں محو تھے۔

پُرمزہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سفر انتہائی پُرخطر بھی تھا۔ کچھ سفر کے بعد اب بس بلندترین چڑھائیوں کی طرف رواں دواں تھی۔

ونڈ اسکرین سے کھائیوں کی طرف دیکھتے تو سر چکرا جاتا۔

پروفیسر حسنان نے اسٹوڈنٹس سے کہا۔"یہاں پر لینڈ سلائیڈنگ کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ راستہ بھی دشوار گزار ہے۔ خاص طور پر ایک بھری ہوئی بس کے لیے، اس لیے تم سب درود شریف کا ورد کرتے رہو۔"

بلندترین چڑھائیوں کے بعد مری سے پہلے آنے والے چھوٹے چھوٹے قصبوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، پہاڑوں پر لوگوں کے بے ترتیب گھروں کی آبادی حیران کن تھی۔ کہیں گھر پہاڑوں کی چوٹیوں پر دکھائی دیتے اور کہیں کھائیوں میں پہاڑوں کے کناروں پر آویزاں دکھائی دیتے۔ جس علاقے سے ان کی بس گزر رہی تھی وہ بلندترین پہاڑی سلسلہ تھا۔

خیام اور فواد نے اپنے اپنے بیگ سنبھالے اور بس کے دروازے کے قریب بس کا راڈ پکڑ کے کھڑے ہو گئے۔

"تم لوگ اپنی سیٹ پر بیٹھ جاؤ یہ سفر اس طرح کھڑے ہو کر کرنے والا نہیں ہے۔" حسنان نے ان دونوں سے کہا۔

خیام نے دھیرے سے پوچھا۔"یہ "پڑوکسل" کا علاقہ ہے؟"

"ہاں۔" حسنان نے سرسری سا جواب دیا۔

خیام کے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے نے مضحکہ آمیز انداز میں کہا۔"کیوں؟ تم نے یہاں سے مچھلیاں لینی ہیں۔"

سارے اسٹوڈنٹس ہنس پڑے۔ وشاء اور حوریہ بھی خیام اور فواد کے ساتھ کھڑی ہوگئیں۔ اس بار انہیں مس اریبہ نے ڈانٹا۔"تم لوگوں کو بات سمجھ میں نہیں

آتی۔ جاؤ جا کے اپنی اپنی سیٹس پر بیٹھو۔''

فواد کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ بکھر گئی جس کے ساتھ ہی اس نے چلتی ہوئی بس کا دروازہ کھول دیا۔ پھر ان چاروں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گہری کھائی میں اس طرح چھلانگ لگا دی جیسے انہوں نے پیراشوٹ باندھ رکھے ہوں اور انہیں گرنے کا خطرہ نہ ہو۔

''روکو..... گاڑی روکو۔'' پروفیسر حسنان نے چلا کر ڈرائیور سے کہا۔

ڈرائیور نے ایمرجنسی بریک لگائی اور بس سڑک کے کنارے پر زوردار جھٹکے سے جارکی۔

''پروفیسر صاحب اس سڑک پر بس روکنا انتہائی خطرناک ہوسکتا ہے۔ ہمارے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔''

''مگر ہمارا اس جگہ اُترنا ضروری ہے۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اور اریبہ کو اور تین لڑکوں کو اِدھر چھوڑ دو۔ باقی طالب علم گاڑی میں ہی بیٹھے رہیں۔ دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوٹل ہے۔ وہاں اسٹوڈنٹس کو چھوڑ کر واپس آنا۔''

جیسا پروفیسر حسنان نے کہا، ڈرائیور نے ویسا ہی کیا۔

پروفیسر حسنان، اریبہ کے ساتھ عارفین، حیدر اور بلال وہیں اُتر گئے۔

اس اچانک پریشانی نے پروفیسر اور اریبہ کے ہوش اُڑا دیئے۔

ٹرپ کے ساتھ جانے کی ساری خوشی ہوا ہوگئی وہ پانچوں سڑک کے ساتھ پہاڑی سلسلے میں بکھر گئے۔

''وہ چاروں انسان تھے یا آسیب، اس کھائی میں کس طرح کھو گئے۔ یہاں تو اس قدر گہرائی اور خوفناک پہاڑ ہیں کہ کوئی زندہ ہی نہیں بچ سکتا۔'' حسنان نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

عارفین، حیدر اور بلال بھی تھک ہار کے واپس آگئے۔

''سر اُن چاروں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ ہمیں تو لگتا ہے، کہ اُن چاروں نے خودکشی کی ہے۔''

عارفین نے اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اپنی رائے دی۔

اریبہ تذبذب کی کیفیت میں بولی۔ ''تم لوگوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ یہاں کیا خودکشی کرنے آئے تھے۔''

حسنان جو فرسٹریشن میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا چڑ کر بولا۔ ''اگر خودکشی کرنی بھی تھی تو ہمارے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہیں پر بھی اپنا شوق پورا کر لیتے۔ اب ہم یونیورسٹی والوں کو اور اُن چاروں کے پیرنٹس کو کیا جواب دیں گے۔''

''حسنان باتیں کر کے وقت برباد نہ کرو۔ ہمیں پولیس اور ریسکیو کی مدد لینی ہوگی۔'' حسنان نے اریبہ کی بات سنتے ہی پولیس اور ریسکیو کے نمبر ملائے اور ان سے مدد مانگی۔

اریبہ نے اُن چاروں اسٹوڈنٹس کے والدین کو فون کر کے ساری صورتِ حال بتائی اور یونیورسٹی کے پرنسپل کو بھی ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

یہ خبر ملتے ہی اُن چاروں کے والدین نے کہرام برپا کر دیا۔

پروفیسر حسنان اریبہ سے جھگڑ پڑا۔ ''ابھی یہ خبر بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ فون کالز کی وجہ سے ہم اپنا کام ٹھیک طرح سے نہیں کر پائیں گے۔''

''یہ خبر سننے کے بعد اُن لوگوں کا ردِعمل کچھ بھی ہو مگر انہیں حالات سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ تم پولیس اور ریسکیو سے رابطہ کرو۔'' اریبہ نڈھال ہو کر بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔

حسنان بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''یہ واقعہ ایسی جگہ پر ہوا ہے کہ جب تک ریسکیو یا پولیس یہاں تک پہنچے گی، بہت دیر ہو چکی ہوگی۔''

''کتنی ہی دیر کیوں نہ لگ جائے، وہ چاروں ملیں یا نہ ملیں لیکن ہمیں ان کی تلاش میں کوئی کمی نہیں چھوڑنی ہوگی۔''

اریبہ کی بات سنتے ہی حسنان نے ریسکیو سے رابطہ کیا۔

اس کے بعد وہ اریبہ سے گویا ہوا۔ ”میں نے فون کر دیا ہے، تھوڑی دیر تک ریسکیو کی ٹیم روانہ ہو جائے گی۔ ہم سب مل کر ان چاروں کو ڈھونڈیں گے۔ ہمیں دوسرے اسٹوڈنٹس کا بھی خیال رکھنا ہوگا، میں ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں لے جائے گا۔“

”میں تمہارے پاس ہی رُکوں گی۔“

”سمجھا کرو دوسرے اسٹوڈنٹس کے پاس بھی کسی کو ہونا چاہیے۔“

حسنان نے ڈرائیور کو فون کیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ڈرائیور وہاں پہنچ گیا۔ حسنان کے کہنے پر وہ کچھ کھانے پینے کی اشیا بھی لے آیا تھا۔

اریبہ اس کے ہمراہ چلی گئی۔

O......❖......O
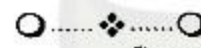
گہری کھائی کے گھمبیر پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کی تاریک غار سے سرگوشیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

سامنے سے اس غار کا منہ چھوٹا تھا مگر اندر سے وہ وسیع اور گہری تھی۔

ٹارچ کی دھیمی دھیمی روشنی میں حوریہ، فواد، خیام اور وشاء پتھر سے پشت لگائے غار کے اندر ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

وشاء کے بازوؤں پر شدید چوٹ آئی تھی۔ خیام اس کے زخم پر مرہم لگا رہا تھا۔

وشاء کے حلق سے سی سی کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس نے خیام کی طرف دیکھا۔ ”مجھے تو تمہارا اور فواد کا پلان بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہم یہاں سے کس طرح نکلیں گے۔ ایک تو راستہ دشوار اور دوسری طرف پروفیسر حسنان...... جس گھر کی تم بات کر رہے ہو، وہاں تک ہم کیسے پہنچیں گے۔“

خیام نے دھیرے سے وشاء کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”یہ تمہارا مسئلہ نہیں، تم صرف اپنا خیال رکھو۔ میں اور فواد سب سنبھال لیں گے۔ ہم دونوں نے سب کچھ پلان کر رکھا ہے۔ بس تم اور حوریہ اس بات کا خیال رکھو کہ پروفیسر حسنان ہم تک نہ پہنچے۔“

فواد اور حوریہ نے اپنے بیک بیگ کے بیلٹس ٹائٹ کیے اور خیام کے قریب آئے۔ ”خیام، جلدی ڈریسنگ کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“ فواد نے کہا۔

خیام نے فواد کی طرف دیکھا۔ ”پروفیسر حسنان اور اس کے ساتھ بہت سے لوگ ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”لیکن ہمارا اس طرح کسی ایک جگہ رُکنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جو ہماری منزل ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اس جگہ پہنچنے کے بعد کوئی ہمیں ڈھونڈ نہیں سکتا۔“

خیام نے اپنا بیک بیگ اُٹھایا اور فواد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔ اس غار میں ہم محفوظ ہیں۔ یہ غار باہر سے اس قدر تنگ ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہاں کوئی چھپ بھی سکتا ہے۔ یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔ پروفیسر حسنان اور اس کے آدمی، زیادہ دیر تک ہمیں نہیں ڈھونڈیں گے۔ یقیناً وہ مغرب سے پہلے چلے جائیں گے اور پھر ہم رات کے اندھیرے میں اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمام راستے کس قدر دشوار گزار ہیں اور اندھیرے میں۔“

حوریہ نے فواد کی بات کاٹ دی۔ ”آئی تھنک خیام ٹھیک کہہ رہا ہے۔ رات کے اندھیرے میں ہمیں کتنی ہی دشواری کیوں نہ ہو، ہمیں دن کی روشنی میں باہر جانے کا رسک نہیں لینا چاہیے۔“

”یہاں ٹھہرنا بھی تو رسک ہے۔“ فواد نے کہا۔

”دیکھا جائے گا۔“ حوریہ نے اپنا بیک بیگ پھینک دیا۔

فواد بھی اپنا بیگ پھینک کر اُن کے پاس بیٹھ گیا۔

اُدھر پروفیسر حسنان ریسکیو کی ٹیم کی مدد سے اُن چاروں کو تلاش کر رہا تھا۔

غار کی گھمبیر تاریکی میں وہ اپنے سارے کام ٹارچ کی معمولی سی روشنی میں کر رہے تھے۔

حوریہ نے اپنے بیگ سے برگرز نکالے اور اپنے دوستوں کو دیئے۔

خیام نے برگر کا ایک لقمہ لیا اور فواد سے گویا ہوا۔

''جس ریسٹ ہاؤس کی تم بات کر رہے ہو۔ تم نے مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا بس یہی بتایا ہے کہ وہ سالوں سے بند پڑا ہے۔ وہاں کوئی نہیں جاتا اور وہ لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا بھی ہے۔''

فواد نے مسکراتے ہوئے کیچپ برگر پر ڈالا۔

''اُس ریسٹ ہاؤس کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ دو سال پہلے میری ایک لڑکے سے دوستی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے اُس ریسٹ ہاؤس کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ ریسٹ ہاؤس اُس کے دادا کا تھا۔ لینڈ سلائیڈنگ ہوئی تو اُس ریسٹ ہاؤس کے ساتھ تین ریسٹ ہاؤس نیست و نابود ہو گئے۔ اس ریسٹ ہاؤس کے اوپر لینڈ سلائیڈنگ سے دو اطراف سے پہاڑ اس طرح سرک گئے ہیں کہ وہ ریسٹ ہاؤس نہ صرف چھپ گیا ہے بلکہ رہائش کے قابل بھی نہیں ہے۔ مگر ہمیں جو عمل کرنا ہے اُس کے لیے وہ جگہ ٹھیک ہے۔ ہماری وہاں موجودگی کے بارے میں کسی کو بھی شک نہیں ہو سکتا۔''

وشاء نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''کسی نے تو کوشش کی ہوگی اُس ریسٹ ہاؤس کی نئی کنسٹرکشن کی۔''

''ہاں..... میرے دوست کے چچا نے کوشش کی تھی۔ مگر ان کی اس ریسٹ ہاؤس سے لاش ملی اس کے بعد کسی نے اس ریسٹ ہاؤس کی کنسٹرکشن ہی نہ کی۔''

''اور وہ تمہارا دوست......؟'' وشاء نے پوچھا۔

''اس کی پچھلے مہینے ڈیتھ ہوگئی ہے۔''

''مگر کیسے......!'' وشاء چونک گئی۔

''میں نے معلوم نہیں کیا، وہ میرا اتنا قریبی دوست نہیں تھا۔ بس اُس کا وقت پورا ہو چکا ہوگا۔''

حوریہ نے سراسیمہ نگاہوں سے فواد کی طرف دیکھا۔

''کہیں اُس ریسٹ ہاؤس میں آسیب کا سایہ تو نہیں۔''

''اگر آسیب کا سایہ نہیں بھی ہے تو وہاں ہم جا رہے ہیں نا آسیب کا سایہ ہو جائے گا۔'' خیام اونچی اونچی آواز میں ہنسنے لگا۔

فواد نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آواز بند کرواپنی، ہم سب کو مروانے کا ارادہ ہے۔''

وشاء نے طنزیہ نگاہ سے فواد کی طرف دیکھا۔

''تم اُلٹ بول رہے ہو۔ ہم تو زندگی سے بھاگ رہے ہیں اور موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔''

فواد چڑ گیا۔ ''ہم تمہیں اپنے ساتھ زبردستی نہیں لائے، تم خود آئی ہو۔ ابھی بھی وقت ہے اگر ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتی تو پروفیسر حسنان کے ساتھ چلی جاؤ۔''

''نہیں مجھے اُس دنیا میں واپس نہیں لوٹنا۔ جس نے مجھے سوائے غموں کے اور کچھ نہیں دیا۔ مجھے اپنے ایک ایک دُکھ کا حساب لینا ہے اس دنیا سے۔'' وشاء سنجیدہ ہوگئی۔

دوسری طرف پروفیسر حسنان نے ریسکیو کی ٹیم کے ساتھ اُن چاروں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ اُن چاروں کے گھر والے بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی اپنے طور پر اُن چاروں کو ڈھونڈتے رہے مگر وہ سب ناکام رہے، بالآخر اندھیرا ہونے پر اُن سب کو واپس لوٹنا پڑا۔

اُن چاروں کے گھر والے بھی پروفیسر حسنان کے ساتھ ہوٹل لوٹ گئے۔

O......❖......O

رات کا اندھیرا ہونے پر فواد، خیام، وشاء اور حوریہ غار سے نکلے اور انتہائی مشکل سے سڑک تک پہنچ گئے اور ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑے۔

بہت مہارت اور ہوشیاری سے وہ ریسٹ ہاؤس

کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

رات کے اندھیرے میں پہاڑوں میں چھپا ہوا ریسٹ ہاؤس بالکل بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

انہیں ریسٹ ہاؤس ڈھونڈنے میں کافی دیر لگی۔

فواد اور خیام اپنی اپنی ٹارچ سے ریسٹ ہاؤس کے اندر داخل ہونے کا راستہ ڈھونڈنے لگے۔

وشاء اور حوریہ بہت تھک گئی تھیں۔ وہ دونوں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئیں۔

خیام نے فواد کو آواز دی۔ ''اِدھر آؤ فواد دروازہ مل گیا ہے۔''

فواد، خیام کے پاس گیا۔ اس نے دروازے کو چھوا۔ ''اس پر تو قفل لگا ہوا ہے۔''

ان دونوں نے دروازے کا قفل توڑا۔

حوریہ اور وشاء بھی سامان اُٹھائے ان دونوں کی طرف بڑھیں۔

جونہی خیام نے دروازہ کھولا۔ دھول سے اسے کھانسی آنے لگی۔

حوریہ نے آگے بڑھ کر مکڑی کے بڑے بڑے جالے صاف کیے اور وہ چاروں اندر داخل ہوگئے۔ اندر داخل ہوتے ہی فواد نے دروازہ بند کردیا اور وہ چاروں خود کو قدرے محفوظ سمجھنے لگے۔

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے۔ دھول اور بڑے بڑے جالوں سے انہیں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔

یہ چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس تین کمروں ایک کچن اور ایک باتھ روم پر مشتمل تھا۔

یہ ساری عمارت انتہائی خستہ حال تھی۔ دیواروں پر دراڑیں، چھتیں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی، فرش دھول مٹی اور پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔

وشاء اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے اُکتاہٹ میں بولی۔ ''یہ ریسٹ ہاؤس نہیں کھنڈر ہے۔''

خیام فرش سے نوکدار پتھر اُٹھا کے راستہ صاف کرنے لگا۔ ''جیسا بھی ہے ایک کمرہ تو مل کر صاف کرنا ہوگا، تاکہ ہم رات گزار سکیں۔''

حوریہ نے کمرے کے چاروں اطراف میں ٹارچ گھمائی۔ ''تھوڑا بہت صاف کرلیتے ہیں باقی دن کی روشنی میں صاف کریں گے۔ یہاں پر کون سا بجلی ہے۔ اندھیرے میں اس طرح چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ چاروں جس کمرے میں کھڑے تھے، وہ ہال نما بڑا کمرہ تھا۔

کمرے کے فرنیچر کو کپڑوں سے ڈھانپا ہوا تھا۔

سفید کپڑوں کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ دیمک نے اس فرنیچر کا کیا حال کیا ہوگا۔

دیوار پر انتہائی پرانی طرز کی وال کلاک لگی تھی۔

دیوار کے ساتھ آتش دان تھا۔ جس پر سفید جالی کے پردوں کی طرح جالے لٹک رہے تھے۔ وہ چاروں سردی سے تھرتھر کانپ رہے تھے۔

حوریہ اپنے کندھے سکیڑے آتش دان کے قریب آئی۔ ''کاش یہاں آگ جل جائے، ہم سارے اِدھر ہی رات گزار لیں گے۔''

وشاء بھی حوریہ کے قریب آگئی۔ ''اگر ایسا ہو جائے تو کیا ہی بات ہے لیکن ہمیں لکڑیاں کہاں سے ملیں گی۔'' فواد نے ایک کرسی پر سے کپڑا اتارا۔

''یہ گلا سڑا فرنیچر کس کام آئے گا۔'' یہ کہہ کر فواد نے کرسی کو جس کو دیمک نے جگہ جگہ سے کھوکھلا کردیا تھا، دو تین ضربیں لگائیں، کرسی دو تین حصوں میں ٹوٹ گئی۔

آتش دان صاف کرنے کے بعد خیام اور وشاء وہاں لکڑیاں رکھ کر آگ جلانے لگے اور فواد اور حوریہ کمرے کی تھوڑی بہت صفائی کرنے لگے۔

خیام نے لکڑیاں ترتیب سے رکھ کے اپنے لائٹر سے ان میں آگ لگادی۔

آگ جل گئی تو وہ چاروں آتش دان کے قریب بیٹھ گئے۔

حوریہ اپنے کندھے سکیڑے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''فواد! یہ چھت اس قدر خستہ حال ہے، نہ جانے کب ہمارے اوپر آگرے۔''

''گرتی ہے تو گر جائے، ہر جنگ جیتنے کے لیے ضروری ہے کہ تم ہر طرح کا ڈر اپنے اندر سے نکال پھینکو، آسانیوں بھری زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ زندگی میں ایڈونچر ہونا چاہیے۔ چیلنجز ہونے چاہئیں۔''

حوریہ جیسے تپ گئی۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ لڑکی ہونے کے باوجود سینے میں پتھر جیسا دل رکھتی ہوں۔ مگر کسی غیر محفوظ جگہ کو محفوظ کہنا حماقت ہے اور میں احمق نہیں ہوں۔''

''میں تو یونہی کہہ رہا تھا، تمہارا اس مشن میں ہونا ہی تمہاری بہادری کی دلیل ہے۔ اس مشن میں آنے والے ہر فرد کا سینہ پتھر کا ہی ہے، جس پر احساسات چھید نہیں کر سکتے۔ ہمارے والدین خوانخواہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ہمیں مردہ تصور کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔''

خیام نے بھی فواد کی تائید کی۔ ''اب ہمیں وہ ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ ہم ان کی اولاد تھوڑی ہیں ہم تو ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ اب ہم وہی کچھ کریں گے جو ہمارا دل چاہے گا۔''

حوریہ نے فواد کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''ہمیں ان جیسا عام انسان نہیں، ہمیں تو خاص بننا ہے۔'' اس ساری گفتگو میں وشاء خاموش تھی۔

بیٹھے بیٹھے کہیں کھو گئی تھی۔ سوچ کے دریچوں سے اپنے ماضی میں جھانکنے لگی تھی۔

جہاں اس کی ماں اس پر اپنی محبتیں نچھاور کر رہی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔

ڈیڈی انتہائی مصروف رہتے تھے مگر ماں کی محبت جیسے اس کی ہر کمی پوری کر دیتی تھی۔

ڈیڈی کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ وہ زیادہ بیرون ملک ہی رہتے۔ اگر گھر پر ہوتے تو اپنے آفس میں نیٹ پر مصروف رہتے۔

وہ سولہ برس کی ہوئی تو تقدیر نے اس سے جیسے اس کی ساری خوشیاں چھین لیں۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

اس کے ڈیڈی نے تو دو ماہ بھی صبر نہ کیا اور نئی شادی رچا لی۔

سوتیلی ماں کے برتاؤ نے وشاء کی شخصیت میں جو تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس سے اس کی راہیں گم ہو گئیں۔ اپنے ہی گھر میں انجان ہونے کے احساس نے اسے بے گھر کر دیا۔

خیام نے وشاء کے سر پر چھپکی دی۔ ''تم کہاں کھو گئی ہو۔'' وشاء کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کچھ نہیں میں یہ سوچ رہی تھی کہ جب ہم والدین کے گھر میں اپنے مجسم وجود میں اپنا آپ کھو دیتے ہیں تو وہ ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتے مگر جب ہمارا وجود ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے تو ہمیں تلاش کرتے ہیں۔''

خیام نے اپنی جیکٹ اتار کر وشاء کے کندھوں پر ڈال دی۔ ''اب وہ ہمیں جتنا بھی ڈھونڈ لیں، ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔''

باتیں کرتے کرتے کب ان کی آنکھ لگ گئی، انہیں پتہ ہی نہ چلا۔

چھت کی درازوں میں سے اور بند کھڑکیوں کے بند، ہوئے دروازوں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر ان کے چہروں پر پڑی تو وہ نیند سے بیدار ہوئے۔

فواد، حوریہ اور خیام دھیرے دھیرے آنکھیں کھول رہے تھے، مگر وشاء کو پانی کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی، اس نے اپنے قریب پڑی ہوئی پانی کی بوتل اُٹھائی اور اس کا ڈھکن کھول کر بوتل منہ سے لگا لی۔ اس کی نظر اردگرد کے ماحول پر پڑی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرے کا ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔ فرش صاف ستھرا تھا، اس پر گندگی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

گندے کپڑوں سے ڈھانپا ہوا بوسیدہ فرنیچر نئے فرنیچر کی طرح دمک رہا تھا۔

پانی وشاء کے منہ میں ہی رہ گیا اس نے بہ مشکل

پانی حلق میں اُتارا تو خیام کو جھنجوڑتے ہوئے اُٹھانے لگی۔ ''خیام اُٹھو......''

''کیا بات ہے...... سخت نیند آرہی ہے۔ ایک یہ سورج سونے نہیں دے رہا اوپر سے تم......'' وشاء نے ایک بار پھر اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔

''اُٹھو خیام......''

وشاء کی گھبرائی ہوئی آواز سے فواد اور حوریہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

خیام بڑبڑاتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ ''اب بتاؤ کیا مصیبت آگئی ہے۔''

''میری طرف نہیں سامنے دیکھو۔'' وشاء نے اس کا چہرہ سامنے کی طرف موڑ دیا۔

خیام کے ساتھ ساتھ فواد اور حوریہ کی بھی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ ''اوہ مائی گاڈ! یہ سب کیسے ہو گیا۔''

فواد نے پھرتی سے اپنے بیگ سے اپنی پسٹل نکال لی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ یہاں پر کوئی ہے۔''

''ہاں بلاشبہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں کوئی رہتا ہوگا۔''

وہ چاروں یک دم چوکنے ہوگئے۔

حوریہ اور وشاء دھیرے دھیرے چلتے ہوئے فرنیچر کے قریب آئی۔ حوریہ نے صوفے کو چھوا۔ ''ایک رات میں کوئی انسان اتنی صفائی کیسے کرسکتا ہے۔'' وہ بھی تب جب یہاں بجلی بھی نہ تھی۔''

''صفائی کی بات تو ذہن مان سکتا ہے مگر یہ گلا سڑا فرنیچر، یہ کیسے نیا بن گیا۔'' وشاء صوفے کے قریب آئی۔

خیام نے اپنی گن نکالی اور وشاء سے مخاطب ہوا۔ ''تم دونوں یہیں ٹھہرو، ہم ابھی آتے ہیں۔''

وہ دونوں ریسٹ ہاؤس کے سارے کمروں میں گئے۔ باقی کمرے بھی ہال کی طرح صاف ستھرے تھے اور ان کے فرنیچر چمک رہے تھے۔

کھنڈر نما ریسٹ ہاؤس ایک خوبصورت رہائش گاہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔

فواد اونچی اونچی آواز میں چلا رہا تھا۔ ''کون ہے یہاں، سامنے آؤ۔'' مگر ہر طرف سناٹے یہ سرگوشی کررہے تھے کہ یہاں برسوں سے کوئی نہیں آیا۔ ان چاروں کے علاوہ اس ریسٹ ہاؤس میں کوئی نہیں تھا۔

وہ دونوں کچن میں داخل ہوئے تو ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے سیٹ تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر گرم گرم ناشتہ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ تازہ پھل پڑے تھے۔

فواد نے مبہوت نظروں سے خیام کی طرف دیکھا۔ ''یار! ان غیر آباد پہاڑوں پر اور اس کھنڈر میں یہ سب کچھ کیسے۔ اور پورے ریسٹ ہاؤس میں کسی انسان کا نام ونشان تک نہیں ہے۔''

خیام نے اپنا سوکھا ہوا حلق تر کیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ شخص باہر گیا ہو۔''

''باہر جانے کا دروازہ تو اندر سے بند ہے، اس کے علاوہ باہر جانے کا کوئی اور راستہ ہے ہی نہیں۔'' فواد نے اپنی گن بیلٹ میں ڈال لی۔

''جو کچھ بھی ہے کسی نے یہ ناشتہ ہمارے لیے ہی بنایا ہے۔ میز پر پوری چار پلیٹیں پڑی ہیں۔'' خیام نے کہا۔

''مگر ہم یہ چیزیں نہیں کھا سکتے۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' فواد نے بے چینی سے ارد گرد دیکھا تو اس کی نظر کچن کی دیوار پر ٹھہر گئی جہاں کسی نے خون سے لکھا تھا۔

''طلسماتی اور سنسناتی دنیا میں تمہارا خیر مقدم۔''

''وشاء، حوریہ، جلدی آؤ۔'' خیام کے پکارنے پر وشاء اور حوریہ کچن میں داخل ہوئیں۔

دونوں تحریر پڑھ کر دم بخود رہ گئیں۔ ''یہ تحریر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ریسٹ ہاؤس میں کسی ماورائی قوت کا بسیرا ہے۔'' وشاء نے کہا۔

حوریہ نے دیوار کے قریب جاکے دیوار کو چھوا تو خون میں چپچپاہٹ ابھی تک موجود تھی۔ ''یہ تحریر تازہ خون سے لکھی گئی ہے۔ کسی نے واقعی ہمیں خوش آمدید کہا

ہے۔ مگر ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے۔‘‘

یہ کہہ کر حوریہ نے اپنے دونوں بازو مشرق و مغرب کی سمت کی طرف پھیلا لیے۔ آنکھیں بند کرلیں اور بلند آواز میں گویا ہوئی۔

’’ہم تمہارے مہمان ضرور بنیں گے مگر ہمیں ثبوت دو کہ تم کوئی ماورائی قوت ہو یا انسان ہو۔‘‘

’’حوریہ یہ تم کیا کررہی ہو‘‘ فواد، حوریہ کی طرف بڑھنے لگا تو جسم کو جھلسا دینے والی تیز حرارت نے اسے حوریہ سے دور کردیا۔

حوریہ جس حالت میں کھڑی تھی، اسی حالت میں جیسے پتھر کی ہوگئی۔

وشاء اور خیام بھی اسے پکارتے رہے مگر اس نے کسی کی طرف بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ اپنے دوستوں کی طرف پلٹی تو اس کے چہرے کے خدوخال تبدیل ہوچکے تھے۔ چہرے کی جلد سلیٹی مائل ہوکے سلوٹوں میں تبدیل ہوچکی تھی۔ وشاء چیخ کر خیام کے کندھے سے لگ گئی۔

حوریہ مردانہ گرج دار آواز میں بولی۔ ’’طلسماتی اور سنسناتی دنیا میں خوش آمدید۔ تم فانی دنیا کے کمزور لوگوں کو چھوڑ کر ہماری دنیا میں شامل ہونے آئے ہو۔ اپنے دل سے انسانوں کے ڈر کو نکال پھینکو۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک ویمپائر کی طاقت اس کا ارادہ ہوتی ہے۔ جس مشن پر آئے ہو صرف اس پر دھیان دو۔ مجھے اپنا دوست سمجھو۔ تمہاری ہر مشکل تمہارے پکارنے سے پہلے حل کردوں گا۔ میں ولہان ہوں، بار بار ظاہر نہیں ہوسکتا۔ میری پوروں میں بھی آگ ہے اور میری سانسوں میں بھی، کچھ دیر یہاں اور رکا تو یہ ریسٹ ہاؤس جل کر راکھ ہوجائے گا اور ساتھ میں تمہارا دوست بھی۔‘‘

آواز کے ختم ہوتے ہی حوریہ کا جسم بجلی کے سے جھٹکے لینے لگا۔ ایک سفید ہیولہ اس کے جسم سے نکل کر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

حوریہ زمین پر اس طرح گری جیسے کسی نے اسے پٹخ کر زمین پر دے مارا ہو۔

فواد نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ وہ نڈھال تھی، اسے پانی پلایا۔

’’مجھے کیا ہوا تھا.....؟‘‘ حوریہ نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے فواد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’کچھ نہیں..... تمہیں چکر آگیا تھا‘‘ فواد نے حوریہ کو سہارا دیتے ہوئے کھڑا کیا۔

وہ چاروں ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

’’بھوک تو بہت لگی ہے، کیا خیال ہے۔‘‘ خیام نے فواد سے پوچھا۔

فواد نے لاپروائی سے کہا۔ ’’دیکھا جائے گا۔ شروع کرو۔‘‘

حوریہ نے پلیٹوں کے اوپر ہاتھ رکھ لیے۔ ’’یہ کسی کی سازش بھی ہوسکتی ہے۔‘‘

خیام نے تمسخرانہ انداز میں حوریہ کی طرف دیکھا۔ ’’خود ہمیں ناشتے کی پیشکش کرکے اب منع کررہی ہو۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ حوریہ نے حیرت سے خیام کی طرف دیکھا۔

فواد نے مسکراتے ہوئے حوریہ سے کہا۔ ’’تم ناشتہ کرو۔ ہم تمہیں بعد میں ساری بات بتادیں گے۔‘‘

ان چاروں نے ناشتہ کرلیا اور اس کے بعد وہ چاروں اپنے مشن کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

○......❖......○

پروفیسر حسنان اور اریبہ خیام، وشاء، حوریہ اور فواد کے والدین کے ساتھ مسلسل ان چاروں کی تلاش میں مصروف تھے۔

جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا...... ان چاروں کے والدین کے خدشات بڑھتے جارہے تھا..... جس کی وجہ سے پروفیسر حسنان اور اریبہ پر دباؤ بھی بڑھتا جارہا تھا۔

تقریباً پورا دن ہی وہ لوگ تلاش میں مصروف

رہے۔ رات کو تھک ہار کے واپس ہوٹل آئے تو گمشدہ اسٹوڈنٹس کے والدین اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔
پروفیسر حسنان اور اریبہ اپنے اپنے کمروں کے جانے کے بجائے باہر بینچ پر ہی بیٹھ گئے۔
رات کے اندھیرے میں اس پہاڑ کا منظر بہت ہی خوبصورت تھا۔
آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستارے اتنے قریب محسوس ہو رہے تھے کہ یہ گمان ہو رہا تھا جیسے وہ اس آسمان میں ہی کہیں موجود ہیں۔
پہاڑوں کے نشیب وفراز پر جگمگاتے ہوئے گھر بھی اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے قدرت نے کچھ ستارے، ان پہاڑوں پر بھی پھینک دیئے ہوں مگر یہ ساری خوبصورتی حسنان اور اریبہ کے لیے بے معنی ہو گئی تھی۔
اریبہ کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ ''حسنان! یہ سب کیا ہو گیا۔ ہم کتنے شوق سے اسٹوڈنٹس کو تفریح کے لیے لے کر آئے تھے اور اس پریشانی کا شکار ہو گئے۔ مجھے تو بار بار اس غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ ہم نے ان چاروں پر نظر کیوں نہیں رکھی۔ ان کا عجیب برتاؤ دیکھ کر ہمیں انہیں اپنے ساتھ ہی نہیں لانا چاہیے تھا۔ ہمارے سٹاف کی، یونیورسٹی کی کس قدر بدنامی ہوئی ہے۔''
پروفیسر حسنان نے لمبا سانس کھینچا۔ ''یہ سب باتیں تو قابلِ برداشت ہیں مگر میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ان چاروں کو کچھ ہو گیا تو ان کے والدین پر کیا گزرے گی۔ مری کا کوئی ہوٹل ہم نے نہیں چھوڑا۔ مری کے قریبی علاقوں کے ہوٹلوں میں بھی ڈھونڈا۔ دور دراز کے علاقوں میں تو وہ اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتے۔ مگر پھر بھی وہاں پر فون کے ذریعے ہوٹلز کے مالکان سے رابطہ ہے۔ ٹریفک پولیس کو الرٹ کر دیا گیا ہے۔ پورے شہر میں پولیس پھیلی ہوئی ہے۔ وہ چاروں آخر گئے کہاں؟''
اریبہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھی پھر اس نے حسنان کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں ان کے والدین کو ان چاروں کی گزشتہ دنوں کی حرکات سے آگاہ کرنا چاہیے۔'' اس سے بھی ان چاروں کی تلاش میں مدد ملے گی۔ آخر ان چاروں کے ذہن میں چل کیا رہا تھا۔ انہوں نے کھائی میں چھلانگ لگا دی۔ ان چاروں کی غیر اخلاقی حرکات کا نوٹس نہ لینے کے جس قدر ذمے دار ہم ہیں۔ اتنے ہی ذمے داران کے والدین ہیں۔''
صبح ہوتے ہی اریبہ اور حسنان نے ان چاروں کے والدین کو باہر لان میں بلایا۔
وہ سب باہر لان میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
پریشانی سے سب کی حالت بہت خراب تھی۔ ایک رات مزید گزر جانے کے بعد ان کا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا۔
فواد کے والد ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔
حسنان کے بات شروع کرنے سے پہلے ہی وہ بول اُٹھے۔ ''اب یہاں پر ہمیں کیوں بلایا ہے۔ آپ لوگ باتیں کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارا وقت برباد نہ کریں۔ ہم اپنے طور پر اپنے بچوں کو ڈھونڈیں گے۔''
''پلیز انکل آپ تحمل سے ہماری بات سنیں۔''
اریبہ نے انہیں کرسی پر بٹھایا اور پھر حسنان کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے خود بات شروع کی۔
''دیکھئے کسی بھی منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کا تعین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح ان چاروں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ گمشدہ ہونے سے قبل وہ چاروں کس قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ ان دنوں ان کی حرکات کیا تھیں۔ وہ کس قسم کے لوگوں سے مل رہے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ کس راستے پر چل رہے تھے۔ ایسا کیا ہوا تھا کہ انہوں نے اتنا بڑا قدم اُٹھایا۔ اگر ان سب باتوں کا علم ہو جائے تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں گئے ہوں گے۔''
خیام کی والدہ کو اریبہ کی بات معنی خیز لگی، وہ باقی لوگوں سے بھی مخاطب ہوئی۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ مرد حضرات یہیں ٹھہریں اور ہم خواتین اپنے کمروں میں جا کے ان کے کمروں کی تلاشی لیتی ہیں، ان کے

کمپیوٹرز سے بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان کا میل جول کن لوگوں سے تھا۔"

وشاء کے والد نے بھی اس کی بات کی تائید کی اور کہا۔"اس علاقے کا تو ہم نے چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ ویسے بھی ادھر پولیس انہیں تلاش کررہی ہے۔ ہمیں انہیں دوسری جگہوں پر تلاش کرنا چاہیے۔ مس اریبہ کے کہنے کے مطابق ہمیں ان کی چیزوں کی تلاشی بھی لینی ہوگی۔ میں آج ہی گھر کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"

حسنان نے اریبہ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم جو بات کہنا چاہتی تھیں، وہ کہہ دو۔ تمہاری بات یہ سب زیادہ غور سے سنیں گے۔"

اریبہ نے بات شروع کی تو بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ ندامت کے احساس سے اس کی زبان میں جیسے بل آگیا کیونکہ وہ جو کچھ بتانے جارہی تھی۔ اس کا ذمہ دار اس کا سٹاف بھی تھا۔

پھر بھی اس نے ہمت کر کے دوبارہ بات شروع کی۔"یونیورسٹی کے دوسرے اسٹوڈنٹس کی نسبت ان چاروں کا برتاؤ بہت عجیب تھا۔ تعلیمی حالت کا تو آپ لوگوں کو علم ہے۔ وہ کلاس میں سب سے پیچھے تھے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان کا ہر عمل ایک جیسا تھا۔

ایک بات کا مجھے بہت افسوس ہے کہ ان کی کچھ باتیں جو ہمیں آپ لوگوں کے علم میں لانی چاہیے تھیں، ان سے ہم آپ کو آگاہ نہیں کرسکے۔

پروفیسر حسنان نے ایک بار حوریہ کے بیگ کی تلاشی لی تو انہیں اس کے بیگ سے Black Magic کی کتاب ملی۔ اسی طرح سے انہوں نے خیام کے بیگ کی تلاشی لی تو انہیں اس کے بیگ سے ڈرگز ملی۔

حسنان نے پرنسپل صاحب کو ان باتوں سے آگاہ کیا تو انہوں نے حوریہ اور خیام کو اپنے آفس میں بلا کر سمجھا دیا۔ مگر آپ لوگوں کو اس ساری صورت حال سے آگاہ نہیں کیا۔"

حوریہ اور خیام کے والدین کسی قسم کا سخت ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے سر جھکائے خاموش تھے۔ جیسے وہ خود بھی اپنے بچوں کی ان حرکات سے واقف تھے۔

حوریہ کی والدہ نے ٹشو سے اپنے آنسو پونچھے۔ "ان سب باتوں کا جتنا ذمہ دار آپ کا سٹاف ہے اس سے کہیں زیادہ یہ ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ یہ تو اساتذہ کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ وہ یونیورسٹی تک پہنچ گئے۔ مگر رشتوں کے معمولات میں وہ اس قدر باغی کیسے ہوگئے۔ ان کا برتاؤ ایسا جارحانہ ہوگیا کہ انہیں ہر طرف سے دھتکار اور نفرت ملنے لگی۔ ایسا کیا ذہنی انتشار تھا کہ وہ ڈرگز کی طرف مائل ہوگئے۔" حوریہ کی والدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

○......❖......○

ان چاروں کے والدین ایک روز کے لیے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ انہوں نے ان چاروں کے کمروں کی اچھی طرح تلاشی لی۔

ان کے Contact چیک کیے اور جو اشیاء خاص لگیں، انہیں ایک بیگ میں ڈال لیا۔

خواتین اپنے گھروں میں رہ گئیں۔ اور ان چاروں کے والد دوبارہ مری پہنچ گئے۔

انہوں نے پولیس کی مدد سے تلاش کا دائرہ وسیع کردیا اور دور دراز کے علاقوں میں بھی تلاش شروع کردی۔

حسنان اور اریبہ نے باقی اسٹوڈنٹس کو ان کے گھروں تک پہنچا دیا اور خود وہیں ٹھہر گئے۔

دیوہیکل پہاڑوں کی خاموش وادی میں چیڑ کے درختوں میں گونجتی بندروں کی چیخ دار آوازیں سناٹے کو دہلا رہی تھیں۔

چھوٹے چھوٹے جانوروں کی آوازیں ساتھ شامل ہوجاتیں تو یوں محسوس ہوتا گویا دو قبیلوں میں جنگ چھڑ گئی ہے۔

بندروں کا غول اچانک پھوٹنے والے فوارے کی طرح نمودار ہوتا اور وہ ایک درخت سے دوسرے

درخت پر چھلانگوں کے تبادلے میں مصروف نظر آتے۔

مادائیں اپنی پیٹھ پر بچوں کو چڑھائے اس سلسلے میں بہت پھرتیلی نظر آتیں۔ فواد اور خیام صحن میں بیٹھے اپنے ہتھیاروں کی صفائی میں مصروف تھے۔

وشاء بڑی سی شال اوڑھے دھیرے دھیرے ٹہل رہی تھی۔ وہ صحن میں لگے خوبصورت گول پتھروں پر پاؤں رکھتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی کہ جب ہم لوگ یہاں آئے تھے تو یہ عمارت کھنڈر تھی اور یہ فرش نہیں تھا، یہاں بس مٹی ہی مٹی تھی۔ یا تو کسی ماورائی قوت نے جادو سے یہ سب کچھ بدل دیا یا پھر ہم کئی سال پیچھے ماضی میں پہنچ گئے ہیں، جب یہ ریسٹ ہاؤس نیا نیا بنا تھا۔

وہ چلتے چلتے کب کیاری کے پاس پہنچ گئی اسے معلوم ہی نہ ہوا۔

ہرے ہرے تازے پتوں کی ڈالی نے اس کے ہاتھ کو چھوا تو وہ ہڑبڑا کے رہ گئی۔

اس نے سہمی سہمی نظروں سے پودوں سے بھری کیاری کی طرف دیکھا۔

''اس سنگلاخ زمین پر یہ جیتے جاگتے سانس لیتے پودے کہاں سے آگئے۔'' اس نے سرخ گلاب کی پتیوں کو ہاتھوں سے چھوا تو اس کی انگلیاں لہو سے بھر گئیں۔ وہ چیخ کر دوسری طرف پلٹی تو خیام سے ٹکرا گئی۔

''خیام یہ دیکھو میرے ہاتھ.....'' اس نے خیام کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

خیام نے اس کے ہاتھوں کو چھوا۔ ''کیا ہوا تمہارے ہاتھوں کو، یہ تو صاف ہیں۔''

وشاء نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ''میں نے گلاب کے پھول کو چھوا تو میرے ہاتھوں میں لہو لگ گیا۔''

''کون سا گلاب! وہاں کیاری میں تو گلاب کے پودے ہے ہی نہیں۔''

وشاء نے کیاری کی طرف دیکھا تو واقعی وہاں گلاب کا پودا نہیں تھا۔

وشاء نے خیام کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر کمرے میں لے گئی۔

''یہاں بیٹھو! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' وشاء اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''خیام! مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ یہ جگہ بہت عجیب ہے۔ ہم میں سے کوئی یہ کیوں نہیں سوچ رہا کہ جب ہم یہاں آئے تو یہ جگہ کھنڈر تھی۔ پھر ایک دم سب کچھ بدل گیا۔ یہ ریسٹ ہاؤس کسی شیطانی طاقت کی آماجگاہ ہے۔

یقیناً یہ کئی سال پہلے ایسا ہی ہوگا۔ جب اس میں انسانوں کی گہما گہمی ہوتی ہوگی۔ مگر لینڈ سلائیڈنگ میں جن لوگوں کی جان چلی گئی۔ کیا پتہ ان کی روحیں بھی اس ریسٹ ہاؤس میں بھٹکتی ہوں۔'' خیام نے وشاء کے سہمے ہوئے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''ان سب باتوں سے وہ لوگ ڈرتے ہیں۔ جن کی آنکھوں میں زندگی کے خواب ہوتے ہیں۔ مگر ہم جس منزل کے مسافر ہیں، اس کی راہ میں ڈر وخوف کو ہم نے اپنے پیروں کی دھول میں روندتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔''

فواد کمرے میں داخل ہوا۔ ''خیام! آج مغرب کے بعد ہی ہم اپنا عمل شروع کریں گے۔'' فواد نے خیام کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

حوریہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

خیام نے فواد کی طرف دیکھا۔ ''ابھی یہ ٹھیک نہیں۔''

''کیوں؟'' فواد نے پوچھا۔

''ہمیں یہ عمل پہاڑوں کے وسط میں کرنا ہے اور آگ بھی جلانی ہے۔ ہماری تلاش میں پولیس کے آدمی چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ دور دور تک دیکھ لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو یقین ہو جائے کہ ہم اس علاقے میں نہیں ہیں۔''

''مگر ہم تو بہت لیٹ ہو جائیں گے۔ دو دن کے بعد بھی تو وہ لوگ اس علاقے میں ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی وہ عمل ایسا ہے کہ اس کے پورے ہونے کے

بعد کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔‘‘ فواد کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ خیام بول پڑا۔

’’اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ہم پہلی بار میں ہی اس عمل میں کامیاب ہو جائیں گے۔‘‘

فواد نے اُٹھ کر خیام کا گریبان پکڑ لیا۔ ’’تم کمزور ہو تو دفع ہو جاؤ ہمارے گروپ میں سے۔‘‘

حوریہ نے فواد کو خیام سے پیچھے کیا۔ ’’یہ وقت آپس میں جھگڑنے کا نہیں ہے۔ تحمل سے بیٹھ کر کچھ سوچتے ہیں تم دونوں کی بات اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ ہم کوئی اور راستہ نکال لیں گے۔‘‘

فواد، حوریہ کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ خیام بھی غصے سے سر کو جھٹک کر بیٹھ گیا۔

سارے خاموشی سے سر جھکائے کچھ دیر بیٹھے رہے پھر حوریہ، خیام سے گویا ہوئی۔ ’’ہمارے عمل کے لیے یہی شرط ہے نا کہ جس جگہ عمل کیا جائے وہ جگہ پہاڑوں کے وسط میں ہو جہاں سے کھلا آسمان دکھائی دے۔ تو یہ عمل ہم ریسٹ ہاؤس کے صحن میں کر سکتے ہیں۔‘‘

خیام بلا تامل بولا۔ ’’تم نے تو دیکھا ہے کہ لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے صحن کا آدھا حصہ ڈھک گیا ہے۔ تھوڑے سے حصے سے ہی آسمان دکھائی دیتا ہے۔‘‘

حوریہ فوراً بولی۔ ’’دکھائی تو دیتا ہے نا۔ تم لوگ خوامخواہ وہم کر کے کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔‘‘

وشاء نے بھی حوریہ کی تائید کی۔

’’مجھے بھی حوریہ کی بات سے اتفاق ہے، ہمیں وقت ضائع کیے بغیر آج ہی مغرب کے بعد وہ عمل کر لینا چاہیے۔‘‘

فواد خاموشی سے سب کی باتیں سنتا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر صحن میں چلا گیا۔ خیام بھی اس کے پیچھے پیچھے صحن میں چلا گیا۔

خیام کو دیکھتے ہی فواد نے صحن کے اطراف میں بلند ترین پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ’’ان بلند ترین پہاڑوں پر کوئی بھی نہیں چڑھ سکتا...... جو ہمیں کوئی دیکھ سکے...... اس لیے حوریہ کی بات ٹھیک ہے...... ہم صحن میں ہی عمل شروع کریں گے۔‘‘

خیام مسلسل پہاڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ’’وہ لوگ ہمیں تلاش کرنے کے لیے ہیلی کاپٹرز بھی استعمال کر سکتے ہیں۔‘‘

فواد سر جھٹک کر بولا۔ ’’اتنے روز سے ایسا کچھ کیا نہیں، ایک دن میں کیا کر لیں گے۔ بس زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم آج مغرب کے بعد اپنا عمل شروع کریں گے۔‘‘

خیام نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر وہ دونوں اندر کمرے میں چلے گئے۔

خیام، وشاء کے قریب بیٹھ گیا۔ ’’فواد کیا کہہ رہا ہے۔‘‘ وشاء نے خیام سے پوچھا۔

خیام نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ’’ہم نے طے کر لیا ہے، ہم مغرب کے بعد ہی عمل کریں گے۔‘‘

وشاء نے گہری نظر سے خیام کی طرف دیکھا۔

’’تم بات پلان کی کر رہے ہو اور تمہارا لہجہ تمہارے دل کی کیفیت کی چغلی کھا رہا ہے۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ خیام نے سوالیہ نظروں سے وشاء کی طرف دیکھا۔

وشاء نے مسکراتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

’’مجھے بتاؤ کیا سوچ رہے ہو۔‘‘

خیام نے گہری نظر سے وشاء کی طرف دیکھا۔

’’وہی سوچ رہا ہوں جو ایک پل کے لیے تم بھی سوچو گی، آج جو ہم کرنے جا رہے ہیں نہ جانے ہم ایک دوسرے کے دوست رہیں گے بھی یا نہیں۔ نہ جانے اس عمل کا انجام کیا ہوگا......‘‘

’’جو کچھ بھی ہو موت سے بُرا انجام تو نہیں ہو سکتا۔ اور ہم اپنی یہ زندگی نہیں چاہتے۔ مگر یہ ضرور چاہیں گے کہ ہم جو روپ بھی لیں ایک دوسرے سے ضرور ملیں۔‘‘ وشاء نے خیام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

خیام نے وشاء کے ہاتھ پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ ’’چلو پھر ڈھیر ساری باتیں کرتے ہیں۔‘‘

حوریہ اور فواد بھی اُداس بیٹھے تھے۔ ایک عجیب سا اضطراب تھا ان کے اندر، بالکل ایسے ہی جیسے دیے کی لو بجھنے سے پہلے بھڑکتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرنا چاہتے تھے۔

اپنی زندگی کو شکستوں سمیت خدا حافظ کہہ کے خود کو ایک نئی جنگ کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔

ایک دوسرے سے باتیں کرتے کرتے کب مغرب کا وقت ہو گیا انہیں علم ہی نہ ہوا تھا۔ وہ چاروں پھرتی سے اُٹھے اور کتابیں اُٹھائے اس خوفناک عمل کی تیاری کرنے لگے۔ عمل کے طریقہ کار کو دہرانے کے بعد خیام اور فواد نے لکڑیاں اکٹھی کرنا شروع کیں۔

پھر وہ لکڑیاں اکٹھی کر کے صحن کے درمیان میں رکھیں اور انہیں آگ لگا دی۔ ان لمحوں میں انہوں نے اپنے دل سے ہر طرح کے ڈر کو نکال پھینکا اور اپنی پوری توجہ اپنے عمل کی طرف مرکوز کر دی۔

چند ساعتوں کے بعد وہ چاروں آگ کے ارد گرد آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ وشاء کے ہاتھ میں شیشے کی بوتل تھی جس میں ایک خوبصورت تتلی تھی جو Stuffed تھی۔ اس کے نازک پر خوبصورت رنگوں سے بھرے ہوئے تھے۔

ان چاروں نے آنکھیں بند کر لیں، اور ایک خاص عمل ایک ساتھ اونچی آواز میں پڑھنے لگے وہ جوں جوں عمل پڑھتے جا رہے تھے آگ مزید بھڑکتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ان چاروں نے آنکھیں کھولیں۔ تو ان کی آنکھیں دہک کے انگارہ ہو رہی تھیں۔ فواد نے آگ کے قریب Pig کی ہڈیاں اور انسانی کھوپڑی رکھی اور خیام سے گویا ہوا۔

''اب ہم منتر نمبر 5 پڑھیں گے۔''

وشاء اپنے حلق کو چھو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ خیام نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کیا ہوا ہے۔''

''پتہ نہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے مجھے تپتی ریت پر پھینک دیا ہو۔ پورے جسم پر جلن کا احساس ہو رہا ہے۔ حلق بھی سوکھ رہا ہو۔''

اس سے پہلے کہ خیام کچھ کہتا فواد سفاکی سے بولا۔ ''کچھ بھی ہو۔ ہمیں یہ عمل درمیان میں نہیں چھوڑنا۔ تمہیں منتر نمبر 5 ہمارے ساتھ پڑھنا ہو گا، گلا سوکھ رہا ہے تو آہستہ آواز میں پڑھ لو۔''

وشاء نے دھیرے سے کہا۔ ''کوشش کرتی ہوں۔'' ان چاروں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کیں اور منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

رات کے گمبھیر سناٹے میں یہ منتر بھیانک ماورائی مخلوق کے لیے بلاوا تھا۔

اچانک سے تیز ہوا کا جھکڑ آیا اور آگ بجھ گئی۔ آگ بجھنے کا مطلب تھا کہ ان کا منتر ناکام ہو گیا ہے ان کا عمل ادھورا رہ گیا، ہر طرف دھول ہی دھول ہو گئی۔

ان چاروں نے آنکھیں کھولیں۔ دھول میں تیز جھکڑ کے ساتھ باریک باریک کنکریاں ان چاروں پر اس طرح برسنے لگیں کہ ان کے جسموں پر زخم ہو گئے۔

پھر ان کی سماعت سے وہی گرج دار آواز ٹکرائی جس نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ اس آواز کے ساتھ طوفانی صورت حال بھی ختم ہو گئی۔

''تم لوگ میری مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو غلط کر رہے ہو۔ تمہارے مخنی وجود جل کر راکھ ہو جائیں گے اور یہ راکھ مٹی میں مٹی ہو جائے گی۔ اگر ماورائی قوتیں حاصل کرنی ہیں تو جیسا میں کہوں ویسا کرو۔''

فواد فضا میں گونجتی آواز کی سمت کا تعین کرنے لگا۔ ''تم کون ہو، کیوں ہمارے کام میں دخل دے رہے ہو۔ تم ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے۔''

گرج دار آواز فضا میں پھر سے گونجنے لگی۔

''میں ایک آسیب ہوں۔ تم لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں، کالا جادو صرف کتابوں سے نہیں سیکھا جاتا۔ اس کے لیے گھناؤنے جرم کرنے ہوتے ہیں۔ انسانیت کی تذلیل کر کے شیطان کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ اگر ان

چیزوں سے بچ کر اپنے مقاصد میں کامیاب ہونا ہوتو کسی بڑے عامل کی ضرورت ہوگی یا میرے جیسے آسیب کی۔"

وشاء نے فواد کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ اس پر بھروسا کیا جائے پھر وہ بلند آواز میں بولی۔ "ہم تمہاری بات تب مانیں گے جب تم کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہو گے۔"

فضا میں دل دہلا دینے والا قہقہہ گونجا۔ "میرا ہر روپ بھیانک ہوگا ویسے جو عمل تم کرنے جارہے ہو اس میں فولاد کا کلیجہ چاہیے جو مافوق الفطرت مخلوق کا ہر روپ سہہ سکیں۔ چلو اب تو ظاہر ہونا پڑے گا۔"

اس کے خاموش ہوتے ہی فضا میں خوفناک غرغراہٹ کی آواز گونجنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔

وہ آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔ وہ چاروں پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ کسی ماورائی مخلوق نے ان پر حملہ بول دیا ہے۔ جیسے کسی غیبی مخلوق نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہو۔

حوریہ اور وشاء چیختی ہوئی فواد اور خیام کی طرف بڑھنے لگیں تو فواد نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "جہاں کھڑی ہو وہیں رہو، اپنے ڈر پر قابو رکھو کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

وشاء اور حوریہ سہمی سہمی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھیں، کہ وہ آسیب کس روپ میں رونما ہوتا ہے کہ اچانک انہیں اپنے قریبی درخت سے آہٹ محسوس ہوئی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ پیچھے دیکھا تو وہ سرتاپا کانپ کے رہ گئیں، ان کے حلق سے کریہہ چیخ نکلی۔

ایک بدہیبت ضعیف آدمی چوپائیوں کی طرح چلتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔ اس کا جسم بھی چار ٹانگوں والے جانور کی طرح مڑتڑ گیا تھا۔ جسم کی ہڈیاں جگہ جگہ سے بڑھی ہوئی تھیں۔ کندھوں کی دونوں ہڈیاں اونٹ کی کوہانوں کی طرح کھڑی تھیں اور جب وہ اپنے دونوں بازوؤں اور ٹانگوں سے کسی جانور کی مانند چلتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا تو گویا اس کے جسم کی ساری ہڈیاں ہل رہی تھیں۔

فواد کے کہنے کے مطابق دونوں لڑکیوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی رہیں۔

وہ بدہیبت شخص فواد اور خیام کی طرف بڑھنے لگا فواد اور خیام نے اپنے ڈر پر قابو رکھا۔

وہ ان دونوں کے قریب سے گزرتا ہوا، ان کے سامنے آگیا۔ اس کا چہرہ اور اس کا جسم بالکل ایسا ہی تھا جیسے قبر سے مُردہ اُٹھ آیا ہو۔ وہ ان دونوں کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ "کیوں اپنے آپ کو دیکھ کر ڈر گئے۔"

"کیا مطلب؟" خیام نے اپنے خشک لبوں کو تر کیا۔

"اگر تم کمزور انسان ڈیڑھ سو سال تک نہ مرو تو تمہارا ایسا حال ہوگا۔ میں اس وقت ڈھائی سو سال کے ضعیف انسان کے روپ میں تمہارے سامنے ہوں۔"

"ت ...... ت...... تمہارا اپنا روپ کون سا ہے......؟"

"میرا روپ اگر دیکھ لیتے تو اپنا عمل بھول جاتے اس لیے تمہارے سامنے تمہارے ہی روپ میں آیا ہوں۔ ویسے بھی میرا تم لوگوں کے سامنے اصلی روپ میں آنا ضروری نہیں تھا مگر جو شیطانی عمل تم کرنے جارہے ہو اس میں کسی بھی وقت کوئی شیطانی طاقت تمہارے سامنے آسکتی ہے۔ اس لیے ایک بار پھر سوچ لو، اتنی ہمت ہے تمہارے اندر۔"

"ہمت ہو یا نہ ہو ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں اگر تم واقعی ہماری مدد کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے ہم تم پر بھروسا کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر فواد نے خیام کا ہاتھ پکڑا اور حوریہ اور وشاء کے قریب چلا گیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟" حوریہ نے اپنے دونوں ہاتھ سوالیہ انداز میں پھیلا دیئے۔

فواد سرگوشی کے انداز میں گویا ہوا۔ "میرا ذہن

کہتا ہے کہ ہمیں اس پر بھروسا کرلینا چاہیے۔"

"اس پر بھروسا کرنے کا مطلب ہے کہ ہمیں وہی سب کچھ کرنا پڑے گا جو یہ کہے گا۔" خیام نے کہا۔

"تو کر لیتے ہیں جو یہ کہتا ہے..... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اگر ہمیں کچھ ٹھیک نہ لگا تو ہم پیچھے ہٹ جائیں گے۔ تم صرف یہ سوچو کہ ہم جو کچھ کرنے جارہے تھے، وہ بھی تو آسان نہیں تھا اور یہ ایک غیبی مخلوق ہے۔ ماورائی قوتوں کی حامل ہے میرے خیال میں ہمیں اس کی مدد لے لینی چاہیے۔"

فواد کی بات سن کر وشاء نے گھبراہٹ سے اس عجیب الخلقت مخلوق کی طرف دیکھا۔ "جو کچھ یہ کہے گا اگر وہ سب ہم سے نہ ہوسکا۔"

"تو ہم منع کردیں گے کوئی زبردستی نہیں ہے، اس کو ایک موقع دے دیتے ہیں۔" خیام نے وشاء کو سمجھایا۔

پھر وہ چاروں اس بوڑھے آدمی کی طرف بڑھے۔ فواد نے ایک نظر اپنے تینوں دوستوں کی طرف ڈالی پھر وہ اس سے گویا ہوا۔ "ٹھیک ہے ہمیں منظور ہے تم جیسا کہو گے، ہم کریں گے۔"

چند ساعتوں میں وہ بوڑھا آدمی ان چاروں کو بغور دیکھنے لگا، پھر گرج دار آواز میں بولا۔

"جس طرح آگ کے گرد پہلے بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھ جاؤ۔ آگ دوبارہ بھڑک اُٹھے گی۔ اپنے ادھورے عمل کو پھر سے شروع کردو۔ بس اس بات کا دھیان رکھنا کہ جب تک تمہاری آنکھوں میں جلن محسوس نہ ہو تم نے آنکھیں نہیں کھولنی۔ آنکھیں کھولنے کے بعد تمہیں جلتی آگ میں جنات و شیاطین کے بھیانک چہرے دکھائی دیں گے۔ اس وقت بلند آواز میں جو روپ لینا چاہتے ہو، وہ سب کہنا لیکن اس سے پہلے ایک اہم بات ہے....." وہ خاموش ہوگیا۔

خیام نے پوچھا۔ "کون سی اہم بات.....؟"

خوفناک آدمی اپنی گردن کو چاروں طرف گھمانے لگا۔ "یوں کہہ لو کہ ایک اہم سوال ہے..... جو میں تم لوگوں کے آنکھیں کھولنے سے پہلے کروں گا۔ اگر وہ جواب ٹھیک ہوا تم نے سچ بولا تو یہ سارا عمل آگے چلے گا اگر جھوٹ بولا تو یہ عمل وہیں رُک جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ہم اپنا عمل شروع کرتے ہیں۔"

خیام نے کہا اور وہ چاروں آگ کے گرد آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کیں تو آگ خودبخود بھڑک اُٹھی۔

انہیں آگ بھڑکنے کا احساس ہوا تو انہوں نے عمل پڑھنا شروع کردیا۔ وہ جوں جوں عمل پڑھتے جا رہے تھے۔ اردگرد کے ماحول سے غافل ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا دماغ جیسے ان کے کنٹرول سے باہر ہوتا جارہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی ہر سوچ سے بے نیاز ہو جاتے، بھیانک آدمی کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اپنے ذہن کی وسعتوں میں اس ایک جذبے کو ڈھونڈو، جس کا احساس دوسرے تمام جذبوں پر غالب ہو۔"

وہ چاروں اپنی سوچ کے دریچوں سے اپنے دل کے محسوسات میں کھوگئے۔

وشاء کی بند آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رُخسار پر چھلک گئے وہ کانپتے لبوں سے بولی۔

"ساحل میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔" فواد نے کانپتے لبوں سے کہا۔ "جس زندگی میں وینا نہیں مجھے وہ زندگی نہیں چاہیے۔"

خیام اپنے لبوں کو اپنے دل کے محسوسات بتانے سے روک نہیں سکا۔ "اگر میں ایک عام انسان کی طرح جیتا تو اپنی خوشیاں وشاء کی آنکھوں میں ڈھونڈتا۔" حوریہ اپنے آنسوؤں سے بھرے چہرے کے ساتھ چیخ کر بولی۔ "نفرت ہے مجھے محبت کے اس احساس سے، جس کے نام پر لوگ دوسروں کو استعمال کرتے ہیں۔"

یہ جملے ادا کرتے ہی جیسے ان کی میموری گم ہوگئی، کسی کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک کی طرح ان کا برین

واش ہونے لگا۔

وہ عمل مسلسل پڑھ رہے تھے، وہ کیا پڑھ رہے تھے کیوں پڑھ رہے تھے، انہیں کوئی ہوش نہیں تھی۔ مگر جب ان کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

ان کی آنکھوں کے سامنے دل دہلا دینے والا ایک بھیانک منظر تھا۔ بھڑکتی ہوئی آگ میں جنات و شیاطین کے ہولناک چہرے نمودار ہونے لگے جن کے ساتھ ہی فضا میں خوفناک غرغراہٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

آگ میں اُبھرنے والے چہرے جیسے آگ ہی کا حصہ تھے۔ ان کے نقوش بھڑکتی آگ کے ساتھ بڑھتے اور سکڑتے۔ خیام، وشاء، فواد اور حوریہ بخوبی جانتے تھے کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔

وشاء نے شیشے کا جار اپنے ہاتھ پر رکھا جس میں ایک خوبصورت تتلی کا Stuffed تھا۔ وہ بلند آواز میں بولی۔ ''وہ تتلی کے روپ میں ایک خوبصورت بلا۔''

حوریہ بلند آواز میں بولی۔ ''ایک خوبصورت ایسی آواز جو اس قدر دلفریب ہو کہ لوگ اس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے موت کی آغوش میں چلے جائیں۔''

فواد نے سگریٹ کا کش لیا اور اس کا دھواں فضا میں اُڑایا۔ ''اس کا روپ لے کر اس ہوا میں بکھر جاؤں، کسی بھی وقت کوئی بھی روپ لے سکوں۔''

خیام بھی بلند آواز میں بولا۔ ''پُراسرار قوتوں کی حامل بس ایک روشنی کی شعاع جو کسی بھی وقت کہیں بھی نمودار ہو سکے کوئی بھی روپ لے سکے۔''

خیام کی بات ختم ہوتے ہی جیسے بھیانک شیاطین اور جنات آگ سے باہر آگئے۔ ان چاروں کی چیخ و پکار فضا میں گونجتی رہی پھر ایک بھونچال میں ان کی آوازیں بھی کھوگئیں اور ان کے وجود بھی غائب ہوگئے۔

بھونچال ختم ہونے کے بعد نہ وہاں آگ تھی نہ لکڑیاں۔ اس طرح کی کوئی نشانی نہیں تھی جس سے پتہ چلے کہ کیا ہوا تھا مگر چند ساعتوں کے بعد ایک خوبصورت تتلی اُڑتی ہوئی نظر آئی جو کیاری میں لگے پودوں میں چھپ گئی۔

ایک خوبصورت آواز فضا میں گونجنے لگی جس کے ساتھ ہی روشنی کی ایک شعاع اور سیاہ دھواں آسمان کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا جو دیوہیکل پہاڑوں کی طرف بڑھتا ہوا غائب ہوگیا۔ جس کے ساتھ ہی نسوانی آواز بھی ختم ہوگئی۔

اس گمبھیر سناٹے میں دلخراش قہقہہ سنائی دیا بدہیت بوڑھا آدمی قہقہے لگاتا ہوا درخت کے پیچھے سے چوپائیوں کی طرح چلتا ہوا سامنے آگیا۔ وہ بمشکل سیدھا کھڑا ہوا، اس نے اپنے ہاتھوں کو پیچھے باندھا اور وہ بدہیت بوڑھا آدمی وجیہہ نوجوان میں بدل گیا۔

اس نوجوان نے فاتحانہ انداز میں اپنے بازو پھیلا لیے۔ ''طلسماتی دنیا کا ساحر زرغام، شیاطین و جنات پر راج کرنے والا آج اور طاقتور ہوگیا۔ خیام، وشاء، فواد اور حوریہ پُراسرار روپ لے کر تم کیا کرنا چاہتے تھے مجھے اس سے غرض نہیں مگر میں تم سے کیا کراؤں گا یہ میں بخوبی جانتا ہوں۔''

اس نے ایک بار پھر قہقہہ بلند کیا۔ ''تم لوگ مجھے آسیب سمجھ بیٹھے، جبکہ میں انسان کا ہی روپ ہوں۔''

زرغام اندر ریسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔

O……❖……O

پروفیسر حسنان نے اریبہ کو تو واپس بھیج دیا تھا مگر وہ خود اور ان چاروں کے والد نے ایک خاص ٹیم کی مدد سے ان چاروں اسٹوڈنٹس کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

بہت دنوں کی تگ و دو کے بعد وہ سب واپس اپنے شہروں کو لوٹ گئے۔ اس مایوسی کے بعد ان چاروں کے گھر ماتم کدہ بن گئے۔

چھ ماہ گزر گئے مگر خیام، وشاء، فواد اور حوریہ کا کہیں کوئی پتہ نہ چل سکا۔ ان کے والدین نے ملک کا

چپہ چپہ چھان مارا مگر کوئی ایسی نشانی تک نہ ملی جس سے ان کا کوئی سراغ مل سکے یہ سانحہ ان چاروں کے والدین کے لیے ایک روگ بن کے رہ گیا۔

O……❖……O

ٹی وی چینل پر وشاء کی تصویر کے ساتھ Missing کا اشتہار دیکھ کر اس کے والد ظفر کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی سوتیلی ماں نے بیزاری سے سر کو جھٹکا دیا۔ وہ دھیرے دھیرے اس صوفے کے قریب بڑھ رہی تھی، جہاں ظفر بیٹھا تھا، وہ من ہی من میں بڑبڑائی۔ ''یہ لڑکی جب اس گھر میں تھی تو بھی آفت تھی اور اب گمشدہ ہو کے عذاب بن گئی ہے نہ جانے زندہ ہے یا مرگئی ہے۔''

وہ جھوٹے آنسو بہاتی ہوئی ظفر کے قریب بیٹھ گئی۔ ''نہ جانے وشاء کس حال میں ہوگی۔ آخر کیا ضرورت تھی اسے ایسے نکمے دوست بنانے کی۔''

وشاء کی گمشدگی کے بعد سے ہی ظفر ماریہ سے اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا۔ اس نے طنزیہ نظروں سے ماریہ کی طرف دیکھا۔ ''وشاء کے گمشدہ ہونے میں تمہارے رویے کا بہت دخل ہے تم نے اسے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ تم کیسی ماں ہو جو اپنی بیٹی کے ذہن میں پیدا ہونے والی منفی سوچوں کو نہ پڑھ سکیں۔ میں تو کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تھا مگر تم اس قدر بے خبر رہی کہ وشاء نے ڈرگز لینا شروع کر دیا اور تمہیں خبر نہ ہوئی۔ میں نے تم سے اس لیے شادی کی تھی کہ وشاء کو ماں کی ضرورت تھی۔''

ماریہ غصے سے کھڑی ہوگئی۔ ''آپ یہ بھول رہے ہیں کہ جب میں اس گھر میں آئی تو وشاء عمر کے اس حصے میں تھی جب ایک بچی کی شخصیت بن جاتی ہے۔ اس کی خامیوں اور خوبیوں میں اس کی اپنی ماں کا ہاتھ تھا۔''

''مگر تمہارے آنے کے بعد اس کی شخصیت میں جو بدلاؤ میں نے دیکھا تھا وہ غیر معمولی تھا۔''

''تو پھر اس وقت اپنی بیٹی کو کیوں نہیں سنبھالا اب کیوں تاؤ کھا رہے ہو۔''

''تم اس وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔'' ظفر نے ماریہ سے کہا اور پھر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اس نے ٹی وی بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف گیا۔ اس نے الماری سے ایک بیگ نکالا جس میں اس نے وہ ساری خاص خاص چیزیں رکھی تھیں جو اسے وشاء کی الماری سے ملی تھیں اس نے وہ بیگ بیڈ پر رکھا اور پھر سے وہ ساری چیزیں دیکھنے لگا۔ وہ تمام چیزیں کسی کی بربادی کی داستان سنا رہی تھیں۔ وہ اس کی چیزوں کو چھو کر بیٹی کی قربت کو محسوس کرنے لگا۔ ''ماریہ کو میں باتیں سنا آیا ہوں مگر اپنے آپ کو کیسے سزا دوں۔ کیوں نہ میں نے اپنی بیٹی کو وقت دیا…… پردیس میں رہ کر جس کے لیے دولت جمع کرتا رہا…… آج وہی میرے پاس نہیں رہی۔ میں اس کی محرومی کو نہ سمجھ سکا۔ اس کی ترجیحات نہ جان سکا، وہ میرے ساتھ کے لیے ترستی رہی اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو خود وہ مجھ سے دور ہوگئی۔''

O……❖……O

حوریہ کی والدہ رُخسانہ بیٹی کے غم میں سخت بیمار تھی اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک کم ہوگیا تھا۔ وہ ایک گھریلو عورت تھی۔ حوریہ کے والد توقیر کی شوگر مل تھی، زمینیں بھی تھیں۔ جہاں انہوں نے مختلف قسم کی فصلیں اگائی ہوئی تھیں۔ زمینداری کے کام کے لیے ڈیروں پر کسانوں کو رہائش بھی دی ہوئی تھی۔

حوریہ ہی ان کی واحد اولاد تھی۔ وہ لے پالک تھی، رُخسانہ اور توقیر نے اسے بہت پیار دیا۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کیا جو انسان اپنی سگی اولاد کے لیے کرتا ہے مگر اسے کہیں سے علم ہوگیا کہ وہ لے پالک ہے، اس وقت وہ نہم جماعت کی طالبہ تھی اپنی ذات کی تلاش کی کھوج نے اسے بے راہ کر دیا۔ فواد کا تعلق بھی امیر باعزت گھرانے سے تھا۔ فواد کے والد شاہ انڈسٹریز کے مالک وقار احمد جن کے پاس سب کچھ تھا سوائے وقت کے۔

فواد کی والدہ ایمن جو ایک ویمن این جی او کی

جنرل سیکرٹری تھی۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کا بیڑا اُٹھانے والی خاتون جو کبھی اپنے گھر کو گھر نہ بنا سکی، میاں بیوی کے تعلقات سے بے کر اولاد کے جذبات تک سب کچھ پیسہ اور شہرت کے نشے میں پامال ہو رہے تھے۔

فواد کو چار سال کی عمر سے ہی بورڈنگ ہاؤس میں ڈال دیا گیا تھا۔

خیام بھی اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے والد شہر کے مشہور سرجن تھے۔ ڈاکٹر زبیر اور اس کی بیوی ماہین نے خیام کی پرورش میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی مگر جس راستے پر خیام چل پڑا تھا۔ وہ سب اس کے والدین ماننے کو تیار نہیں تھے۔ خیام کی گمشدگی کے بعد ان کا جیسے سب کچھ ہی لٹ گیا تھا۔ عیش و آرام بھی ان کے لیے سزا بن کے رہ گیا تھا کہ نہ جانے ان کا بیٹا کس حال میں ہوگا۔

وہ خیام کے گمراہ ہونے کی وجہ اس کی صحبت کو ہی جان رہے تھے، یا پھر کوئی ایسی وجہ تھی جس سے وہ غافل تھے۔

اس سانحہ کو پورا ایک سال گزر گیا۔ کسی کے جانے کے بعد معمولات کے کام نہیں رُکتے، وقت کے بے لگام اسپ پر سواری کرنا ہی پڑتی ہے۔

وقت غموں اور خوشیوں کے لمحوں کو سینچتا ہوا نہ جانے کب گزر گیا۔ آنکھوں سے بہنے والے اشک نہ جانے کیسے تھم گئے، کسی کے نام سے دھڑکنے والے دل کسی کے بغیر بھی دھڑکتے رہے۔

یہ سارا گھما گھمی اس سناٹے کو ختم نہ کر سکی جو اکلوتی اولاد کے جانے کے بعد گھروں میں ٹھہر گیا اُمیدیں مایوسی میں بدل گئیں، کوششیں دم توڑ گئیں۔

چار گھروں کا عمر بھر کا خزانہ لٹ گیا۔

○......❖......○

رات کے سناٹے میں جب سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ جب رات کی دیوی کی سیاہ زلفوں پر جگمگاتی روشنیاں ٹمٹمانے لگی تھیں، تب شہر کا ایک حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جہاں زندگی کا سورج طلوع نہیں ہوتا۔ جہاں موت کا راج ہے۔ جہاں مُردہ جسم تو ابدی نیند سو رہے ہیں مگر ان کی ارواح اسی قبرستان میں بھٹک رہی ہیں۔

کوئی اہل دل سنے تو روح فرسا سناٹے میں کسی کے سسکنے کی یا غموں میں ڈوبے قہقہوں کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ جیسے کوئی اس مان پر ہنس رہا ہو جو اسے اپنی زندگی پر تھا۔

رات بارہ بجے کے بعد اس سناٹے میں مہین سی آوازیں کئی راز افشاں کرتی ہیں۔ کئی قبروں کے کتبے نہیں ہیں اور کئی قبریں نیست و نابود ہو چکی ہیں اسی اندوہناک وادی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

قدموں کی آہٹ واضح ہوتی جا رہی ہے مگر کوئی وجود نمایاں نہیں ہوتا۔ پھر انتہائی پُرانی خستہ حال قبروں کی طرف کوئی بڑھتا ہے۔ رات کی سیاہی میں اس کا سراپا وجود بہت مدھم تھا۔

اس نے دیا جلایا تو اس سیاہ پوش کا معمولی سا خاکہ دکھائی دیا۔ اس نے جلا ہوا چراغ اس پرانی قبر کے قریب رکھ دیا۔ اسی طرح اس نے ایک چراغ دوسری قبر کے قریب رکھ دیا، دو زانو بیٹھ گیا اور کسی منتر کا جاپ کرنے لگا، وہ تقریباً آدھا گھنٹہ اسی کیفیت میں رہا پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بیس منٹ کے بعد وہ دونوں قبریں ایک دھماکے کے ساتھ پھٹیں۔ جن قبروں میں ڈھانچے بھی گل سڑ چکے تھے، ان میں سے جیتے جاگتے انسانوں کے سے وجود نمایاں ہوئے اور پھر ان کے مخفی وجود ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

○......❖......○

حوریہ کے والد توقیر کے دوست کی جوان بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ حوریہ کی والدہ رُخسانہ تعزیت کے لیے ان کے گھر گئیں۔

میت صحن کے وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ لڑکی کی ماں اور بہنیں رو رو کے بے حال ہو رہی تھیں۔ رُخسانہ

نے انہیں دلاسہ دینے کی بہت کوشش کی مگر وہ غم سے نڈھال تھیں۔

رُخسانہ میت کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے مری ہوئی لڑکی کا چہرہ دیکھا تو ایک تکلیف دہ احساس نے اس کا سینہ چیر کے رکھ دیا۔ اسے حوریہ کا خیال آیا کہ نہ جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے ممتا کے پیار سے بھری آنکھوں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ اس کی نظریں اس لڑکی کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ رُخسانہ کو محسوس ہوا کہ لڑکی کے سر نے حرکت کی ہے۔ اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ اس نے خوفزدہ ہو کے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔

مُردہ لڑکی نے اپنے اکڑے ہوئے چہرے اور ساکت آنکھوں کے ساتھ رُخسانہ کی طرف دیکھا۔ اس کی سرد آنکھیں رُخسانہ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے خشک سلیٹی مائل لبوں میں جنبش ہوئی۔ وہ حوریہ کی آواز میں بولی۔ ''مما! کہاں ڈھونڈو گی مجھے، زندوں میں یا مُردوں میں، آسمان میں یا زمین میں......'' جس کے ساتھ ہی جھٹکے سے اس نے اپنا سر سیدھا کرلیا۔

رُخسانہ کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی، وہ چیخنے لگی۔ ''حوریہ! کہاں ہو تم، اس نے مجھ سے حوریہ کی آواز میں بات کی ہے۔'' وہ لاش کے قریب ہونے لگی تو دو عورتوں نے اسے پکڑ لیا۔

''بیٹی کی جدائی نے اس کے دماغ پر اثر ڈال دیا ہے۔ ہم سب یہاں بیٹھے ہیں اور یہ کہہ رہی ہے کہ میت نے اس سے بات کی ہے۔''

رُخسانہ رو رو کے بتانے لگی۔ ''میرا یقین کریں، اس نے مجھ سے حوریہ کی آواز میں بات کی ہے۔'' لڑکی کی ماں نے رُخسانہ کی حالت دیکھی تو توقیر کو بلالیا۔

توقیر، رُخسانہ کو اُٹھانے لگا تو وہ لاش کے پاس جم کے بیٹھ گئی۔ ''میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔''

توقیر اسے زبردستی وہاں سے گھر لے آیا۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ یہی کہتی رہی کہ میت نے اس سے بات کی تھی، مگر کوئی بھی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

حوریہ کی والدہ رُخسانہ اس واقعے کے بعد بہت خوفزدہ ہوگئی، عجیب عجیب سے واہمے اس کے سینے پر خنجر گھونپنے لگے۔ ''ایک روح ہی مُردہ جسم میں سرایت کر سکتی ہے۔ نہ تو مُردہ بول سکتا ہے اور نہ ہی ایک زندہ انسان مُردے میں سرایت کر سکتا ہے۔ کہیں میری حوریہ......''

اس خیال سے وہ کانپ اُٹھی۔ ''نہیں میری حوریہ کو کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ ضرور واپس آئے گی۔'' اس نے اگلے روز ہی گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا۔ قرآن خوانی میں اس نے وشاء، فواد اور خیام کے گھر والوں کو بھی بلایا۔

وشاء کے گھر سے کوئی نہیں آیا مگر خیام اور فواد کے گھر سے ان دونوں کی والدہ آئی تھیں۔ جو خود غم سے نڈھال تھیں۔

وہ بھی اس مذہبی تقریب میں شامل ہو کے اپنے غموں کا مداوا کرنے لگیں۔ درس دینے والی عورت قرآن پاک کی آیتوں کے ترجمے کی تفسیر کرتے ہوئے عورتوں کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کی ہدایت دے رہی تھی۔ اس کے درس کا موضوع فانی زندگی سے جب ابدی زندگی کی طرف گیا تو وہ موت کے بعد کے تلخ حقائق بیان کرنے لگی۔

فواد کی والدہ ایمن اور خیام کی والدہ ماہین تو زاروقطار رو رہی تھیں۔

خوف میں پس پردہ ایک احساس جسے ان کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا، انہیں رُلا رہا تھا۔ ایسی ہی حالت رُخسانہ کی بھی تھی۔

درس ختم ہوا تو وہ تینوں رُخسانہ، ایمن اور ماہین درس دینے والی عورت کے پاس جا بیٹھیں۔ عورت نے ان تینوں کی طرف بغور دیکھا۔ ''کیا بات ہے آپ تینوں بہت پریشان لگ رہی ہیں۔''

رُخسانہ نے اسے ساری بات بتائی اور اس واقعہ کا بھی ذکر کیا جو اس سے گزشتہ دنوں پیش آیا۔ ان کی

ساری بات سننے کے بعد عورت سوچ میں پڑ گئی۔

''آپ تینوں کی باتیں بہت حیران کن ہیں مگر ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق آپ کے بچے کالے جادو کی طرف راغب تھے۔ پولیس کی انتھک کوششوں کے باوجود ان کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ پولیس کے ذریعے تو ان کی تلاش جاری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے لاپتہ ہونے میں کالے جادو کا ہی چکر ہو۔ عملیات کا توڑ عملیات سے ہی کیا جاتا ہے۔ آپ ان کا حساب نکلوائیں۔ میں آپ کو ایک عامل کا ایڈریس لکھ کر دیتی ہوں۔ وہ بہت قابل ہیں، لیکن آپ کو شہر سے باہر جانا ہوگا۔''

رُخسانہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''ہم ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے بچے مل جائیں۔''

ایمن نے عورت کے ہاتھ سے ایڈریس کی پرچی لی۔ ''ہم تینوں اکٹھی ہی ان کے پاس جائیں گی۔ میں نے تو اپنے خاوند کو کئی بار کہا مگر انہوں نے اس چیز کو توہمات پرستی اور شرک کا نام دیا۔''

عورت مؤدبانہ انداز میں بولی۔ ''بی بی! یہ پیر فقیر تو وسیلے ہیں جو قرآن پاک کی آیتوں کے ذریعے کالے علوم کا توڑ کرتے ہیں۔ آپ جلد ہی اس بزرگ سے رابطہ کریں۔ میں آپ تینوں کے لیے دُعا کروں گی، ان شاء اللہ آپ کے بچے خیریت سے گھر واپس آجائیں گے۔ آپ اُمید کا دامن نہ چھوڑنا، مایوسی بنتے کام بگاڑ دیتی ہے۔ بس درود شریف پڑھنے کے ساتھ اللہ الصمد کی تسبیح کا ورد کرتی رہیں لیکن ایک بات میں آپ سے ضرور کہوں گی۔ اولاد کو اخلاقی تعلیم والدین دیتے ہیں۔ والدین کو اپنے بچوں کی ہر عادت، نظر اور روزمرہ کے معمولات پر نظر رکھنی چاہیے۔ ان کی ترجیحات کا بھی دھیان رکھنا چاہیے۔ جرم وہاں ہوتا ہے جہاں محرومی ہوتی ہے اور بُری سوچ ان کے ذہنوں میں آجاتی ہے جہاں خلا ہوتی ہے اپنے بچوں کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' وہ تینوں سر جھکائے خاموشی سے عورت کی باتیں سنتی رہیں۔

''آپ ہمارے لیے دُعا ضرور کیجیے گا۔'' رُخسانہ نے کہا۔

O......❖......O

ڈاکٹر زبیر ہوسپٹل سے تقریباً گیارہ بجے گھر آئے۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا، زبیر عقبی دروازے سے لاؤنج میں آگیا۔

ماہین ہمیشہ اس کا لاؤنج میں ہی انتظار کرتی تھی۔ لاؤنج میں اندھیرا تھا بس فینسی لائٹ کی ہلکی سی روشنی مدھم سی پھیلی ہوئی تھی۔

''ماہین بھئی کہاں ہو۔'' وہ ماہین کو پکارتا ہوا بیڈ روم تک چلا گیا، ماہین بیڈ روم میں نہیں تھی۔ وہ دوبارہ لاؤنج میں آگیا اس نے لائٹ آن کی تو ماہین اپنی ٹانگیں سکیڑے، صوفے پر براجمان تھی۔ زبیر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

ماہین نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ وہ زبیر سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ زبیر نے اس کا چہرہ دھیرے سے اپنی طرف کیا۔ ''یہ کیا تم رو رہی ہو اور اس طرح اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو۔''

ماہین نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں زبیر کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ''یہی ہم دونوں کی زندگی کی حقیقت ہے ہماری زندگیاں اندھیروں میں ڈوب گئی ہیں۔ ہمارے گھر کا چراغ کہاں ہے......'' ماہین، زبیر کے شانوں سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

زبیر کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ ''میں نے اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا، میں اور کیا کرسکتا ہوں۔ یہ آزمائش ہے خدا کی طرف سے، مگر مجھے یقین ہے کہ میرا بیٹا زندہ ہے، وہ ان شاء اللہ ضرور واپس آئے گا۔''

''آپ نے جو کرنا ہے آپ کریں مگر میں کسی بزرگ سے حساب نکلوانا چاہتی ہوں آپ نے کئی طریقوں سے انہیں ڈھونڈا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم ان طریقوں سے بھی انہیں تلاش کریں۔'' ماہین نے اپنے دل کی بات کہی۔

زبیر نے ماہین کے شانوں پر ہاتھ رکھے۔ ''اگر

تم خیام اور اس کے دوستوں کو روحانی طریقوں سے ڈھونڈنا چاہتی ہو تو تم عبادت کرو جتنی ہو سکے۔ ہمیں خدا کی ذات سے امید کی ڈوری باندھے رکھنی چاہیے۔ یہ پیر فقیر ایسی ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جو ہم برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

ماہین نے زبیر کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ یہ ساری باتیں چھوڑیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں رُخسانہ اور ایمن ہم تینوں بزرگ کے پاس جائیں گی۔"

زبیر نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ "ٹھیک ہے اگر اس طرح تمہاری تسلی ہوتی ہے تو چلی جانا۔"

ایمن اور رُخسانہ نے بھی اپنے اپنے خاوند سے بات کر لی۔ تو قیر ان تینوں کے ساتھ جانے کے لیے رضامند ہو گیا۔ جمعہ کے روز وہ چاروں فجر کی نماز کے فوراً بعد سفر پر روانہ ہو گئے۔

○......❖......○

وشاء کی والدہ گھر پر نہیں تھیں۔ ظفر ایک روز پہلے ہی بیرون ملک سے لوٹا تھا۔ اس نے ملازمہ سے چائے بنانے کو کہا اور بک شیلف سے بک ڈھونڈنے لگا۔ اسے چند شاعری کی بکس نظر آئیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وشاء کا چہرہ آ گیا۔ یہ کتابیں وشاء کی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک کتاب اُٹھائی اور باہر لان میں بیٹھ گیا۔

ملازمہ چائے باہر لان میں ہی لے آئی۔ اس نے چائے میز پر رکھی اور اندر چلی گئی۔

ظفر نے کتاب کھولی اور پڑھنے لگا۔ اس کتاب میں رومینٹک شاعری تھی۔ وہ صفحات پلٹ رہا تھا کہ کتاب سے کچھ نکل کر اس کے قدموں میں گرا، وہ غالباً کسی کی تصویر تھی۔ ظفر نے وہ تصویر اُٹھائی۔ "ساحل! وشاء کی بک میں ساحل کی تصویر......" اس نے تصویر کے پیچھے دیکھا تو وشاء نے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں ساحل کے لیے غزل لکھی ہوئی تھی۔ ظفر نے تذبذب سی کیفیت میں تصویر واپس کتاب میں رکھ دی۔

"اس کا مطلب ہے کہ وشاء میری بہن کے بیٹے ساحل کو پسند کرتی تھی۔ مگر اس نے کبھی مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میری بیوہ بہن غریب ہے تو کیا ہوا۔ میں وشاء کے لیے ساحل کو قبول کر لیتا۔ وہ تو ویسے بھی CSS کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔

مگر اس کے ذہن کے کسی کونے سے کوئی سرگوشی آئی کہ ایسی باتیں تو بیٹیاں ماؤں سے کرتی ہیں۔ ظفر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ عجیب سی گھبراہٹ سے اس کا سر چکرا کے رہ گیا۔

"کاش میں اپنی بیٹی کے قریب ہوتا تو یہ بات ضرور جان لیتا۔"

اس نے چائے ایسے ہی چھوڑ دی اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور گاڑی لے کر پورچ سے نکل پڑا۔

شہر کے پُرانے علاقے کی ٹوٹی پھوٹی بوسیدہ گلیوں میں گاڑی چلاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ان گلیوں میں شاید پانچ سال کے بعد آیا ہے، پیسہ اور جھوٹی شان و شوکت کی دیواران بہن بھائیوں میں حائل رہی۔ وشاء کی گمشدگی کا سن کر وہ تڑپ کے رہ گئی تھی، کتنے ہی چکر بھائی کے گھر کے لگائے۔

مگر اب غم کے کسی شکنجے میں وہ بے اختیار بہن کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اینٹوں پر سیمنٹ کی لپائی سے بنے پُرانے سے گھر کے قریب اس نے گاڑی روکی۔ ٹین کی پتلی چادر سے بنے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے نسوانی آواز اُبھری۔ "کون......"

"میں ہوں......"

ساحل کی بہن ردا نے ماموں کی آواز پہچان لی اور جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔

ظفر نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر پیار دیا۔ وہ دوڑتی ہوئی اندر بھاگی۔ "امی جان! دیکھئے کون آیا ہے؟"

راحت کچن سے باہر نکلتے ہوئے دوپٹے سے

ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آئی۔ ''کون آیا ہے؟''
بھائی کو کمرے میں دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ آگے بڑھ کر بھائی سے ملی۔ ''آج بہن کی یاد کیسے آگئی۔''
ظفر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ردا کی طرف دیکھا۔ ''ادھر آؤ میرے پاس۔''
ردا ماموں کے قریب بیٹھ گئی۔ ''تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔''
''فرسٹ ٹرم کے امتحان میں سیکنڈ آئی ہوں۔'' ردا نے خوشی سے بتایا۔
راحت بھی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''سیکنڈ ٹرم کے بعد بارہویں جماعت میں ہو جائے گی۔''
ظفر نے پیار سے ردا کے سر پر تھپکی دی۔ ''اتنی بڑی ہوگئی ہو، مجھے تو وہی چھوٹی سی ردا لگتی ہو۔''
''وشاء کا کچھ پتہ چلا۔'' راحت کے چہرے پر یکلخت سنجیدگی چھا گئی۔
ظفر نے سر جھکا لیا۔ ''نہ جانے تمہارے بھائی سے ایسی کون سی خطا ہوئی ہے جس کی اسے یہ سزا ملی ہے۔ میری جان سے پیاری بیٹی نہ جانے کہاں کھو گئی۔ میں نے اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔''
''آپ ہمت رکھیں بھائی جان! وشاء کو کچھ نہیں ہوگا وہ بخیر بہت جلد مل جائے گی۔''
ظفر ادھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔ ''ساحل کہاں ہے؟''
''وہ اپنے دوست کی طرف گیا ہے۔''
''کب تک آجائے گا۔''
''اگر آپ کو کوئی کام ہے تو اسے فون کر دیتی ہوں۔''
''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایسا کرنا کہ رات کو اسے میرے گھر بھیج دینا۔'' ظفر نے کہا۔
''میں ساحل کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں۔'' راحت نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔
''کیوں...... ایسی کیا بات ہے۔'' ظفر نے پوچھا۔

راحت نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔
''میرا بیٹا بہت خوش مزاج تھا، اس کی زندگی کے معمولات زندہ دلی سے بھرپور تھے مگر ایک سال ہونے کو ہے، ساحل پہلے جیسا نہیں رہا...... بالکل بدل گیا ہے...... چپ سی لگ گئی ہے اسے...... ایسا حال ہوگیا ہے جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔ میں نے تو دم درود بھی کروائے مگر وہ ایسا ہی ہے، بدمزاج، اُداس اپنے آپ میں گم رہتا ہے۔''
''وہ تو سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا نا۔'' ظفر نے پوچھا۔
راحت نے لمبی آہ بھری۔ ''پتہ نہیں کیسے پڑھتا ہے مجھے نہیں لگتا کہ وہ تعلیم کی طرف دھیان دے پا رہا ہے۔''
''تم رات کو اسے میرے پاس بھیجنا۔ میں اس سے بات کروں گا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اسے کیا پریشانی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھنے لگا۔ ''اب مجھے اجازت دیں۔''
''یہ کیا بھائی جان! آپ نے تو کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔'' ردا نے چولہے پر چائے رکھی ہے آپ چائے تو پی کر جائیں۔''
پھر راحت، ردا سے مخاطب ہوئی۔ ''جا جلدی سے ماموں کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔''
ردا پھرتی سے کچن میں گئی اور چائے کے ساتھ بسکٹ لے آئی۔
''بھابی ٹھیک ہیں۔'' راحت نے پوچھا۔
''ہاں...... وہ ٹھیک ہے لیکن تمہارا بھائی پچھتاوے کے ایسے کرب سے گزر رہا ہے کہ رات بھر نیند نہیں آتی۔'' راحت سر جھکائے خاموشی سے سب سن رہی تھی جیسے اس صورت حال کا اسے پہلے سے اندازہ ہو۔
ظفر کے من کی جوالا مکھی پھٹ گیا۔ ''میں اپنی بیٹی کو وقت نہ دے سکا۔ میں نے اسے ماں لا کر دے دی مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ سوتیلی ماں اسے وہ توجہ نہیں دے سکتی

جس کی وہ مستحق تھی۔ اس کی شخصیت میں ہونے والی توڑ پھوڑ کا میں ذمہ دار ہوں۔ میں نے اپنی بیٹی کی ترجیحات جاننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور میں اس کے دل کے حال سے غافل رہا۔ مثبت سوچوں کی مالک کب منفی انداز میں سوچنے لگی، اس کے من میں کیسا تصادم تھا کہ اس کی سوچ کے دریچوں سے شیطانی وسوسوں نے اس کے من میں گھر کرلیا۔ وہ کس طرح شیطانی علوم کی طرف مائل ہوگئی۔“

راحت نے شفقت سے بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ وشاء کے شیطانی علوم کی طرف مائل ہونے کی بات کررہے ہیں تو کسی عامل سے رابطہ کیوں نہیں کرتے۔“

ظفر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا۔“ یہ کہہ کر ظفر وہاں سے چلا گیا۔

ظفر کے جانے کے ایک گھنٹے بعد ہی ساحل آ گیا۔ ”آج ماموں آئے تھے۔“ روا نے ساحل کو بتایا۔

”آج کیسے راستہ بھول گئے ماموں......“

ساحل نے اپنا لیدر کا بیگ الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

راحت سبزی کی ٹوکری اور پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے تھکی تھکی سی کرسی پر بیٹھی اور ساحل سے گویا ہوئی۔

”بہت پریشان تھے تمہارے ماموں، اب تک وشاء کا کچھ پتہ نہیں چلا۔“

ساحل آنکھیں جھکائے کسی غم کے احساس میں ڈوب گیا۔ ”اب کیا پتہ چلے گا، پورا ایک سال بیت گیا ہے اس حادثہ کو۔“

”رات کو تمہارے ماموں نے تمہیں بلایا ہے۔“

راحت نے کہا۔

”کیوں؟“

”مجھے نہیں بتایا۔ کوئی کام ہوگا۔ اپنا تو کوئی بیٹا ہے نہیں۔ میرا بھائی بہت تنہا ہوگیا ہے۔“

سبزی کاٹتے ہوئے راحت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ”میں چلا جاؤں گا......“ اس نے ماں کے گلے کے گرد بانہیں حائل کرلیں۔ ”آپ کیوں رو رہی ہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

رات آٹھ بجے ظفر کے گھر کی بیل بجی، ماریہ نے کیمرے میں ساحل کی تصویر دیکھی تو بیزاری سے بولی۔ ”یہ اس وقت کیوں آیا ہے۔“

اس نے دروازہ کھولا تو ساحل نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”السلام علیکم ممانی......“

”وعلیکم السلام۔“

”ماموں گھر پر ہی ہیں۔“

”ہاں اندر آجاؤ۔“

ظفر لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ ساحل کو دیکھ کر وہ اس سے ملا۔ ”ٹھیک ہو۔“

”جی خدا کا شکر ہے۔“

”باہر لان میں بیٹھتے ہیں، باہر موسم بہتر ہے۔“ اس نے ترچھی نظر سے ماریہ کی طرف دیکھا۔

”ہماری چائے باہر بھجوا دینا۔“

ماریہ ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے بولی۔ ”بہتر۔“

گارڈن لائٹس کی ملگجی سی روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ وائٹ کلر کے Chairs set پر بھی دھیمی دھیمی روشنی پڑ رہی تھی۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ساحل، ظفر سے گویا ہوا۔ ”وشاء کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہوسکا، میں جانتا ہوں کہ آپ نے اس کی تلاش میں کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر تلاش تو ختم نہیں کی جاسکتی۔ زندگی کا مالک تو خدا ہے وہ اگر کسی کو زندہ رکھنا چاہے تو کیسے ہی حالات ہوں وہ زندہ رکھتا ہے۔ میں وشاء کو جانتا ہوں وہ بہت ضدی ہے۔ اگر کسی بات کی ٹھان لے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ وخیریت سے ہوگی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میری بیٹی مجھے مل جائے تو میں اس کی ہر خواہش پوری کروں گا۔“ ظفر کے لفظوں کی ان ساعتوں میں ساحل کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”وہ کبھی کبھی انسان اپنی خواہشوں کی قبر میں بھی دفن ہوجاتا ہے۔“

ظفر نے گہری نظر سے ساحل کی طرف دیکھا۔

"تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ میں نے ایک نظر میں تمہیں پہچانا بھی نہیں تھا۔"

"آج صبح ایک بہت بڑی حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی۔"

ظفر کی بات پر ساحل نے پوچھا۔ "کیسی حقیقت؟"

ظفر نے گہری نظر سے ساحل کی طرف دیکھا۔

"وہ تمہیں پسند کرتی تھی کیا تم اس بات سے واقف تھے؟"

ماموں کے سامنے ساحل کا رنگ فق پڑ گیا۔ دل جیسے تیزی سے دھڑکنے لگا، زبان پر بل آ گیا۔ مگر اس نے بے خوف وہی کہا جو اس کے دل نے کہا۔

"جی......"

ظفر نے ساحل کی گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول جاؤ میں تمہارا ماموں ہوں، سمجھو کہ میں تمہارا دوست ہوں۔ مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔ میری بیٹی زندگی کے کن مراحل سے دوچار تھی، میں سب جاننا چاہتا ہوں۔"

ساحل کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اس کے چہرے پر دکھ کے تاثرات بہت نمایاں تھے۔

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "ماموں! جتنا وشاء کی گمشدگی پر آپ پریشان ہیں، میری کیفیت اس سے مختلف نہیں ہے۔

جب آپ اور آپ کا گروپ وشاء کی تلاش کرتے کرتے اس پہاڑی علاقے سے مایوس ہو کر واپس آیا تو میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اس پہاڑی علاقے میں گیا۔ میں اپنے طور پر وشاء کو ڈھونڈنا چاہتا تھا میں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا، یہاں تک کہ مقامی لوگوں سے ان کے گھروں میں جا کے پوچھا۔ مگر جب مایوسی ہوئی تو اس غم نے جیسے مجھ سے میرے جینے کی خواہش ہی چھین لی۔ اب جی رہا ہوں مگر غم کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں۔

ماموں! وشاء آپ سے بہت پیار کرتی تھی۔ وہ آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آپ کے پاس وقت نہیں تھا اور ممانی کے اندر ممتا کے جذبات نہیں تھے، آپ ہمارے گھر بہت کم آتے تھے مگر امی اور میں اور ردا تو وشاء کے لیے اس سے ملنے آ جاتے تھے۔ ممانی کو ہمارے آنے پر اعتراض ہوتا تھا مگر ہم ان دنوں جب آپ بیرون ملک ہوتے تھے، وشاء سے ملنے آ جاتے تھے۔ وشاء بھی اکثر ہمارے گھر آ جاتی تھی۔ اس نے بھی ہم لوگوں کو کمتر نہیں سمجھا۔ وشاء اور ردا کی گہری دوستی میں جیسے میں بھی شامل ہو گیا، مجھ سے بھی وہ دل کی باتیں کرنے لگی۔ کتنے ہی عرصے تک میں اس کے دل کی بات نہیں جان سکا، وہ امیری غریبی کے فرق کو بھول کر مجھے چاہنے لگی تھی۔ وہ گھر میں عجیب ماحول سے دوچار تھی۔ ممانی سے اس کی بنتی نہیں تھی۔ ممانی اپنے آوارہ بھتیجے شعون سے وشاء کا رشتہ کرنا چاہتی تھیں۔ اس کا گھر میں آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ ردا نے وشاء کو بار بار سمجھایا کہ آپ کو اس بات سے آگاہ کر دے مگر وہ کہتی کہ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایک روز وشاء نے مجھ سے محبت کا اقرار کر لیا۔ میری کیفیت وشاء سے مختلف نہیں تھی مگر میں نے حقیقت پسندی سے کام لیا اور اپنے جذبے کو وشاء کی بہتری کے لیے چھپا لیا۔ میں جانتا تھا کہ میں وشاء کو وہ سب آسائشیں نہیں دے سکتا۔ جس کی وہ عادی ہے پھر یہ بھی جانتا تھا کہ آپ حیثیت کے اس فرق کو بھی نظر انداز نہیں کریں گے۔ اور بیوی کے پیسے پر حیثیت بنانا میرے مزاج کے خلاف تھا۔

میں نے دل پر پتھر رکھ کے وشاء سے کہہ دیا کہ میں نے کبھی اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا وہ میرا خیال دل سے نکال دے۔ اس وقت وہ بہت ٹوٹ چکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا آخری سرمایہ بھی لٹا چکی ہو۔ دو ماہ تک میں اس سے نہیں ملا۔ ایک روز جب ردا نے مجھے بتایا تو میں سٹپٹا کے رہ گیا۔

"ساحل! وشاء کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے، وہ تو بالکل بدل گئی ہے۔" ردا نے مجھے بتایا۔ "کسی سے نہیں

ملتی، اپنے کمرے میں بند رہتی ہے۔ اس کے چہرے کی حساسیت آنکھوں کی معصومیت کہیں غائب ہوگئی ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، وہ کہیں خود کو کچھ کر نہ لے۔''

میں نے ردا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ردا میں اس سے ابھی ملنا نہیں چاہتا مگر تم اس کے گھر جاؤ، اسے سمجھاؤ، ماموں بھی اس ملک میں نہیں ہیں، امی جان کے ساتھ چلی جانا۔'' ردا امی کے ساتھ وشاء سے ملنے چلی گئی۔ ممانی امی اور ردا سے باتیں کرتی رہیں مگر وشاء کا برتاؤ بہت عجیب تھا وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ردا بھی وشاء کے کمرے میں چلی گئی۔ وشاء اپنے بیڈ پر لیٹی تھی۔ ردا اس کے قریب بیٹھ گئی۔ وشاء کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ ردا نے حیرت سے وشاء کی طرف دیکھا۔ ''وشاء تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، یا تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ، میں تمہارا مسئلہ حل کروں گی۔''

وشاء نے بیگانے پن سے ردا کی طرف دیکھا۔

''مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔''

ردا چلا کر بولی۔ ''کیسے ٹھیک ہوں چہرہ دیکھا ہے اپنا، تمہارا کیا حال ہوگیا ہے۔''

وشاء نے ردا کے شانوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے، میرے پورے جسم میں زہر پھیل گیا ہے مگر میں زندہ ہوں۔ کیونکہ میں نے اس سانپ کا سر کچلنا ہے۔ پھر میں آرام سے مر جاؤں گی۔''

ردا نے اپنے شانوں پر سے اس کے ہاتھوں کو ہٹایا۔ ''وشاء میری جان یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو تمہیں کسی نے تنگ کیا ہے تو مجھے بتاؤ، میں اور ساحل تمہاری مدد کریں گے۔''

وشاء نے اطمینان کے ساتھ پشت لگا لی۔ ''نہیں مجھے، تم دونوں کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود اپنے مجرم سے بدلہ لوں گی۔ اس نے میرا مان، میرا غرور تو توڑ دیا مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ نفرت کی طاقت کیا ہوتی ہے اگر لڑکی نفرت کرنے میں آئے تو بلا بن جاتی ہے۔''

وشاء کی اس طرح کی باتیں سن کر ردا رونے لگی۔ ''وشاء میرا دل گھبرا رہا ہے مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔''

وشاء نے ردا کے آنسو صاف کیے اور دھیرے سے بولی۔ ''میری پیاری سہیلی مجھے تنہا چھوڑ دو، مجھے بہت نیند آرہی ہے، مجھے سونے دو۔''

ردا اپنے آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ اس نے امی سے جانے کے لیے کہا۔ امی نے ممانی سے اجازت لی اور وہ دونوں گھر آ گئیں۔ جب مجھے ردا نے یہ سب کچھ بتایا تو میں بہت پریشان ہوگیا۔

میں وشاء سے ملنے اس کی یونیورسٹی چلا گیا۔

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی وشاء کو لینے آئی تو میں اپنی موٹر بائیک پر وشاء کے قریب آیا۔ ''آج میں تمہیں ڈراپ کردوں۔''

''Thanks میری گاڑی آ گئی ہے۔ مجھے جانا ہے۔'' وشاء نے کہا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جو کہنا ہے یہیں کہہ لو۔'' وشاء تلخ روئی سے بولی۔ میں نے اس سے التجا کی کہ وہ ایک بار میری بات سن لے۔

اس نے ڈرائیور سے رکنے کے لیے کہا اور ہم دونوں سامنے گراؤنڈ میں بیٹھ گئے۔

ردا کی بات ٹھیک تھی واقعی وہ چہرے سے بیمار لگ رہی تھی۔ میں نے اسے بہت کریدنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنے دل کی بات مجھے نہیں بتائی۔ جب میں نے اس سے اپنے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ''تمہیں اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا پورا حق ہے۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ بس تم مجھ سے دوبارہ ملنے کی کوشش مت کرنا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''

(جاری ہے)